از

فانیِ ہند حضرت حکیم آزاد انصاری

باہتمام

محمد واجد علیخاں جاوید و سیف انصاری

ملنے کا پتہ

کاشانۂ بار، بازار گھانسی
حیدرآباد دکن

مطبوعہ [illegible] اسلام پریس

قیمت مجلد [illegible]
قیمت غیر مجلد [illegible]

نذرِ عقیدت

پیتے ہی رہیں گے رند جامِ آزاد
تاحشر رہے گا بانامِ آزاد
لاتے ہی رہیں گے منکرِ شعر ایمان
اردو کا قرآن ہے کلامِ آزاد

مرتب
محمد تراب علیخاں باز حیدرآبادی

تہدیہ

میں نہایت ادب وعقیدت اور خلوص دل کے ساتھ اس اپنے
مجموعۂ کلام "معارف جمیل" کو علم وادب کے سب سے بڑے سرپرست
عالیجناب ہز اکسلنسی یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر
کے سی آئی ای جی سی آئی ای پیشکار وسابق صدر اعظم
مملکتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کے
نام نامی واسم گرامی سے معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں ؎

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

خاکسار

آزاد انصاری سہارنپوری

۱۵۔ فروری سنہ ۱۹۳۶ء

حسب ذیل ادب نواز ہستیوں کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر ضروری ہے :-

(۱) عالیجناب نواب تراب یار جنگ بہادر المتخلص بہ سعید جاگیردار حیدرآباد دکن ۔

(۲) عالیجناب نواب نثار یار جنگ بہادر المتخلص بہ مزاج تعلقدار صرفخاص مبارک ،،

(۳) جناب مولوی شوکت علیخاں صاحب فانی بدایونی بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ صدر مدرس چنچل گوڑہ ہائی اسکول حیدرآباد دکن ۔

(۴) جناب مولوی مسعود علی صاحب محوی بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ سابق سشن جج پنشنر حال رکن محکمۂ تالیف و ترجمہ حیدرآباد دکن ۔

(۵) جناب مولوی محمد عبدالسلام صاحب خفی بی۔ اے مدرس دارالشفاء ہائی اسکول حیدرآباد

(۶) ،، محمد احمد خاں صاحب برتر وکیل عدالت ہائے دیوانی و فوجداری ،،

(۷) ،، احسان علی صاحب عرشی صیغہ دار نظامت رجسٹریشن ،،

(۸) ،، فرید احمد صاحب حیران خیرآبادی صیغہ دار نظامت انجمن ہائے امداد باہمی ،،

(۹) ،، محمد تراب علیخاں صاحب باز حیدرآبادی برادر جناب محمد شاہ عالم خانصاحب رکن بلدیہ

میں ان تمام ارباب علم و ادب کا عموماً اور اپنے عزیز دوست مولوی محمد تراب علیخاں صاحب باز کا خصوصاً بہ خلوص دل شکریہ بجا لاتا ہوں کیونکہ اگر ان علم و ادب دوست ہستیوں کی اعانت و امداد میرے شامل حال نہ ہوتی تو شاید میں زندگی بھر مجموعہ ہذا کی طباعت و اشاعت میں کامیاب نہ ہو سکتا فقط

شکرگزار خاکسار آزاد انصاری

دہلی ۔ ۱۵ ۔ فروری سنہ ۱۹۳۰ء ۔

اگر آزاد سا شاعر بھی نظروں میں نہیں جچتا
تو جا - اور جا کے پہلے شعر کی پہچان پیدا کر
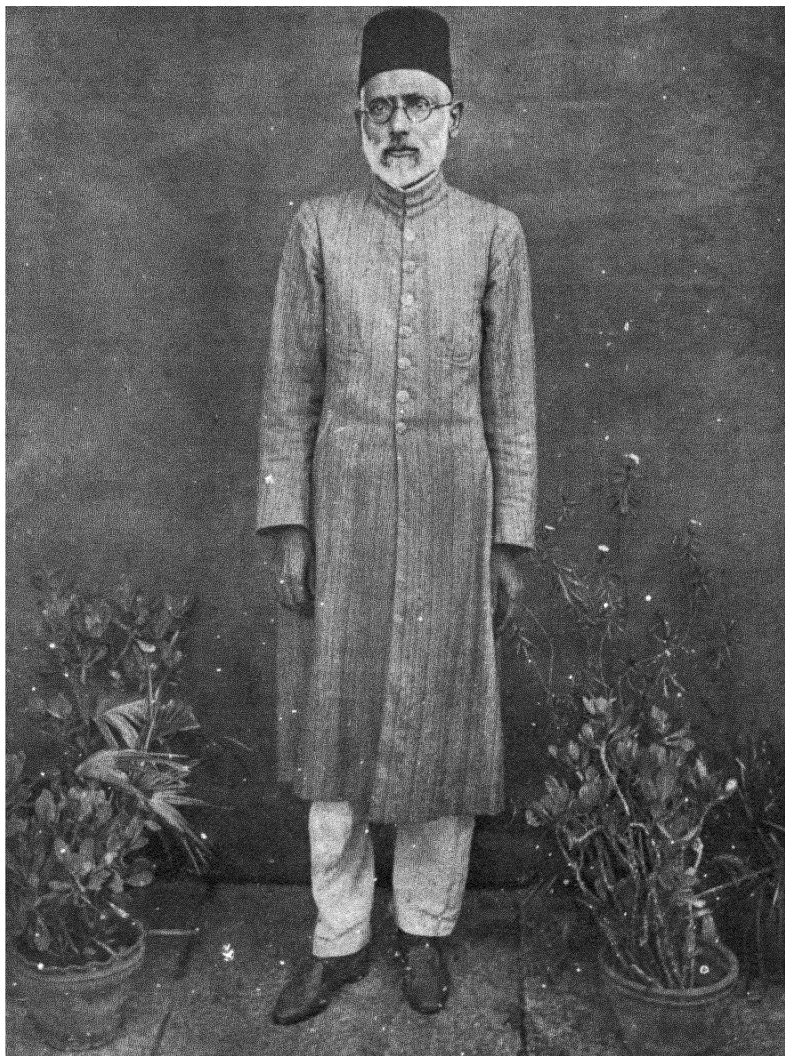
حکیم آزاد انصاری - عمر ۶۴ سال بہ حساب تقویم ہجری

افتتاحِ کلام

دیوانِ جدیدِ شاعری لایا ہوں قرآنِ مجیدِ شاعری لایا ہوں

ختم الرسلِ شعر ہوں من جانبِ حق فرقانِ حمیدِ شاعری لایا ہوں

آزاد انصاری

صحت نامہ

میں نے خود مجموعۂ ہذا کے پروفوں اور کاپیوں کی اپنی پوری کوشش سے بار بار تصیح کی ہے، مگر افسوس! کہ پھر بھی میری کچھ اس کام میں نالائقی اور نااہلی کی وجہ سے اور کچھ کاتبوں اور سنگسازوں کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مہربانی کے سبب بہت سی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں۔ امید کہ قارئین کرام ان کو مطالعہ کرنے سے پہلے مندرجۂ ذیل صحت نامے کے مطابق درست کر کے مجھ کو ممنون فرمائیں گے فقط

آزاد انصاری

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸	۸	آہ ہماری تاؤ	آہ ہماری ناؤ
۱۰	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ (۲)	دیکھو صفحہ (۳)
۱۲	۱	سہار پور	سہارنپور
۱۴	حاشیہ سطر ۳	غزیق	غزلیق
۱۸	۶	تھا جب عشرت	تھا جب سر حسرت
۲۲	۴	لے چلی	لے چلی
۲۳	۱	حضرت سیماب	حضرت سیماب
۲۵	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ (۲)	دیکھو صفحہ (۳)
۲۷	۲	کونڈہ والال	کونڈہ والان
۲۷	۵	جزو کل	جزو و کل
۲۷	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ (۲)	دیکھو صفحہ (۳)
۲۸	حاشیہ ۲	دیکھو صفحہ (۲)	دیکھو صفحہ (۳)
۳۱	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ (۲)	دیکھو صفحہ (۳)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۴	۴	کی آمد کی	کے آنے کی
۴۵	حاشیہ*	دیکھو صفحہ (۲)	دیکھو صفحہ (۳)
۴۹	حاشیہ ۱	″	″
۵۴	حاشیہ*	″	″
٦۵	۳	ضبط راز،	ضبط راز
٦٦	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ (۲)	دیکھو صفحہ (۳)
٦۸	″	″	″
٦۹	۴	دوربین	دوربین
٦۹	۱۳	لگاتار	لگاتار
۷۱	۸	پہلے وہی۔ گلزار	پہلے وہی گلزار
۷۲	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ ۲	دیکھو صفحہ ۳
۷٦	″	″	″
۷۸	″	″	″
۸۱	۲	نکانو	نکالو
۸۳	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ ۲	دیکھو صفحہ ۳
۸۴	۳	۱۳	غلط لکھا گیا ہے، نکالو
۸٦	حاشیہ ۲	دیکھو صفحہ ۷	دیکھو صفحہ (۱۷)
۹۵	۳	تتبع	تتبع
۹۵	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ (۲۰۹)	دیکھو صفحہ (۲۱)
۹۸	″	دیکھو صفحہ (۲)	دیکھو صفحہ (۳)
۱۰۱	″	″	″
۱۰٦	۷	میری جان	بالائے تقان

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰۸	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ ۱۷	دیکھو صفحہ ۹۷
۱۱۷	۹	بیمہری	بے مہری
۱۱۷	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ ۲	دیکھو صفحہ ۳
۱۲۰	۳	جو الفت مزا	جو الفت کا مزا
۱۲۱	۱۰	بہت شر اٹھانے	بہت سر اٹھانے
۱۲۹	حاشیہ ۱	گلدستہ تھ	گلدستہ تھا
//	حاشیہ ۲	دیکھو صفحہ ۳۴	دیکھو صفحہ ۱۳۴
۱۳۸	۴	آفتوں کی کی انتہا	آفتوں کی انتہا
۱۴۴	حاشیہ ۲	دیکھو صفحہ (۱) حاشیہ (۱۱۶)	دیکھو صفحہ (۱۱۶) حاشیہ ۱
۱۵۵	۴	جھجکتا	جھجکنا
۱۵۶	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ (۳۰)	دیکھو صفحہ ۳۱
۱۵۹	۱۰	ک جلوہ	اک جلوہ
۱۶۵	حاشیہ ۲ سطر ۳	انتقال ادب اردو	انتقال سے ادب اردو
۱۷۲	۸	کرم بادشاہ	کرم بادشاہ
۱۷۷	۱۱	دم باد بہاری	دم باد بہاری
۱۷۸	۱۱	۱۵ فروری ۱۹۲۹ء	۱۵ فروری ۱۹۳۰ء
//	۱۳	۱۸ فروری ۱۹۲۹ء	۱۸ فروری ۱۹۳۱ء
۱۷۹	۵	دہر سرت بپا	دہر سرتا بپا
۱۸۱	۹	مجھ سے	جھجک سے
۱۸۵	۴	رنگ پیچ	رنگ [illegible]
۱۸۶	۱۱	بہ طرز تصحیح جدید	بہ طرز تصحیح جدید
۱۹۰	حاشیہ ۱	دیکھو صفحہ ۲	دیکھو صفحہ ۳
۱۹۳	۱	سے فغاں	سے فغان

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۶	۳	غمخورانہ	غمخوارانہ
۲۰۳	۸	کیا تباؤں	کیا بتاؤں
۲۲۴	۱	دونوں نظر تے	دونوں نظر ئیے
۲۲۷	حاشیہ ۱	الف کا رہنا	الف کا دبنا

ان اغلاط کے علاوہ بعض ضروری حاشیے اور بعض اشعار درج ہونے یا لکھے جانے سے رہ گئے ہیں۔ امید کہ قارئین کرام ان کو بھی تکلیف فرما کر حسب صراحت ذیل اپنے اپنے مقام پر لکھ لیں گے۔

صفحہ ۲۳ پر حاشیہ (۱) کے بعد دوسرا حاشیہ اس طرح لکھا جائے۔

✻ دیکھو صفحہ (۲۲) حاشیہ (۱)

صفحہ ۱۱۳ پر حاشیہ (۱) کے بعد دوسرا حاشیہ اس طرح لکھا جائے۔ دیکھو ۲ صفحہ (۱۴۰) حاشیہ (۱)

صفحہ ۱۸۶ پر حاشیہ (۱) کے بعد دوسرا حاشیہ اس طرح لکھا جائے:

۲ دیکھو صفحہ (۳) حاشیہ (۱)

صفحہ (۳۲) کے آخر میں غزل کے خاتمے پر یہ مقطع اضافہ کیا جائے ؎

وہ پھر آزاد کو ہر قید سے آزادیاں ملنی | وہ پھر آزاد کے بگڑے سے مقدر کا سنور جانا

صفحہ ۶۸ پر ردیف شین کی غزل کے بعد یہ شعر اضافہ کیا جائے ؎

جان اب بھی جسم میں ہے گر شلِ خارِ جسم | سر اب بھی دوش پر ہے مگر شلِ بارِ دوش

صفحہ ۲۲۷ پر نظم "حسن دلنواز" کے انیسویں [19] بند کے بعد یہ بند اضافہ کیا جائے ؎

شکر خدا کر شکر خدا | جس نے جہاں کو حسن دیا

اور تجھے صاحب عشق کیا | چاہ، ہر اہلِ حسن کو چاہ

صحت نامہ تعارف (مقدمہ)

مقدمہ میں بھی کتابت وطباعت کی اکثر غلطیاں رہ گئی ہیں قارئین کرام ان کو بھی مندرجۂ ذیل صحت نامے کے مطابق درست کرلیں۔ آزاد انصاری

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۷	۱۸۷۱ء	۱۸۷۰ء
۶	۲	ایضاً	ایضاً
۳۲	۸	ٹھوکریں پڑیں	ٹھوکریں کھائی پڑیں
"	۵	اکتا گیا	اکتا گیا تھا
۳۳	۱	کرڈالا	کرڈالا تھا
"	۲	کہہ دی	کہہ دی تھی
"	"	کرلیا	کرلیا تھا
۳۸	۳	خدای	خدائے
۳۹	۲	اب تک	جواب تک
۴۰	سطر آخر کے بعد یہ عبارت بڑھاؤ		مگر تکمیل کو نہیں پہنچا تھا۔ اس کا تکمیل کو پہنچنا بعد کی بات ہے
۴۲	۱۴	پڑے بن میں	پڑے جن میں
۴۵	۳	لفظ "مکرر" غلط اور زائد ہے، کاٹ ڈالو۔	
۵۰	۱۱	دولت	دوست
"	۱۳	ددل	دون
۵۶	۸	ضرورت	ضرورت نہیں
"	بعد حاشیہ (۳) یہ حاشیہ بڑھاؤ۔ ؎۴ مذکور ومقدر دونوں علم نحو کی اصطلاحیں ہیں۔		
۵۷	۱	ممنوعہ شجر	ممنوعہ شجر؎۵
"	خاتمہ صفحہ پر یہ حاشیہ لکھو، ؎۵ ممنوعہ شجر سے شجر گندم مراد ہے جو اُمِ سامیہ اور ان کے صحیفوں کی مذہبی اصطلاح ہے		

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۷	۲	ردِّ عمل	ردِّ عمل ؎۱
"	حاشیہ (۱) کے بعد یہ حاشیہ لکھو۔ ؎۱ ردِّ عمل ری ایکشن (Reaction) کا ترجمہ ہے جو علم سائنس کی اصطلاح ہے		
"	۴	تصور کے حقیقی معروض	تصور کے حقیقی معروض ؎۲
"	حاشیہ (۲) کے بعد یہ حاشیہ بڑھاؤ ..... ؎۲ معروض تصور یا معروضات تصور یونان کے مشہور و مایہ ناز فلسفی افلاطون کی فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں جن کو وہ انسانی تصور میں آنیوالی شکلوں کے معنی میں استعمال کرتا ہے اور ان کو قدیم سمجھتا ہے		
"	۴	عرض ہے اور جوہر	عرض ؎۴ ہے اور جوہر ؎۴
"	حاشیہ (۳) کے بعد یہ حاشیہ بڑھاؤ ..... ؎۴ عرض اور جوہر منطق و فلسفہ کی مشہور اصطلاحیں ہیں۔		
"	۵	مرکز ہر مدار	مرکز ؎۵ ہر مدار ؎۵
"	حاشیہ (۴) کے بعد یہ حاشیہ لکھو ..... ؎۵ مرکز اور مدار آفلیدس اور علم ہیئت کی اصطلاحیں ہیں		
"	۱۰	اُس مصرعے میں "کے بعد" صحیح لفظ "بسجہ" ہے	
"	۱۳	(۲) "میں" ضمیر متکلم	ہم نے "میں" ضمیر متکلم
۶۱	۲	ہے پیچ وتاب دل کو تو دل پیچ وتاب میں	اللہ پھنس گیا ہوں یہ کس پیچ وتاب میں
"	۴	اللہ پھنس گیا ہوں یہ کس پیچ وتاب میں	ہے پیچ وتاب دل کو تو دل پیچ وتاب میں
۶۲	۷	نہ رہا	نہ ہوا
۶۲	۹	نہ رہا	نہ ہوا
۶۷	۵ سطر حاشیہ	یہ شعر نظم جنگ بلقان	؎۱ یہ شعر نظم جنگ بلقان
۶۸	حاشیہ سطر ۸	بہادر قوم	بہادر قوم ہے
۸۱	۷	کہ استعمال	کے استعمال
۸۲	۵	بہ عطف	بہ عطف و
۶۱	حاشیہ سطر ۴	تین شعر	چار شعر
۳۸	۴	اعتراف	اعتراف
۲۹	۳	زیادہ مبارکباد دوں	اور ڈیڑھ سو سے زیادہ مبارکباد دوں
"	حاشیہ سطر ۵	کلام کا حکم	کلام میں عنقا کا حکم

تعارف

اپنی اور اپنی شاعری کی سرگذشت اپنے قلم سے

نام و نسب ۔ ولدیت ۔ سکونت ۔

الطاف احمد مشہور نام نظیر حسین تاریخی نام ابوالاحسان کنیت ۔ آزاد تخلص ۔ والد کا اسم گرامی محمد حسن خلف میر احمد ۔ سکونت سہارنپور خاص محلہ شاہ ولایت ۔ نسلاً شیخ انصاری جس کا سلسلہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے ۔

سال ولادت ۔ مقام ولادت مع دیگر خاندانی حالات

سال ولادت ۲۷ رجب ۱۲۸۸ھ م سنہ ۱۸۷۱ء مقام ولادت ناگپور خاص دارالحکومت ممالک متوسط جہاں ہمارے والد مرحوم بعہدۂ اورسیری ملازم تھے ۔

یہ تو ہمیں یاد نہیں ہے کہ ہمارے جدِ امجد عرب سے کب اور کہاں کہاں

ہوتے ہوئے ہندوستان آئے۔ اور اُن کا کیا نام تھا اِس لئے کہ خاندانی شجرہ اِس وقت ہمارے پیش نظر نہیں۔ البتہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ ہمارے اجداد میں اک مشہور و معروف بزرگ شمس الدین انصاری گذرے ہیں جن کو شاہجہاں صاحبقرانِ ثانی نے خدمات ملکی کے صلے میں از روئے فرمان جو اب تک ہمارے خاندان میں محفوظ ہے ۱۰۰ اگاؤں معافی الدوام عطا فرمائے تھے۔ جن کا بڑا حصہ اضلاعِ سہارنپور و مظفر نگر و کرنال وغیرہ میں تھا۔ بعدازاں اِن میں (۴۰) دیہات کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ (۴۰) دیہات زرخرید تھے یہ (۱۴۰) دیہات ہمارے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ ہمارے پردادا مرحوم تک جن کا نام نامی شیخ محمد بخش انصاری تھا منتقل ہوتے ہوئے پہنچے مگر شاید ۱۸۱۵ء میں سرکار انگریزی نے یہ تمام دیہات ہمارے پردادا کی عین حیات ہی ضبط کر لئے۔ یہ ضبطی کسی بغاوت وغیرہ کی پاداش میں عمل میں نہیں آئی تھی۔ بلکہ ۱۸۱۰ء یا قریباً ۱۸۱۵ء میں (سنہ ٹھیک یاد نہیں) جب اضلاع مظفر نگر و سہارنپور وغیرہ پر سرکار انگریزی کا عمل دخل ہوا ہے تو اِن اطراف میں سکھ گردی کی بدولت سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کی جائداد پر قابض تھا اور کوئی کسی کی۔ لہذا سرکار انگریزی نے اِن اطراف کی

تمام جائدادیں ضبط کر کے یہ اعلان میعادی ایک سال شایع کر دیا تھا کہ "جو لوگ اپنی اپنی دستاویزیں اور سندیں پیش کریں گے اُن کی جائدادیں بعد ثبوت اُن کو واپس کر دی جائیں گی"۔ چنانچہ جن لوگون نے اپنے اپنے ثبوت اور اپنی اپنی دستاویزیں پیش کیں اُن کو اُن کی جائدادیں واپس مل گیئں۔ مگر ہمارے پردادا مرحوم ضرورت سے زیادہ غیور اور خود دار یا متعصب و ناعاقبت اندیش (جو سمجھو) واقع ہوئے تھے۔ اُنھوں نے دستاویزیں پیش کرنے سے یہ کہکر انکار کر دیا کہ "مَیں اک کافر انگریز کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر بھوکا مرجانے کو ترجیح دیتا ہوں" نتیجہ یہ ہوا کہ بعد انقضائے میعاد وہ تمام دیہات نیلام کر دئے گئے۔ اور ہمارا خاندان ہمیشہ کے لئے اُن سے محروم ہو گیا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ سرکار انگریزی کی طرف سے ہمارے پردادا مرحوم کا ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ تاحین حیات مقرر کر دیا گیا۔ اُن (۱۴۸۰) دیہات کے علاوہ اور بھی بہت سے کھیت اور در جنوں مکانات اور دوکانیں وغیرہ تھیں۔ جن کا کچھ حصہ سہارنپور میں اور کچھ حصہ اردو بازار اور کاغذی بازار دہلی میں واقع تھا۔ ظاہر ہے کہ اک بَنَفسِ نفیس رئیس کا جس کی آمدنی و خرچ قریباً دو ڈہائی لاکھ ماہوار ہو وہ ایک ہزار روپیہ ماہوار میں کیونکر اپنی بسر اوقات کر سکتا تھا۔ آمدنی بہت کم خرچ بہت زیادہ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باقی

جائداد۔ دکانیں اور مکانات رہن و بیع ہونے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے پردادا کی وفات کے وقت جو ہمارے دادا امیر احمد مرحوم کے دو سال بعد عمل میں آئی۔ ہماری باقی ماندہ کل جائداد فروخت اور رہن و بیع ہو چکی تھی ان مکانات اور دکانات کے علاوہ اِک گاؤں بھی ضبطی سے بچ گیا تھا۔ مگر اس گاؤں کی اُس زمانے میں یہ حالت تھی کہ اُس کی آمدنی تھی تین سو روپیہ سالانہ اور اُس کا لگان سرکاری ادا کرنا پڑتا تھا پانسو روپیہ سالانہ۔ پردادا مرحوم کے انتقال کے بعد والد مرحوم نے اُس گاؤں کو فروخت کر دیا اور بعد ادائے قرض اُس کے بچے کھچے روپیہ سے اپنے دونوں مکانات مسکونہ واقع سہارنپور واگذاشت کرائے۔ یہ فروخت کردہ گاؤں ضلع سہارنپور تحصیل رُڑکی میں واقع تھا اور سنا گیا ہے اب اُس کی آمدنی ساٹھ ہزار روپیہ سالانہ ہے۔

ہمارے والد دو بھائی تھے۔ شیخ محمد حسین انصاری۔ شیخ علی احمد انصاری۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت ہمارے عم مکرم شیخ علی احمد انصاری اپنے مکان مسکونہ سہارنپور میں اور ہمارے والد ماجد شیخ محمد حسین انصاری ہماری والدہ مرحومہ کے تایازاد بھائی قبلہ مولوی عبد اللہ ناظر امور مذہبی علی گڈھ کالج کے ہمراہ دہلی میں تعلیم پا رہے تھے۔ جب انگریزوں نے دہلی فتح کر لی تو ہزاروں لاکھوں

اشخاص کی طرح ہمارے والدِ ماجد اور مولانا عبداللہ انصاری بھی دہلی چھوڑ کر بھاگ گئے
اور بہزار دقّت وخرابی چھپتے چھپاتے۔ فاقے کرتے اور مصیبتیں بھرتے چھ سات
مہینے بعد سہارنپور پہنچے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء تک ہمارے دو چار مکان دہلی میں باقی
تھے۔ مگر فتحِ دہلی کے بعد وہ تمام کے تمام دونوں محلّے (اردو بازار اور کاغذی بازار)
جن میں یہ مکانات واقع تھے کھدوا کر زمین برابر کر دیئے گئے جس سے دہلی کے مکانات کا بھی قصہ پاک ہو گیا
ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے ایک سال بعد ہمارے دادا شیخ امیر احمد انصاری انتقال
فرما گئے اور دو سال بعد ہمارے پردادا شیخ محمد بخش انصاری ایسی حالت میں
کہ جب کوئی آمدنی باقی نہ رہی تو ہمارے والد ماجد اور عمِ مکرم کچھ تھوڑی بہت
انگریزی اور ریاضی وغیرہ سیکھ کر انجینیری کالج رُڑکی میں داخل ہو گئے اور اورسیری
کی سندیں حاصل کر کے سرکاری ملازمتیں اختیار کر لیں۔ والدِ ماجد کا تقرر ناگپور
میں عمل میں آیا اور عم مکرم کا میرٹھ میں۔ عم مکرم کی تحویل میں کچھ سرکاری روپیہ بھی
رہتا تھا۔ اُن کے ایک دوست جو ہمیشہ سفر وحضر میں اُن کے ساتھ رہتے تھے
اور جن پر اُن کو کامل اعتماد تھا قریباً (۵۰۰) روپیہ لیکر فرار ہو گئے اور جب عم مکرم
کو یہ حال معلوم ہوا تو بخوفِ گرفتاری وہ بھی روپوش ہو گئے اور پھر باوجود کوشش
و تلاش اُن کا کہیں پتا نہ چلا۔

تعلیم و تربیت — یہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ ہماری ولادت ۲۷ رجب سنہ ۱۲۸۸ھ مطابق سنہ ۱۸۷۱ء کو ناگپور میں جہاں ہمارے والد ماجد بہ عہدہ اورسیری فائز تھے عمل میں آئی تھی۔ ہماری پیدائش سے ایک سال بعد ہمارے والد کا تبادلہ سیونی کا ہو گیا۔ جہاں فریدہ تین سال بعد ہمارے چھوٹے بھائی اشفاق احمد انصاری پیدا ہوئے جو بفضلہٖ اب تک بقید حیات ہیں۔ اس کے بعد والد ماجد کا مٹی تبدیل ہو کر آ گئے اور شہر کے باہر مغربی سمت منشی نعیم الدین صاحب ساکن گلاوٹھی (جو وہاں عرصہ سے ٹھیکہ داری کر رہے تھے) کے مکانوں میں سے ایک مکان بود و باش کے لئے کرایہ پر لیا۔ وہیں ہم ساڑھے پانچ سال کی عمر میں منشی نعیم الدین صاحب کے صاحبزادوں میاں علیم الدین اور میاں اعز الدین کے ہمراہ پڑھنے بٹھائے گئے۔ حسب رواج قدیم قاعدہ بغدادی سے ہماری تعلیم شروع ہوئی۔ ابھی ہم پارۂ عم ختم کرنے نہ پائے تھے کہ والد ماجد کا تبادلہ ساگر کا ہو گیا۔ ساگر میں ہم کو ایک حافظ صاحب کے سپرد کر دیا گیا جو ہم کو دونوں وقت مکان ہی پر پڑھانے آتے تھے۔ ابھی ہماری عمر پورے سات برس کی بھی نہ ہوئی تھی اور پارہ تلک الرسل تمام کرنے نہ پائے تھے کہ اچانک والد ماجد ہیضہ میں مبتلا ہو کر انتقال فرما گئے۔ اور ہم دونوں بھائی مع اپنی والدہ ماجدہ کے

پردیس میں بے والی و وارث رہ گئے۔

بدقسمتی سے ددہال میں ہمارا سرپرست کوئی نہ تھا۔ دادا اور پردادا کا انتقال ہوچکا تھا۔ عمِ مکرم مفقود الخبر ہوچکے تھے۔ مگر ننہال میں ہمارے تین حقیقی ماموں صاحبان مولوی خلیل احمد صاحب محدّث۔ مولوی نذیر احمد صاحب مولوی رشید احمد صاحب پروفیسر فارسی علی گڈھ کالج اور نانا صاحب شاہ مجید علی اُس وقت تک بقیدِ حیات تھے۔ اِن کے علاوہ اور بھی ننہال میں ہمارے بہت سے رشتہ دار تھے۔ جن میں سے شاہ حبیب علی صاحب اور شاہ احمد حسن صاحب ہماری والدہ ماجدہ کے چچا اور مولوی عبد اللہ صاحب انصاری ناظم امور دینیات علی گڈھ کالج۔ مولوی صدیق احمد صاحب اور مولوی انوار احمد صاحب جو ہماری والدہ ماجدہ کے تایا اور چچا زاد بھائی تھے۔ قابلِ ذکر بزرگ ہیں۔ اب یہ سب بزرگ انتقال فرما چکے ہیں۔ صرف قبلہ مولوی انوار احمد صاحب مدظلہ بقیدِ حیات ہیں۔ خداوندِ عالم اُن کو تادیر ہمارے سر پر قایم رکھے۔ مختصر یہ کہ ننہال میں والد ماجد مرحوم کے انتقال کی خبر بھیجی گئی۔ اور ہمارے نانا شاہ مجید علی مرحوم ہم کو اپنے وطنِ مالوف قصبہ انبہٹہ (ضلع سہارنپور) میں لے آئے اور یہیں ہم نے ڈیڑھ دو سال بعد کلام مجید ختم کیا۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں یوپی - کامٹی اور ساگر وغیرہ میں ریلیں نہ تھیں - اور ہمارے تمام سفر بیل گاڑیوں پر طے ہوتے تھے - ہمیں ابھی تک یاد ہے کہ جب بعد انتقال والد ماجد ہم عازم وطن ہوئے ہیں تو ہم نے ساگر سے اِٹارسی یا کریلی (ٹھیک یاد نہیں) تک کا فاصلہ آٹھ یا نو دن میں بیل گاڑی پر طے کیا تھا - اور وہاں سے ریل پر سوار ہو کر آلہ آباد ہوتے سہارن پور پہنچے تھے - کیونکہ اُس وقت تک ریل براہ راست دہلی ہوتی ہوئی جاری نہیں ہوئی تھی -

بعد ختم کلام مجید ہماری والدہ ماجدہ اور نانا مرحوم نے ہم کو قبلہ مولوی عبداللہ صاحب انصاری (جو اُس وقت مدرسہ عربی[1] گلاؤٹھی کے اوّل مدرس تھے - اور بعد میں ناظم امور دینیات علی گڈھ کالج ہوئے) اُن کے بغرض حصول تعلیم سپرد کر دیا - جو ہم کو لیکر گلاؤٹھی چلے گئے - ہم گلاؤٹھی میں ایک سال تک فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے - اس کے بعد وہ مدرسہ بعض مفسدوں

---

[1] یہ مدرسہ منشی مہربان علی صاحب مرحوم رئیس گلاؤٹھی کے شوق علم دوستی کی بدولت جاری تھا اور وہی تن تنہا مدرسہ کے تمام اخراجات کے کفیل تھے یہ مدرسہ کافی عرصہ تک خدمت علم و مذہب کرتا رہا - مگر بعض مفسدہ پردازوں نے حکام کی خدمت میں متواتر یہ درخواستیں بھیجیں کہ یہ مدرسہ حکام کے خلاف اک جماعت تیار کر رہا ہے جو یقیناً کچھ دنوں بعد حکومت کا تختہ اُلٹ دیگی - چنانچہ حکام نے اس کی باضابطہ تحقیقات کی اگرچہ وہ شکایتیں غلط ثابت ہوئیں مگر منشی مہربان علی مرحوم نے بخیال خوف فساد اِس مدرسہ کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا - (آزاد انصاری)

کی فتنہ پردازی سے ٹوٹ گیا۔ اور ہم قصبۂ انبہٹہ واپس چلے آئے پھر کچھ
دنوں بعد ہم کو ریاست مالیر کوٹلہ (پنجاب) بھیجدیا گیا جہاں ہماری والدہ
کے چچازاد بھائی مولوی صدیق احمد مدرسہ عربیہ کے مدرس اعلیٰ تھے مالیر کوٹلہ
میں ہم دو سال تک تعلیم پاتے رہے۔ وہیں جب ہم فارسی میں گلستان تک
پہنچ گئے ہم کو عربی شروع کرائی گئی۔ مدرسہ عربیہ مالیر کوٹلہ میں دو سال
تعلیم پانے کے بعد جب ہم وطن واپس آئے تو کچھ روز بعد ہم کو قبلہ مولوی
انوار احمد صاحب مدظلہ مدرس اول مدرسہ عربیہ تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) کی خدمت میں
بھیجدیا گیا۔ وہاں ہم دو برس تک فارسی منشی واجد علی مرحوم سے اور عربی
مولوی انوار احمد صاحب مدظلہ سے حاصل کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ہمارے نانا
شاہ مجید علی انتقال فرما گئے اور ہم کو مجبوراً سہارنپور آجانا پڑا۔ سہارن پور
آکر ہم مدرسہ عربی فیضِ عام سہارنپور میں داخل ہو گئے یہاں فارسی حافظ نیاز احمد صاحب
بریلوی اور عربی مولانا بشیر احمد صاحب علی گڈھی سے حاصل کرتے رہے۔
یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم جدید تعلیم سے اس لئے
محروم رہے کہ لڑکپن ہی میں ہمارے والد ماجد (جو جدید تعلیم کے حامی تھے)
کا سایہ ہمارے سر سے اُٹھ گیا۔ اور ہم اپنے نانا اور ماموؤں کی زیرِ نگرانی ایسے

ماحول میں تعلیم و تربیت پانے پر مجبور ہوئے۔ جہاں انگریزی تعلیم کفر میں داخل سمجھی جاتی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اُس نفرت و حقارت پر جو ہمارے سرپرستوں کو انگریزی تعلیم اور انگریزی اشیا سے تھی روشنی ڈالنے کے لئے واقعہ ذیل کا اندراج کافی ہوگا۔

لڑکپن میں ہم کو انگریزی جوتا (بوٹ اور گرگابی وغیرہ) بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اور جب کسی کو بوٹ وغیرہ پہنے دیکھ لیتے تھے تو بے اختیار جی چاہتا تھا کہ کاش ہمارے پاؤں میں بھی ایسا جوتا ہوتا۔ ہماری شامت جو آئی تو ایک مرتبہ کچھ دام جمع کرکے ہم نے ایک انگریزی جوتا خرید لیا۔ مگر بخوف سزا اُس کو پہن نہ سکتے تھے۔ چھپا چھپا کر رکھتے تھے۔ آخر اک روز یہ بھید کھل گیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو سخت سزا دیگئی جوتا چھین لیا گیا۔ اور گھر سے نکال دئے گئے اور جب تک ہم نے اِس فعل بد سے بار بار عاجزانہ توبہ نہ کی ہم کو معافی نہ دی گئی

اِس موقع پر ہم کو اپنی زندگی کا اک دوسرا عجیب و غریب واقعہ یاد آگیا۔ جس کا درج کرنا اِس لئے ضروری ہے کہ وہ علاوہ اِک واقعہ عجیب ہونے کے نہایت سبق آموز اور عبرت خیز بھی ہے۔

ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ زمانۂ قیامِ کاملی میں جب ہماری عمر قریباً چھ برس

کی تھی اور ہمارے والدِ ماجد زندہ تھے ایک روز ہمارے والدِ مرحوم اور منشی نعیم الدین صاحب ٹھیکہ دار اپنے مکان کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہماری اور ہمارے ہم سبق میاں علیم الدین صاحب و میاں اعزالدین صاحب کی آیندہ تعلیم کے متعلق کچھ اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ سلسلۂ گفتگو میں منشی نعیم الدین مرحوم نے فرمایا کہ "میری تمنا ہے کہ میں علیم الدین اور اعزالدین اپنے دونوں بیٹوں کو عربی کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلاؤں۔ اور اُن کو اِک عالم باعمل اور فاضل بے بدل کے مرتبہ پر فائز دیکھوں"۔ والدِ مرحوم نے جواباً فرمایا کہ "میں چاہتا ہوں کہ اپنے لڑکے کو بہترین انگریزی تعلیم دلاؤں۔ ولایت بھیجوں تاکہ وہ وہاں سے اعلیٰ تعلیم پاکر واپس آئے اور کسی بڑے معزز عہدے پر فائز ہو سکے۔ مگر خدا کی قدرت دیکھیے کہ ہم سات برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اور ہم اپنی ننہیال میں ایسے ماحول میں پرورش اور تعلیم و تربیت پانے پر مجبور ہوئے کہ جہاں جدید تعلیم اُس زمانے میں کفر سمجھی جاتی تھی۔ برخلاف اس کے جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکا ہے ہمارے ہم سبق میاں علیم الدین یا اُن کے چھوٹے بھائی اعزالدین نے انگریزی تعلیم پائی۔ انگلستان گئے۔ سول سروس کی ڈگریاں لیکر واپس ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹر یا ڈپٹی کمشنری کے مرتبہ تک

فائز ہوکر پنشن پائی۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْاَبْصَارِ۔

مختصر یہ کہ ہم ۱۸-۱۹ برس کی عمر تک فارسی و عربی کی تعلیم پاتے رہے اس کے بعد شادی ہوگئی۔ اور چونکہ ہم بدقسمتی سے تعلیم کے بارے میں بہت بدشوق واقع ہوئے تھے۔ اس لئے تعلیم چھوٹ گئی۔ لیکن جب ضروریات زندگی نے مجبور کیا تو کچھ عرصے کے بعد مولانا حکیم نور احمد صاحب سہارنپوری اور ڈاکٹر احمد خان صاحب لکھنوی اور ان کے علاوہ دیگر اساتذۂ فن سے طبی و ڈاکٹری تعلیم پائی اور مولوی حکیم معین الدین صاحب نانوتوی سے جو ہمارے ماموں بھی ہوتے تھے۔ سندِ طبی حاصل کرنے کے بعد کاروبارِ مطب جاری کرکے گذر اوقات کا ذریعہ بہم پہنچایا۔

۱۹۰۷ء میں دہرہ دون میں جاکر مطب کھولا اور دو سال تک وہاں کام کرتے رہے۔ بعدازاں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۰ء تک کانپور میں یہی شغلہ جاری رکھا۔ وہیں ہماری اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ اور ہم انتہائے رنج و ملال کے عالم میں سہارنپور چلے آئے۔ ایک سال بعد جب یہ صدمہ کم ہوا اور بیکاری و عسرت نے ستایا تو ہم نے انبالہ (پنجاب) میں جاکر کاروبارِ مطب جاری کیا اور قریباً آٹھ سال تک وہاں علاج و معالجہ کا کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۹ء

میں ہم علی گڈھ آ گئے۔ علی گڈھ میں ڈیڑھ سال تک ہمارا قیام رہا۔ مگر جب وہاں ہم نے اپنا کاروبار مطب چلتے نہ دیکھا تو ہم دہلی چلے آئے۔ اور ۱۹۲۳ء تک دہلی میں رہکر بسر اوقات کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو حیدر آباد دکن پہنچ گئے اور کاروبار مطب چھوڑکر عینک فروشی اختیار کرلی جس پر آج تک گذر اوقات ہے۔

شاعری کی ابتداء اور اسکی عہد بہ عہد ترقیات

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ہم تھانہ بھون ضلع مظفر نگر قبلہ مولانا انوار احمد صاحب کی خدمت میں بغرض حصول تعلیم بھیجدئے گئے تھے۔ اس وقت ہماری عمر ۱۲ یا ۱۴ سال کی تھی۔ وہاں منشی واجد علی مرحوم واجدؔ جو ہمارے فارسی کے اُستاد تھے اور اُن کے چھوٹے بھائی منشی شوکت علی مرحوم شوکتؔ اُس زمانے کے مشہور شعراء میں سے تھے ان بزرگوں نے ایک ماہانہ مشاعرہ کی بنا ڈالی۔ سب سے پہلا مصرع طرح تھا "یہ جوشِ جنون رنگ لائے کو ہے"۔ جب اِس مشاعرے کا چرچا ہوا اور اکثر لوگوں اور خصوصاً اپنے ہم جماعت لڑکوں[1] کو جو ہم سے بڑے تھے فکر کرتے اور غزلیں کہتے دیکھا تو ہمیں بھی شعر کہنے کا شوق چرایا اور کوشش کرکے اِس طرح

---

[1] ان ہم جماعت لڑکوں میں سے آگے چلکر بعض اچھا کہنے والے نکلے جن کے اسم گرامی یہ ہیں دلیپ سنگھ صاحب ہوشؔ۔ امیر احمد صاحب امیرؔ اور رشید احمد صاحب رشیدؔ۔ آزاد انصاری

میں چھ یا سات شعر بک ڈالے۔ جن میں سے صرف ایک مطلع یاد رہ گیا ہے

بہارِ[1] چمن گُل کھلانے کو ہے   یہ جوشِ جنون رنگ لانے کو ہے

یہ ہماری باضابطہ پہلی غزل تھی مگر پہلی فکر نہ تھی کیونکہ ہم اس سے دو تین سال پہلے بھی کچھ شعر اناپ شناپ بک چکے تھے۔ جس کا مفصل ذکر آپ آگے چند سطور کے بعد ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہاں تو یہ چھ سات شعر کی غزل ہم نے بکنے کو بک ڈالی۔ مگر چونکہ کم سنی تھی۔ غزل گوئی کا پہلا موقع تھا۔ شرم دامنگیر تھی اس لئے ہمیں اس اپنی بکی ہوئی غزل کو اپنے خاص ہم عمر و ہم تعلیم لڑکوں کے سوا نہ کسی کو سنانے کی ہمت ہوئی اور نہ مشاعرے میں پڑھنے کی۔ اسی طرح اور پانچ سات مشاعرے ہوئے اور ہم نے اُن کی بعض طرحوں پر بُری بھلی غزلیں کہیں۔ مگر ہم کو نہ اب وہ طرحیں یاد ہیں اور نہ اُن پر کہا ہوا کوئی شعر۔ اس کے بعد ہم سہارنپور چلے آئے۔ یہاں ہمارا تعلیمی مشغلہ بھی جاری رہا اور کبھی کبھی شوقِ شعر گوئی بھی[2]۔

چند سطور پہلے ہم عرض کر آئے ہیں کہ ہم نے اس باضابطہ غزل گوئی سے پہلے بھی دو تین اتفاقاً کچھ شعر اناپ شناپ بکے تھے۔ اب اُن کا قصہ سُنئے ہماری دس یا گیارہ سال کی عمر ہو گی اور ہم دستور الصبیان اور پندنامہ سعدی

---

[1] یہی مطلع تھی اور یہی گرہ بھی۔ آزاد انصاری۔

المشہور" بہ کر بکا" پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے بحر متقارب "فعولن فعولن فعولن فعل یا فعول" طبیعت پر چھائی ہوئی تھی۔ بدیں وجہ جتنے شعر بھی اُس زمانے میں کہے گئے وہ سب اِسی بحر میں تھے اور ہونے بھی چاہئیں تھے اسی بحر میں کیونکہ ہم کو اُس وقت تک کسی دوسری بحر سے سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔ یہ اشعار غزل کے اشعار نہ تھے بلکہ کبھی کبھی کسی نہ کسی واقعہ کے متعلق موزوں ہوجایا کرتے تھے۔ اس لئے کہ اُس زمانے میں ہم تغزّل سے نا آشنائے محض تھے ہمارا خیال ہے کہ اِس قسم کے تمام شعر جنھیں شعر کہنا شعر کی توہین کے مرادف ہے تعداد میں دس بارہ سے زیادہ نہ ہوں گے افسوس ہے کہ وہ سب شعر ہمارے حافظے سے محو ہو گئے اُن میں سے صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے جو بالیقین ہمارا سب سے پہلا شعر ہے جس کو مع شانِ نزول نذرِ ناظرین کرنے کی عزّت حاصل کی جاتی ہے۔

ایک سال کا ذکر ہے کہ ہم شدید موسم گرما کے زمانے میں سخت قسم کے آشوبِ چشم میں مبتلا ہو گئے۔ نہایت تکلیف۔ درد اور سوزشِ چشم کا عذاب ہم پر مسلّط تھا۔ اور ہم ہائے ہائے کے ساتھ بے اختیار ہو ہو کر بار بار خدا کے حضور میں حصولِ صحت و سکون کی دعا کر رہے تھے کہ بے ساختہ یہ شعر بطورِ دعا

موزوں ہو کر ہماری زبان سے نکلا۔

الٰہی مری آنکھ پر رحم کر — کہ میں ہوں گنہگار بندہ بشر

اِس شعر کا موزوں ہو کر ہماری زبان سے نکلنا تھا کہ ہم درد۔ تکلیف اور آہ و بکا سب بھول بھلا کر فرط مسرت سے اُچھل پڑے بے اختیار اُچھلے کودے دیوانہ وار گائے ناچے۔ ہم عالم خوشی میں دیوانہ وار اُچھل کود ہی رہے تھے کہ ہماری والدہ ماجدہ جو اُس وقت بقید حیات تھیں ہماری اُچھل کود کا شور سنکر تشریف لے آئیں اور فرمانے لگیں کہ "ارے تو ابھی تو ہائے ہائے کر رہا تھا۔ کیا دفعتاً کوئی خزانہ ہاتھ آگیا ہے۔ جو یوں مجنونانہ خوشی سے اُچھل کود رہا ہے" ہم نے باادب عرض کیا کہ نہیں۔ بلکہ ہم نے ایک شعر کہا ہے اور وہ شعر یہ ہے۔ سنکر ہنسیں اور بہت ہنسیں۔ دعا دی اور مسکراتی ہوئی واپس تشریف لے گئیں۔

شاید ہمارا یہ شعر بارگاہ خداوندی میں قبول کر لیا گیا تھا۔ کیونکہ ہم کو اُسی وقت سے اپنی آنکھ کے درد اور تکلیف میں کافی کمی محسوس ہونے لگی اور اِس کے بعد ہم بفضلہ جلد صحت یاب بھی ہو گئے۔

ہم جانتے ہیں کہ قارئین کرام ہمارے اِس شعر کو پڑھ کر ہماری اِس لغوگوئی

پر ہنسیں گے اور جی کھول کر ہنسیں گے۔ اور شاید بعض بدباطن اشخاص اس کو
ہماری تضحیک و رسوائی کا آلۂ کار بنا لینے سے بھی دریغ نہ کریں گے
لیکن اگر قصور معاف کیا جا سکتا ہو تو ہم عرض کریں کہ ہمارے اس اولین شعر
کو اس لحاظ سے نہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ شعر درحقیقت کوئی شعر ہے۔ بلکہ اس
شعر پر اس لحاظ سے نظر ڈالنی چاہیئے کہ یہ ہماری اوّلین موزون فکر ہے
اس شعر میں کوئی شعری خوبی نہیں ہے تو نہ ہو۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ ناموزوں
نہیں۔ غرض اس واقعہ کے مفصل اظہار سے یہ ہے کہ تمام ارباب نظر واقف ہو جائیں
کہ ہماری شاعری کی ابتداء اس قدر پست اور حقیر تھی۔

۱۸۸۰ء میں جب ہماری عمر قریباً (۱۸) سال کی تھی سہارن پور میں
منشی غلام رسول فکر مرحوم نے ایک ماہانہ مشاعرے کی بنا ڈالی جس کا پہلا
مصرعہ طرح تھا "قیامت میں ہمارا ہاتھ ہو تیرا گریباں ہو"۔ چونکہ تھوڑا بہت
خبط شعر گوئی چلا جا رہا تھا۔ ہم نے بھی اس طرح پر ایک ۱۴۔۱۵ شعر کی غزل لکھ ڈالی
جس میں سے اب صرف ایک مطلع اور ایک شعر یاد رہ گیا ہے جو درج ذیل ہے

خدا وہ دن دکھائے عیش و عشرت کا ساماں ہو ۔۔۔ ادھر گردش میں ساغر ہو ادھر پہلو میں جاناں ہو
یہ کیا انصاف ہی ظالم کہ کہتا ہے کہ آ اک تو ۔۔۔ جو ہم مانگیں تو صاف انکار اور غیروں سے ہاں ہاں ہو

یہ غزل ہم نے لکھ تو لی۔ مگر مشاعرے میں پڑھنے کی ہمت نہ پڑی۔ بات یہ تھی کہ ہم اُس وقت یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط اسی لئے کسی کو سناتے یا کہیں مشاعرے وغیرہ میں پڑھتے ہچکچاتے تھے مگر جب مشاعرہ ہو چکا اور اُس مشاعرے کا گلدستہ بنام گلدستہ فغانِ عشاق" شایع ہوا تو ہم بہت سوچ بچار کے بعد یہ گلدستہ اور غزل لیکر منشی حبیب الدین سوزاں مرحوم (جو ہمارے شہر کے اک مشہور شاعر اور غالب مرحوم کے تلامذہ میں تھے) کی خدمت میں پہنچے اور ماموں سعید احمد مرحوم (جو ہمارے ہم سن اور منشی سوزاں مرحوم کے حقیقی بھانجے تھے) کی معرفت ان کی خدمت میں ڈرتے ڈرتے بغرض اصلاح پیش کی۔ منشی حبیب الدین سوزاں مرحوم نے ہماری غزل ملاحظہ فرماکر جو جواب دیا۔ اس کی تلخی ہم کو آج تک نہیں بھولی۔ فرمایا کہ "یہ غزل سرتاپا لغو اور مہمل ہے۔ اس میں ایک شعر بھی کام کا نہیں"۔ ہم نے عرض کی کہ جناب ہم کو غزل بھر میں سے صرف ایک شعر درست کرکے دکھا دیجئے" تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ اک غلط شعر ا[illegible] طرح صحیح کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ "غزل بھر میں ایک شعر بھی درست ہونے کے قابل نہیں"۔ اس کے بعد گلدستہ فغانِ عشاق ہمارے ہاتھ سے چھین لیا اور فرمایا کہ بیٹا! ابھی تمہاری عمر گلدستہ فغانِ عشاق

کیطرف ملتفت ہونے کی نہیں ہے بلکہ گلدستۂ اسباق کی طرف متوجہ ہونے کی ہے ۔ جاؤ شعر و شاعری کا خبط دل سے نکال دو اور ہمہ تن حصولِ تعلیم کی طرف متوجہ ہو جاؤ ممکن ہے انھون نے ہم کو یہ مشورہ ازراہ خیر خواہی اس لئے دیا ہو کہ ہم شعر و شاعری کے خبط میں پڑ کر حصولِ تعلیم سے غافل نہ ہو جائیں ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اُن کے اس جواب سے ہمارے شوق شعر کی کمر ہمت ٹوٹ گئی ۔ اور ہم نے سمجھ لیا کہ ہم ہرگز اس قابل نہیں کہ ہماری کوشش اس فن کے حصول میں سر سبز ہو سکیں نتیجہ یہ ہوا کہ پھر ہم نے کامل دو سال تک فکر شعر کی طرف بھولے سے بھی رخ نہیں کیا ۔ مگر قدرت کو ہمیں برا بھلا شاعر بنانا منظور تھا ۔ چنانچہ اُس نے غیب سے اس کے سامان مہیا کر دیئے ۱۸۹۰ء میں منشی سجاد حسین انصاری نے محلہ انصاریان سہارنپور میں اپنے مکان پر ایک ماہانہ مشاعرے کی بنا ڈالی ۔ جس کا پہلا مصرعہ طرح تھا ۔ "ہائے کیا نیند ہی جو لگی" اس طرح کا ہونا تھا کہ ہمارا سویا ہوا شوق شاعری پھر جاگ اُٹھا ۔ عطار[؎] تخلص اختیار کیا ۔ غزل کہی اور مولانا حبیب الرحمن صاحب بیدل سہارن پوری اول مدرس مدرسۂ مظاہر العلوم سہارنپور (جو حضرت غالب مرحوم کے شاگرد اور سہارنپور میں اُس وقت بہترین شاعر مانے جاتے تھے) اصلاح لیکر اس مرتبہ ہمت کر کے

؎ ۔ عطار تخلص ہمارا پہلا تخلص تھا جو ہمارے ایک عزیز دوست حکیم نظر حسین مسیحا نے ہمارے لئے تجویز فرمایا تھا ورنہ ہم اس سے پہلے اکثر الطاف جو ہمارے نام کا ایک جزو ہے بطور تخلص استعمال کیا کرتے تھے یہ عطار تخلص ۹۵ و ۹۶ء تک جاری رہا اور بعد کو آزاد سے بدل گیا ۔ آزاد انصاری ۔

مشاعرے میں پڑھ ڈالی اِس غزل کی ہم کو ایسی غیر معمولی داد ملی کہ ہمارا دل بڑھ گیا۔ اور جب تک مشاعرہ قایم رہا یعنی قریبًا چھ ماہ تک ہم غزلیں کہکر اور مولانائے موصوف سے اصلاح لیکر برابر مشاعروں میں پڑھتے رہے۔ چھ مہینے بعد یہ مشاعرہ بند ہو گیا۔ مگر اب ہماری طبیعت کھل چکی تھی حوصلہ بڑھ چکا تھا۔ خود نئی نئی طرحوں پر غزلیں کہتے احباب کو سناتے اور داد حاصل کر کے خوش ہوتے۔ مگر افسوس کہ اُن غزلوں میں کا اب کوئی شعر ہمارے حافظے میں محفوظ نہیں جس کو ہم بطور نمونۂ کلام ابتدائی یہاں درج کر سکیں۔

اسی اثناء میں ہم کو اک دوسرا موقع ملا جس نے ہمیں مشق شعر میں کافی مدد دی۔ ہمارے مکان سے کچھ فاصلے پر قاضی محمد یٰسین صاحب مرحوم رہتے تھے۔ قاضی صاحب موصوف اگرچہ شاعر نہ تھے۔ مگر کافی صاحب علم اور بے حد سخن فہم و سخن شناس تھے اُن کے مکان پر اکثر شعرا اور اُدباء کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ اتفاق سے ہم بھی اُس محفل میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک صاحب ولی حسن ناظم بھی تشریف لایا کرتے تھے جن کو شعر و شاعری کا بے حد ذوق تھا۔ اک روز رات کے وقت یہ تجویز ہوئی کہ اک مصرع طرح دیا جائے۔ جس پر ہم اور ناظم صاحب رات کو غزلیں کہیں اور صبح کو اس مجمع میں آکر سنائیں۔ طرح مندرجہ ذیل تجویز ہوئی۔ ہنر مندوں سے بہتر آجکل ہیں بے ہنر دیکھو

چنانچہ ہم دونوں نے رات کو غزلیں کہیں اور صبح اس مجمع میں جا کر سنائیں۔ جن کی ہم دونوں کو حسبِ حیثیت کافی داد ملی۔ ہماری یہ غزل ۱۸ و ۱۹ شعر کی غزل تھی جو ضایع ہوگئی اور جن میں سے ہم کو صرف چار شعر یاد رہ گئے ہیں جنھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جو الفت[1] کا مزا لکھنا ہے تم بھی عشق کر دیکھو — نصیبِ دشمناں مرنا ہے گر منظور مر دیکھو
عجب حالت ہے دل کی کوئی غم ہو کوئی آفت ہے — جہاں دیکھو اسی کم بخت کو سینہ سپر دیکھو
چرا کر دل کو دزدیدہ نگاہوں سے وہ کہتے ہیں — یہاں ہوگا وہاں ہوگا ادھر دیکھو ادھر دیکھو
عطارد کوششِ کسبِ ہنر سے فائدہ کیا ہے — ہنرمندوں سے بہتر آجکل ہیں بے ہنر دیکھو

اس روز سے کچھ دستور سا ہوگیا کہ شام کو مصرعِ طرح دیا جاتا۔ رات کو ہم اور ناظم صاحب اپنے اپنے گھر جا کر سونے سے پہلے غزل کہتے اور صبح کو مشاعرے میں جا کر سناتے۔ یہ سلسلہ کچھ کم و بیش ایک سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد بند ہوگیا۔ لیکن ہمارا شغل شاعری بدستور جاری رہا۔ اس زمانے میں لکھنو سے "پیامِ یار"۔ قنوج سے "پیامِ عاشق" اور دہلی سے "زبانِ دہلی" مشہور ماہانہ گلدستے شایع ہوتے تھے۔ جن کی اکثر طرحوں پر ہم کو غزلیں کہنے کا اتفاق ہوا ہے اور جو بعدِ اصلاح حضرت مولانا بیدل رح ان گلدستوں میں شایع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہم اکثر احباب کی

[1] اس غزل کا مطلع اور مطلع کے بعد کا شعر دیوان میں شامل ہے۔

فرمایش یا اپنی مرغوب طبع یا طبع زاد طرحوں پر غزلیں کہتے رہتے تھے۔ اور صرف
غزلیں ہی نہیں۔ بلکہ ہم کو اکثر اوقات اپنے عزیزوں۔ دوستوں یا دوستوں کے اعزہ
کی تقاریب شادی پر مبارکبادیں اور سہرے بھی لکھنے پڑتے تھے۔ ان مبارکبادوں
اور سہروں میں سے اب ہمارے پاس کچھ باقی نہیں۔ البتہ ایک مبارکباد کے
(جو عزیزی منشی انعام الحق مرحوم کی تقریب شادی پر بہ خلوص دل لکھی گئی تھی)
صرف تین شعر یاد رہ گئے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

خوشی و عیش و عشرت کا ہمیں ساماں مبارک ہو ... مبارک ہو یہ شام وصلت جاناں مبارک ہو
ہے سہرا سر پہ کنگنا ہاتھ میں زیب گلو بدھی ... گل مقصود سے لبریز ہے داماں مبارک ہو
کرے آباد دولہا اپنی آغوش تمنا کو ... دلہن کو یہ بہار گلشن ارماں مبارک ہو

بات یہ ہے کہ یہ زمانہ ہماری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ شوقِ شعر گوئی بلکہ یوں
کہنا چاہیئے کہ خبطِ شعر گوئی حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ رات دن شعر و شاعری
کا جنون سر پر سوار رہتا تھا۔ ہر وقت کاغذ پنسل جیب میں رکھتے تھے۔ جہاں
کسی نے کوئی فرمایش کی۔ ہم نے فوراً پنسل اور کاغذ جیب سے نکالا اور فکر شروع کر دی۔
مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم اس زمانے میں شعر تو کہتے تھے اور رات دن کہتے تھے
مگر یہ نہ جانتے تھے کہ شعر کسے کہتے ہیں۔ صرف وزن و ردیف و قافیہ اور رعایت

لفظی کی پابندی کے ساتھ کسی مضمون محاورے یا ضرب المثل کو موزوں کر دینا ہمارے
نزدیک شعر تھا۔ حالانکہ شعر کا مرتبہ اِس سے بہت بلند اور وراء الورا ہے۔
جب ہم نے اوّل اوّل شعر کہنا شروع کیا ہے۔ اُس وقت مولانا محمد حسین آزاد
مرحوم کی مشہور تصنیف "آبحیات" اور اُن کے مرتبہ و مؤلفہ دیوان ذوق کا جادو
ہم پر چلا ہوا تھا۔ اور چونکہ ہمارا دماغ اِن دونوں کتابوں کی کثرت مطالعہ
کی بدولت بالکل مسحور ہو چکا تھا۔ اِس لئے ہم شیخ محمد ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ
ہی کو اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے اور مصنف "آبحیات" کی غلط تعلیم کی بدولت
یہ خیال دل میں راسخ ہو گیا تھا کہ ذوق مرحوم جیسا زبردست شاعر
نہ کبھی پہلے ہوا ہے۔ اور نہ آئندہ ہونے کی اُمید۔ لہٰذا ہم ایک کافی عرصے
تک ذوق ہی کو خدائے سخن سمجھتے اور اُس کے اتباع پر فخر کرتے رہے اور
اتباع ذوق ہی پر کیا منحصر ہے اُس غلط تعلیم کی بدولت ہماری گمراہی یہاں
تک بڑھی کہ ہماری طبیعت میں لکھنوی شاعری کے جراثیم پیدا ہو گئے۔ اور
ہم ذوق مرحوم کے بعد ناسخ۔ رشک۔ وزیر۔ اسیر۔ اور امانت وغیرہ کو تمام شعر

لہ ان بزرگوں کے اسمائے گرامی اس بیان میں بطور اظہار واقعہ لانے ضروری تھے۔ حاشا کہ اس سے ان بزرگوں کی توہین ہرگز مقصود نہیں۔ بلکہ مجھکو اعتراف ہے۔ کہ ان قابل احترام لکھنوی بزرگوں نے بلحاظ تہذیب و صفائی زبان اردو کی وہ خدمت انجام دی ہے جو اہل دہلی سے بھی باکزگی ممکن نہ ہو سکی تھی۔ یہ ان بزرگوں کا زبان اردو پر اتنا بڑا احسان ہے کہ جس کو تمام اہل زبان اب تک مانتے چلے آتے ہیں اور جو یقیناً ہمیشہ مانا جائیگا۔ یہ صحیح ہے کہ رفعت خیالات و پاکیزگی جذبات ان بزرگوں کے کلام میں بہت کم حکم رکھتی ہے۔ مگر اس کو ماحول کا اثر سمجھنا چاہیئے۔ اگر اہل دہلی اُس زمانہ میں لکھنؤ میں پیدا ہوتے تو بالیقین اُن کی شاعری بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی۔ آزاد انصاری۔

پر ترجیح دینے لگے۔ اور انہیں بزرگوں کی بالکلیہ پیروی کرنے لگے۔ جس سے لکھنوی رنگ تغزل کی بلا ہم پر مسلط ہو گئی۔ افسوس کہ اُس زمانے یا اُس کے ماقبل و مابعد زمانے کی بکواس (جیسا کہ آیندہ صفحات سے معلوم ہوگا) ہم نے خود اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالی۔ اگرچہ وہ اسی قابل تھی۔ لیکن محفوظ رہتی تو اِس وقت بطور نمونہ کلام ابتدائی کام آتی۔ حافظے پر بہت کچھ زور ڈالنے کے بعد اُس زمانے کے صرف تین شعر یاد آئے ہیں جنہیں درج ذیل کیا جاتا ہے

عاشق گیسوئے خمدار چلے جاتے ہیں　　پا بہ زنجیر گرفتار چلے جاتے ہیں

تیری آنکھوں میں کبھی پاس مروت نہوا　　تجھکو طوطے کی طرح آنکھ بدلتے دیکھا

بوالہوس! گنجفۂ عشق کوئی کھیل نہیں　　یہ وہ بازی ہے کہ جانبازوں کے سر جاتے ہیں

جس زمانے میں ہم ایسی لغو شاعری کے خبط میں مبتلا تھے اکثر ہمارے بلند نظر اقارب و احباب جن میں عزیزی مولوی محمد زکریا صاحب کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اور خود ہمارے اُستاد مولانا بیدل علیہ الرحمتہ نے ہم کو اکثر سمجھایا کہ اگر تم کو کسی کا اتباع کرنا ہی تو میر۔ غالب اور مومن کا اتباع کرو کیونکہ ان بزرگوں کی شاعری ذوق اور دوسرے تمام شعراء سے ترقی یافتہ ہے مگر یہ بات کبھی ہماری سمجھ میں نہ آئی اور ہم برابر ایک عرصہ تک حضرت ذوق ہی کو تمام شعرا پر ترجیح دیتے رہے اور انھیں کی پیروی و تقلید اپنا دین و ایمان

سمجھا کئے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم اپنے مہربان اُستاد حضرت بیدل
علیہ الرحمۃ کا پاسِ ادب بھی اُٹھا کر بالائے طاق رکھ دیتے تھے اور ڈھیٹ
بن کر اُن سے کج بحثی کرنی شروع کر دیا کرتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ جب
ہم اس قسم کی کج بحثی میں حد سے گذر گئے تو حضرتِ بیدل علیہ الرحمۃ مکدر
و منغص ہو کے فرمانے لگے کہ عزیزِ من! اِس کج بحثی سے کیا فائدہ۔ تمہارے
ذوق ہی خدائے سخن بنے مگر یاد رکھو۔ تمہاری شاعری ابھی ابتدائی حالت
میں ہے۔ اور ابھی تک تم میں شاعر و متشاعر میں تمیز کرنے کی قوت پیدا نہیں
ہوئی۔ آثار کہہ رہے ہیں کہ اگر عمر نے وفا کی اور تمہاری مشقِ سخن بھی جاری
رہی تو ایک روز تم اردو کے نامور شاعر بن کے رہو گے۔ اگر میرا یہ خیال
صحیح ہے تو وہ دن دور نہیں کہ جلد یا بدیر تم کو تمام اردو شعرا پر میر، غالب
اور مومن کی فوقیت تسلیم کرنی پڑے گی۔ اب خدا کی قدرت دیکھیے کہ ہمارے
اُستاد حضرتِ بیدل علیہ الرحمۃ کی یہ پیش گوئی کیونکر حرف بحرف صحیح ثابت
ہوتی ہے اور ہماری طبیعت کیونکر رفتہ رفتہ پلٹا کھاتی ہے۔ اگرچہ ہم میر،
غالب اور مومن کے اشعار میں اِک خاص لذت پاتے تھے جو ذوق کے
کلام میں مفقود تھی۔ مگر اِس پر بھی ہم ذوق ہی کو اردو کا سب سے بڑا شاعر

سمجھتے تھے اور اسی کے اتباع کو اپنے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ ہم کو ابھی اپنی اختیار کی ہوئی پست شاعری کے غار سے نکلنے اور میر و غالب کی شاعرانہ بلندی تک پہنچنے کے لئے بہت سے زینے طے کرنے باقی تھے۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے فصیح الملک حضرتِ داغ دہلوی۔ حضرتِ ظہیر دہلوی حضرتِ امیر مینائی لکھنوی۔ حضرتِ تسلیم لکھنوی اور حضرتِ جلال لکھنوی وغیرہ استادوں کی شاعری کے شباب کا زمانہ تھا اور ان بزرگوں کا کلام پیامِ یار۔ پیامِ عاشق اور دامنِ گلچین وغیرہ اُس زمانے کے مشہور گلدستوں میں بہ کثرت شائع ہوتا رہتا تھا۔ جو ہماری نظر سے بھی بالاکثر گذرا کرتا تھا رفتہ رفتہ اِن باکمال اُستادوں کی صاف و سادہ زبان۔ شوخ و دلکش اندازِ بیان اور نادر و خوش گوار ترکیبوں نے ہماری طبیعت پر اپنا اثر کرنا شروع کیا۔ اُس وقت تک اِن حضرات میں سے حضرتِ تسلیم لکھنوی کا پہلا دیوان۔ حضرتِ جلال لکھنوی کا پہلا دیوان (جن کے اب ہمیں نام یاد نہیں) حضرتِ امیر مینائی کا پہلا دیوان "مرأت الغیب" اور حضرتِ داغ دہلوی کے دو دیوان گلزارِ داغ" اور آفتابِ داغ شائع ہو چکے تھے

ہم نے اِن سب کو خرید کر مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری طبیعت اپنی اُس وقت تک کی شاعری سے یک لخت بیزار ہو گئی اور اِن صاحب کمال استادوں کی رنگین اور شوخ و دلکش شاعری نے ہم کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ہم کئی سال تک اِن بزرگوں کا اِتباع کرتے رہے۔ یہاں تک بالخصوص باکمال استادوں کا رنگ ہماری طبیعت پر غالب آنے لگا۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گو حضرتِ امیر مینائی اور حضرتِ تسلیم لکھنوی کے اندازِ بیان نے بھی ہم کو رنگ تغزل بدلنے میں کافی مدد دی مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم نے حضرتِ داغ دہلوی اور حضرتِ جلال لکھنوی کے شوخ و رنگین کلام سے زیادہ اور بہت زیادہ فیض حاصل کیا ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ آخر تک ان صاحب کمال استادوں کے کلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ تو کچھ اِس میں زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ مختصر یہ ہے کہ پانچ چھ سال تک ہم بالخصوص صاحب طرز بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر شعر میں کمال حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ اُس زمانہ کے جو اشعار حافظے میں باقی رہ گئے ہیں اور جن کو ہم آئندہ صفحات میں درج کرنے والے ہیں۔ ان میں قارئین کرام کو ان بزرگوں کا رنگ پوری طرح سے نہ ہی لیکن اک بڑی حد تک ضرور جھلکتا

نظر آئے گا غرض یہ کہ جس قدر ہماری مشقِ سخن بڑھتی گئی، اُسی قدر ہم کو
اچھا شعر پہچاننے سمجھنے اور کہنے کی زیادہ قدرت حاصل ہوتی گئی۔ اور
اور جس قدر زیادہ قدرت حاصل ہوتی گئی اُسی قدر ان باکمال بزرگوں کے
اِتّباع سے جی اکتانے لگا۔ یہ بات نہیں کہ اِن باکمال بزرگوں کا کلام ہماری
نظر سے گر گیا تھا۔ نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں یہ خیالات گھر
کرنے لگے تھے کہ اگر ہم داغ و جلال کا اتّباع کرتے رہے تو اِس سے کچھ حاصل
نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم داغ و جلال تو بن نہ سکیں گے اِس لئے کہ ہر حقیقی شاعر
و ادیب اپنا رنگ بیان خود پیدا کرتا ہے۔ جس کو حاصل کرنے میں کوئی
بھی پورے طور سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اگر بفرض محال کچھ تھوڑے
بہت کامیاب ہو بھی گئے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم کو اِن بزرگوں
کی نقّالی کا درجہ حاصل ہوجائیگا۔ ہم مخصوص انداز بیان رکھنے والے
شعراء کے مرتبہ تک فائز نہ ہوسکیں گے۔ ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ
ہم مشہور و مختلف اور نامور شعرائے ماضی و حال کے انداز ہائے بیان سے
مدد لیکر کوئی نئی راہ ڈھونڈیں اور اپنے لئے کوئی نیا انداز بیان پیدا کریں۔
یہ خیال پختہ ہوتا گیا۔ یہاں تک اِک دن وہ آیا کہ ہمارا دل اپنی اگلی پچھلی

شاعری سے بالکل نفور اور اس قدر نفور ہو گیا کہ یک بیک ہم اُٹھے اور اُٹھکر اپنا سالہا سال کا تمام ذخیرۂ شعر و شاعری جو قریبًا ساڑھے تین سو غزلوں سے زیادہ مبارک بادوں۔ سہروں اور قطعات وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور نکال کر پارہ پارہ کر کے نذرِ آتش کر دیا۔ اور تہیہ کر لیا کہ اب اگر کچھ کہیں گے تو اپنا کوئی خاص اندازِ بیان پیدا کر کے کہیں گے ورنہ ایسی نقالانہ شاعری اور ایسے سطحی کہنے سے نہ کہنا اچھا چنانچہ تمام اساتذہ متقدمین و متاخرین کے دواوین کا خواہ وہ دہلوی ہوں یا لکھنوی بامعانِ نظر مطالعہ شروع کر دیا گیا۔ دیوان مجروح دیوانِ شیفتہ۔ دیوانِ ظہیر اور حضرت امیر مینائی کا دوسرا دیوان صنمخانۂ عشق جو اس وقت تک طبع ہو کر شائع ہو چکے تھے بہم پہنچا لیئے گئے۔ آخر ہم اِن تمام باکمال بزرگوں کے کلام کا بار بار اور غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد جس نتیجے پر پہنچے وہ وہی تھا۔ جس کا بعض ہمارے بلند نظر احباب عمومًا اور ہمارے شفیق اُستاد حضرت بیدل علیہ الرحمۃ خصوصًا ہم کو باصرار مشورہ دیا کرتے تھے یعنی اگر شعر میں ترقی کرنی ہے تو ہمیں میر غالب۔ مومن کا اتباع کرنا چاہیئے۔ اب ان میں مجروح اور شیفتہ کا اور اضافہ ہو چکا تھا مختصر یہ کہ ہم نے اِنھیں پانچوں صاحب کمال اُستادوں

کے کلام کو سامنے رکھکر مشق سخن شروع کردی۔ مگر افسوس ہے کہ ہمیں مسلسل اور لگاتار محنت و کوشش اور رات دن کی جگر کاوی و دماغ سوزی کے باوجود سخت مایوسی و ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم اتّباع کرنا چاہتے تھے۔ میر و غالب وغیرہ کا اور شعر نکلتے تھے داغ و امیر وغیرہ کا رنگ لئے ہوئے ہم اڑنا چاہتے تھے عرش معلی کی بلندیوں تک مگر جا گرتے تھے تحت الثریٰ کی پستیوں میں۔ ہم لکھتے تھے اور پھاڑ پھینکتے تھے۔ پھر لکھتے تھے اور پھاڑ پھینکتے تھے۔ ہر چند بلند ہو کے کہنا چاہتے تھے مگر کامیاب نہ ہوتے تھے اگر کبھی کچھ تھوڑی بہت کامیابی نصیب بھی ہوتی تھی تو برائے نہ ہونے کے برابر۔

ہم اسی کشمکش و ضیق میں مبتلا تھے کہ معلوم ہوا حضرت علامہ حالی علیہ الرحمۃ کا دیوان طبع ہو کر شائع ہو گیا ہے اور بازار میں موجود ہے ہم فوراً گئے اور خرید لائے۔ اور مشق سخن چھوڑ چھاڑ ہمہ تن اُس کے مطالعے میں غرق ہو گئے یہاں یہ بات واضح کردینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ دیوان حالی مع مقدمہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہو چکا تھا۔ مگر بدقسمتی سے ہم کو ۱۸۹۵ء میں دستیاب ہو سکا۔ اگر وہ ہم کو دو سال پہلے دستیاب ہو جاتا تو بالیقین ہمارے

یہ دو سال اِدھر اُدھر بھٹکنے اور اندھوں کی طرح چاروں طرف رستا ٹٹولنے میں ضائع نہ ہوتے۔ مگر "خیر دیر آید درست آید"

ہم علاّمہ حالی علیہ الرحمۃ کی جدید رنگ کی شاعری کے پہلے ہی سے گرویدہ، پرستار اور مدّاح تھے کیونکہ "مُسدّسِ حالی"۔ "شکوۂ ہند"۔ "بیوہ کی مناجات اور مثنوی برکھارُت" وغیرہ اُن کی مشہور تصانیف بہت پہلے شایع ہو چکی تھیں اور ہمارے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ اِن مشہور و مقبول تصانیف کے علاوہ اُن کی وہ قومی و ملّی نظمیں جو ہر سال مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کے لئے خاص طور سے بالالتزام لکھی جاتی تھیں ہماری نظر سے گذرتی رہتی تھیں۔ ہم ان کی اس جدید العصر اور اُس زمانہ کے لحاظ سے بالکل انوکھی اور ترقی یافتہ شاعری کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ اور جی چاہتا تھا اور بے اختیار چاہتا تھا کہ کاش! ہم کو بھی اس قسم کی شاعری آجائے مگر رستا نہ ملتا تھا ہم نے اُن کی نظموں کو سامنے رکھکر ان کی نقّالی اور پیروی و تقلید کی کوشش بھی کی مگر کبھی قدرے قلیل بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی - اور کامیابی حاصل ہوتی تو کیونکر ہوتی اُس زمانے کی معمولی رائج الوقت شاعری میں تو ٹھیک طرح ہمارا ٹٹو نہ چلتا تھا ایسی

مصلحانہ و حکیمانہ شاعری تک ہماری رسائی دفعتاً کیونکر ہو سکتی تھی۔

مگر اب جو اُن کا دیوان مع مقدمہ شعر و شاعری ہمارے ہاتھ لگا تو گویا بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اُس دیوان اور مقدّمۂ دیوان کے انہماک کے ساتھ بار بار مطالعے سے جو رہروانِ منزلِ شعر و شاعری کے لئے اب تک رہنمائی کا فرض انجام دے رہا ہے اور بالیقین ابھی غیر معینہ مدّت تک انجام دیتا رہے گا یہ رازِ سربستہ ہم پر اک بڑی حد تک آشکارا ہو گیا کہ شاعری کیا ہے اور حقیقی شعر کسے کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اُس مقدّمے کے بتائی ہوئی شاہراہ پر اپنا سفر شروع کر دیا۔ لیکن یہ ہمارا سفر نہایت کٹھن سفر ثابت ہوا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں (کھائی) پڑیں جگہ جگہ گمراہ ہوئے۔ مگر اُس مقدّمے نے ہمیشہ ہماری رہبری کی اور ہم کو ہمیشہ خلافِ راہِ منزل جانے سے روکا۔ ایک عرصہ تک ہم ٹھوکریں کھا کھا کے گرتے رہے اور وہ ہمیں سنبھالتا رہا۔ ہم بھٹکتے رہے اور وہ ہماری رہنمائی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تاریکیاں گھٹیں، روشنی بڑھی اور آثارِ منزلِ مقصود نظر آنے لگے

ہم اس سے پہلے عرض کر آئے ہیں کہ ہمارا دل شاعری میں پانچ چھ سال تک داغ - جلال اور حضرت امیر مینائی وغیرہم کے نقشِ قدم پر چلنے کے بعد ان باکمال اصحاب کے اتّباع سے اکتا گیا اور ہم نے اپنا تمام اگلا پچھلا ذخیرۂ شعر و شاعری

بیزار ہو کر نذرِ آتش کر ڈالا۔ اور اُس کے ساتھ اپنے قدیم تخلص "عُطارد" کو بھی خیرباد کہہ دی اور آزاد تخلص اختیار کر لیا۔ اب جب کہ نہ قدیم شاعری باقی رہی نہ قدیم تخلص اور ہم شاعری کے نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے وہ اشعار جو ہمارے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں بطور نمونۂ کلام ابتدائی ناظرین کر دیں۔ اگر ہمارا قدیم مجموعۂ کلام باقی رہتا اور ہم اسے اپنے ہاتھوں برباد نہ کر ڈالتے تو ہم بالیقین زیادہ بہتر ابتدائی انتخاب پیش کر سکتے کیونکہ اس قدیم مجموعے میں بھی قدیم رنگ کے اکثر اچھے اشعار موجود تھے۔ مگر اب افسوس سے کیا فائدہ۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ہمارا خیال ہے جس قدر قدیم اشعار ہمارے حافظے میں باقی رہ گئے ہیں وہ قدیم رنگِ سخن کا نمونہ دکھانے کے لیے ایک بڑی حد تک کافی ہو سکتے ہیں۔ لہذا ہم نیچے اُن قدیم اشعار کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ذیل میں درج کرتے ہیں۔ پہلا حصہ داغ و امیر وغیرہ کے تقلیدی زمانے کا ہے اور دوسرا حصہ غالب مومن وغیرہ کے تقلیدی زمانے کا۔

داغ و امیر وغیرہ کے تقلیدی زمانے کے اشعار

سوزِ نہاں ہزار ہو لب پر فغاں نہیں ۔۔۔ ایسی لگی ہے آگ کہ مطلق دھواں نہیں

کہتا ہوں میں جو ایک سناتے ہیں وہ ہزار ۔۔۔ گز بھر کی ہے زبان اور اس پر دہاں نہیں

اللہ اپنا عشق عطارد عطا کرے　　اب میرے دل کو خواہشِ وصلِ بتاں نہیں

نہ کچھ تم برے ہو نہ عادت بری ہے　　بری ہے اگر اپنی قسمت بری ہے

جو دل کہتا ہے اُس سفاک پر میں دل سے مائل ہوں　　کلیجا بڑھ کے کہتا ہے کہ میں بھی نیز شامل ہوں
کریں گے خضر راہِ عشق میں کیا رہبری میری　　وہ کوسوں مجھ سے پیچھے ہیں میں آگے چند منزل ہوں
مسلمان کرکے چھوڑا اُس بتِ کافر کو بھی آخر　　عطارد مانتا ہوں میں تمہیں واللہ قائل ہوں

نہیں نہیں ہی رہی عرضِ مدعا پہ سدا　　کبھی زبان نہ اُٹھی تمہارے ہاں کیلئے
لباسِ عقل عطارد کیا بشر کو عطا　　ہزار شکر خداوندِ دوجہاں کے لئے

لبِ جان بخش کے بوسے دکھاتے ہیں مسیحائی　　ہمارے دردِ بے درماں کے درماں ہوتے جاتے ہیں

پہن کر سرمئی جوڑا نہ جاؤ سیرِ گلشن کو　　حسینانِ چمن پہ چھیڑیں گے لونڈی کہہ کے سوسن کو

جو غیروں پہ لطف و کرم کیجئے گا　　ستم کیجئے گا ستم کیجئے گا

یہ کوئی ضد ہے کہ حالِ دلِ حزیں ظالم! | گھڑی گھڑی میں کہوں تو گھڑی گھڑی بھولے

دہن وابستہ ہو جائے زباں گر اپنی گویا ہو | زباں گویا نہ ہو گر قصدِ اظہارِ تمنا ہو
نتیجہ سوچ لے ہر کام کا انساں پہلے سے | ہمیشہ کام اچھا ہو، اگر انجام اچھا ہو

بدزبانی کی کوئی حد بھی ہے، آخر تا کجا؟ | ہر کہ سنگ آمد بجنگ آمد مثل مشہور ہے

غالب و مومن وغیرہ کے تقلیدی اشعار

نہ کوئی حرفِ باطل ہوں نہ کوئی مدِ فاصل ہوں | مٹاتے ہو مجھے کیوں، کیا مٹا دینے کے قابل ہوں

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا آپ نے | حسرتِ دیدار میں ہم مر چلے
کیا ضرورت خضر کی ہم کو، کہ ہم | جب چلے بے منتِ رہبر چلے

کتنا پیارا نام ہے نامِ خدا[1] | جان و دل صدقے تمہارے نام کے
مجھ سے عاصی پر بھی رحمت کی نظر | واہ قربان تیرے لطفِ عام کے

---

[1] یہ دونوں شعر دیوان میں شامل ہیں۔

ہم تو صبح و شام ہی کے ہو لیے — گرچہ وعدے ہیں صبح و شام کے
آہ! جب تڑپے ذرا تیرے اسیر — اور دونے الجھے حلقے دام کے

یونہیں بیٹھے ہوئے کب تک تکیں ہم اپنی منزل کو — الٰہی! اور دیدے طاقتِ رفتار تھوڑی سی
وہ مجھ سے اِس ذرا سی بات پر آنکھیں چرا لیتے — کہ صرف آنکھوں کو ہی اک حسرتِ دیدار تھوڑی سی

بھنور سے بچ کے نکلنے پر خوشی کے گیت کیا گاتیں — مقدر ہی بھنور کے ساتھ ہی منجدھار کیسی ہے

ہوا جب بدرِ کامل بڑھ کے اس کا چاند سا چہرا — تو بولا حسنِ روز افزوں کہ طلعت اس کو کہتے ہیں

۱؎
تجھ سے اے نورِ مجسم ہر مکاں پُر نور ہے — ہر کلیسا کعبہ ہے، ہر کدہ کوہِ طور ہے
ٹوٹی کشتی، جوشِ طوفاں، بیڑا پار کیا — ہم ہیں، گردابِ بلا ہے اور ساحل دور ہے
ابتدائے عشق ہی میں انتہا کا اضطراب — ہوش میں آؤ ابھی آزاد! دلّی دور ہے

ہم کو اعتراف ہے اور بہ دل اعتراف کہ مندرجۂ بالا اشعار میں نہ کوئی غیر معمولی

۱؎ یہ تینوں شعر بھی شامل دیوان ہیں۔ آزاد انصاری۔

جدت ہے اور نہ کوئی غیر معمولی خوبی۔ نہ خیالات میں پوری گہرائی ہے نہ انداز بیان میں کافی گیرائی۔ نہ بندشیں چست ہیں اور نہ پیرایۂ کلام درست۔ نہ ان میں رفعتِ فکر پائی جاتی ہے اور نہ دقّتِ نظر۔ نہ ان میں داغ و امیر کا پورا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ اور نہ غالب و مومن کا۔ تاہم وہ شعر ہیں۔ اگر اعلیٰ درجہ کے نہیں تو نہ سہی۔ اوسط درجہ کے ضرور ہیں۔ اس کو نہ بھولیے کہ جس زمانے کے یہ شعر ہیں ہم مبتدی تھے اور بالکل مبتدی۔ اور اِک مبتدی سے منتہیانہ توقع رکھنی بالکل فضول ہے۔

ہم اندراجِ اشعارِ قدیم سے پہلے عرض کر آئے ہیں کہ حضرت علامہ حالی علیہ الرحمۃ کے دیوان اور مقدمے نے ہماری رہنمائی کی اور یہاں تک رہنمائی کی کہ ہمیں آثارِ منزلِ مقصود نظر آنے لگے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے کہ جس زمانے سے ہماری شاعری بچوں کی طرح گھٹنوں کے بل چلنا چھوڑ کر قلانچیں مارنے لگی اور اس نے ریل اور ہوائی جہاز کی رفتار سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ہم کو منزلِ مقصود تک پہنچا کر دم لیا۔

مگر ہم اس زمانے میں پیروی تو کیا کرتے تھے حضرت علامہ حالی علیہ الرحمۃ کی

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم پست کہنے لگے تھے۔ پست کہنا تو درحقیقت کم ہو گیا تھا۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر کہنے لگے تھے۔ بلند ہو کر کہنے لگے تھے۔ اشعار میں معنویت پیدا ہو چکی تھی اور مخصوص انداز جان کی طرف قدم بڑھے۔ (اداء الظفر)

اور اصلاح لیا کرتے تھے حضرت مولانا بیدل علیہ الرحمۃ سے مولانائے ممدوح جو ابتدا ہی سے
ہمارے تغیر طبیعت کا بغور مطالعہ کرتے آرہے تھے ایک روز فرمانے لگے کیوں میاں
آزاد اب کیا رائے ہے۔ تمہارے خدائے سخن ذوق کی شاعری زیادہ بلند اور ترقی یافتہ
ہے یا غالب اور مومن وغیرہ کی ہم نے اعتراف قصور کیا۔ اور اپنی گذشتہ بیہودگیوں
کی معافی چاہی۔ فرمانے لگے نہیں۔ طلب معافی کی ضرورت نہیں ہم جانتے تھے کہ تم
ابھی مرتبہ شعر سے ناواقف ہو اور مولانا آزاد دہلوی کی آبحیات کا جادو تم پر چلا ہوا ہے
اس لئے ہماری طبیعت نے تمہارے خلاف کبھی کوئی برا اثر نہیں لیا۔ ہم نے باادب
و لجاجت عرض کیا کہ بالکل درست لیکن اس پر بھی جب تک ہم جناب کی زبان سے
مژدۂ عفو نہ سن لیں گے ہمارے دل کو سکون نصیب نہ ہوگا۔ جواباً فرمایا اچھا اگر
تمہاری یہی مرضی ہے تو ہم نے تم کو معاف کیا"۔ یہ سن فرط خوشی سے ہماری آنکھوں
میں آنسو ڈبڈبا آئے ہم فوراً اٹھے اور بھرائی ہوئی آواز میں بہ طور شکریہ آداب
بجالائے۔ مولانائے ممدوح نے ہماری آنکھوں سے جو آنسو جاری دیکھے بیتاب
ہو کر اٹھے اور ہمیں گلے سے لگا لیا اور فرمانے لگے ہیں تم روتے کیوں ہو۔ واللہ ہم نے
تمہیں دل سے معاف کر دیا۔ آہ! ایسے درمند اور شفیق استاد کسے نصیب ہوتے ہیں
ہمیں علامہ حالی علیہ الرحمۃ کا دیوان اور مقدمہ ہاتھ آئے اور اس سے کسب فیض

کر لئے کم و بیش ایک ہی سال ہوا تھا کہ قسمت نے ایک نیا گل کھلایا اور وہ یہ کہ دفعتاً ہمارے شفیق استاد حضرت بیدل علیہ الرحمۃ جو اب تک مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے مدرس اول تھے۔ دار العلوم حیدرآباد دکن کے مدرس اعلیٰ مقرر ہو کر دکن تشریف لے گئے اور ہم ان کی توجہات اور ان کے فیوض سے ایک بڑی حد تک یک لخت محروم ہو گئے۔ اگرچہ شغل شاعری بدستور جاری رہا اور اس کے ساتھ بذریعہ خط و کتابت سلسلۂ اصلاح بھی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بوجہ بعد مکانی حصول اصلاح میں سخت دشواریاں اور ناگواریاں دقتیں رونما ہونے لگیں۔ اور جیسا کہ ہم مجموعہ ہذا کے صفحہ (۲۳۰) حاشیہ (۱) پر ہم بطور مجمل ذکر کر چکے ہیں۔ مجبوراً کسی دوسرے صاحب کمال کی تلاش ہوئی۔ بہت غور و فکر کے بعد نظر انتخاب حضرت علامہ حالی علیہ الرحمۃ پر پڑی جن کے ہم پہلے ہی سے بے حد معتقد تھے۔ بمقام پانی پت عقیدتمندانہ حاضر ہو کر اپنی دلی آرزو پیش کی۔ جس کو بہ مشکل تمام شرف قبولیت بخشا گیا بہ مشکل تمام اس لئے کہ آپ کسی کو بہت کم یہ شرف عطا فرماتے تھے اس کے بعد سے ہم حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے ان کی حیات باقی تک اکتساب فن کرتے رہے مگر افسوس ہے کہ سترہ اٹھارہ سال بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں یہ سلسلہ دوامی طور سے منقطع ہو گیا۔ اس حادثۂ جانکاہ سے تھوڑے ہی عرصہ بعد اگست ۱۹۱۸ء

میں دوسرا سخت سانحہ ہوشربا یہ پیش آیا کہ حضرت قبلہ مولانا بیدل علیہ الرحمتہ بھی رحلت فرما گئے، اور ہم ہر دو اساتذۂ فن کی ظاہری رہبری سے ہمیشہ کے لیئے محروم ہو گئے۔ اگرچہ اِن ہر دو صاحب کمال بزرگوں کا فیضانِ باطن آج تک شمع ہدایت کا کام دے رہا ہے۔ اور انشاءاللہ تاحیات دیتا رہے گا مگر آہ! وہ بات کہاں۔ ذیل کی رباعی میں انھیں جذبات غم انگیز کو سپرد قلم کیا ہے

پھر چارۂ اغلاط غزل ہی نہ ملا　　　پھر رفع نقایص کا محل ہی نہ ملا
پھر حسرتِ اصلاح بر آ ہی نہ سکی　　　پھر حالی و بیدل کا بدل ہی نہ ملا

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری مشق سخن جاری رہی۔ اور ہم فن شعر میں برابر ترقی کرتے رہے۔ اگرچہ خیالات میں رفعت۔ افکار میں گہرائی۔ زبان میں صفائی اور انداز بیان میں لوچ پیدا ہو چکا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم ۱۹۱۴ء تک باوجود سعی و کوشش کسی خاص انداز بیان کے پیدا کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ البتہ اس کے بعد سے ہمارا قدم مخصوص اندازِ بیان کی طرف بڑھنے لگا۔ اور جس طرح ہم نے شعر میں بتدریج ترقی کی تھی اسی طرح اپنے مخصوص انداز بیان میں آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگے۔ یہ ہمارا مخصوص اندازِ بیان حضرت علامہ حالی علیہ الرحمتہ اور حضرت مولانا بیدل علیہ الرحمتہ کی وفات سے پہلے اک حد تک پختہ ضرور ہو گیا تھا۔ مگر تکمیل کو نہیں پہنچا تھا۔ اس کا تکمیل کو پہنچنا بعد کی بات ہے۔

ہماری شاعرانہ خصوصیات ہر شاعر اور بالخصوص حقیقی شاعر کے کلام میں کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن سے اس کا کلام دوسرے شعرا کے کلام سے ممتاز نظر آتا ہے۔ ہم بھی اپنی پنجاہ سالہ کوشش و مشق سے اپنی شاعری میں بُری بھلی چند خصوصیات پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں، اور ہمارا خیال ہے کہ انھیں ہماری اختیار کردہ خصوصیات نے ہماری سعی و کوشش سے مل کر ہم کو اپنا رنگِ خصوصی پیدا کرنے میں مدد دی ہے۔ یہاں ان کے اظہار کو خود ستائی پر محمول نہ کیجیے بلکہ ہمارا ان خصوصیات کے اظہار سے یہ منشا ہے کہ اربابِ نظر ان خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر ہمارے کلام کا مطالعہ کریں تاکہ ہم نے جس نہج پر خدمت اردو ادب و شعر کی کوشش کی ہے وہ آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ وہ خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) کلام کی اصلی ترتیب۔ (۲) سلاست و صفائی زبان۔ (۳) ندرتِ بیان۔ (۴) تکرار الفاظ حسین۔ (۵) صنعتِ ترصیع و تقابل۔ (۶) صنعتِ ترصیع جدید کی ایجاد۔ (۷) شعر میں اصطلاحاتِ علمیہ کا استعمال

ہم ان خصوصیاتِ ہفتگانہ کو بالترتیب اجمالاً بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱) کلام کی اصلی ترتیب ۔ علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی مشہور تصنیف "موازنۂ انیس و دبیر" میں فرماتے ہیں کہ

"ترکیبِ الفاظ کے لحاظ سے شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کی اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحالِ خود قائم رہے مثلاً فاعل، مفعول، فعل، متعلقاتِ فعل، مبتدا، خبر جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں وہی ترتیب شعر میں بھی قائم رہے ۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے ۔ صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت ایک دو شعر میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے مثلاً سعدیؒ کے اشعار"

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا ۔ من گلِ ناچیز بودم — و لیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشین در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

لیکن چونکہ نظم کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے ۔ اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب

شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے۔ اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اگر اصلی ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی تو بہر حال اُس کے قریب قریب پہنچ جائے۔"

ہمارا خیال ہے کہ آپ علامہ شبلی مرحوم کی مندرجۂ بالا عبارت سے کلام کی اصلی ترتیب کا مفہوم بہ خوبی سمجھ گئے ہوں گے مگر اِس سے یہ رائے قائم نہ کر لینی چاہیئے کہ ہم نے علامۂ موصوف کی یہ رائے "موازنہ" میں دیکھ کر اُس پر عمل کرنا شروع کیا تھا۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ہم نے یہ سخت اور بقول علامۂ موصوف "ناممکن پابندی" کیوں اختیار کی۔ کب اختیار کی۔ اور کیوں اُس کو عمر بھر نباہا۔ اس کا قصہ ہم سے سنئے۔ کیوں کہ جس زمانے میں ہم نے یہ پابندی اختیار کی ہے علامۂ موصوف کا موازنہ شاید اُس وقت شائع بھی نہیں ہوا تھا، اگر شائع ہو چکا تھا تو ہماری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

سنہ ۱۸۹۵ء تھا یا سنہ ۱۸۹۶ء (ٹھیک یاد نہیں) ایک روز کا ذکر ہے کہ اثنائے فکر سخن میں دو شعر ہمارے قلم سے اتفاقیہ ایسے ٹپک پڑے جن میں مذکورۂ بالا خصوصیت موجود تھی اور جن کی نثر نہیں ہو سکتی تھی۔ ہمیں یہ بات

بہت پسند آئی۔ اور ہم نے اُسی روز سے اس کی پابندی شروع کردی۔
اول اول سخت مشکلات اور سخت دقّتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ غزل جو
ایک گھنٹے دو گھنٹے میں کہہ لیتے تھے اب دس دس اور پندرہ دن میں بھی بہ مشکل
کہی جانے لگی مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ یہاں تک کہ ہم چند سال کی محنت،
کوشش اور مشق و مزاولت سے اس پابندی کی مشکلات پر غالب آگئے۔
پہلے پہلے تو ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر کوئی لفظ کسی شعر میں کچھ اپنی اصلی جگہ
سے ہٹ کر بھی نظم ہو جاتا تھا تو ہم اس کو گوارا کر لیتے تھے مگر جب ہماری
مشق و مہارت بڑھ گئی تو ایک لفظ کا بھی اپنی اصلی جگہ سے ہٹ جانا گوارا
گذرنے لگا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۶ء سے سنہ ۱۹۰۶ء تک کم اور سنہ ۱۹۰۶ء کے بعد سے
بہت کم بلکہ شاذ و نادر ایسے الفاظ دستیاب ہو سکیں گے جو اپنی اصلی جگہ سے
ہٹے ہوئے ہوں۔ مگر فرمائشی یا ایسی غزلوں کو جو مشاعروں کی طرحوں پر
اور خصوصاً ایسی طرحوں پر جن میں کلام کی اصلی ترتیب کسی طرح قائم نہیں رکھی جا سکتی
تھی مستثنیٰ سمجھنا چاہئے کیونکہ ہم مشاعروں کی طرحوں میں اپنی اس اختیار کردہ
پابندی کو نباہ نہیں سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے مشاعروں کی طرحوں پر
بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ اور جتنی بھی کہی ہیں وہ اکثر بادل ناخواستہ کہی ہیں۔

مثلاً فروری ۱۹۲۱ء میں علی گڈھ میں طرح ہوئی:۔

"کسی دن رنگ لائے گی جفا اُن کی، وفا میری" اس مصرع کی صحیح نثر یہ ہی۔

"ان کی جفا (اور) میری وفا کسی دن رنگ لائے گی"۔ اوّل تو ردیف و قافیہ کی پابندی کی وجہ سے ان الفاظ کو اس بحر میں اصلی ترتیب کے ساتھ نظم نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے قافیہ ہے "وفا" اور ردیف ہے "میری" اور اصل ترتیب کے لحاظ سے "میری" کو پہلے آنا چاہیے اور لفظ "وفا" کو بعد میں لیکن بحر اور طرح کی پابندی کے باعث ظاہر ہے کہ "میری وفا" کسی طرح موزوں نہیں کیا جاسکتا۔ مگر احباب کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ہم کو غزل لکھنی پڑی اور جہاں تک اصل ترتیب نبھ سکتی تھی ہم نے اس کے نباہنے کی کوشش کی مثال ملاحظہ ہو۔

محبت میں بقا میری، محبت میں فنا میری

محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری

اس مطلع کی صحیح نثر یوں کی جائے گی۔

محبت میں میری بقا (ہے)۔ محبت میں میری فنا (ہے)۔ محبت میری ابتدا (ہے) محبت میری انتہا (ہے)

اِس مثال سے ظاہر ہے کہ صرف ایک لفظ "میری" اپنی اصلی جگہ سے ہٹ کر نظم ہوا ہے۔ مگر چونکہ یہ ردیف واقع ہوا ہے اور ردیف ہمیشہ آخر شعر میں آتی ہے، اس لئے اس لفظ کو کسی طرح قافیہ سے مقدّم نہیں لایا جاسکتا تھا۔

علاوہ ازیں ایسی طرحوں میں ردیف وقافیہ کی پابندی کی وجہ سے دوسرا مصرع تو ہمارے بس کا نہیں ہوتا تھا مگر پہلا مصرع ہمارے اختیار کا ہوتا تھا اس لئے ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ کم سے کم پہلے مصرعوں کی حد تک کلام کی اصلی ترتیب قائم رہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

تری الفت مرا مذہب، تری عظمت مرا مشرب
شریعت بھی جُدا میری، طریقت بھی جدا میری

اُسی بیم و رجا میں ہوں، اُسی دُہری بلا میں ہوں
وہی تُو اور جفا تیری، وہی میں اور وفا میری

اس کے علاوہ بھی بعض غزلوں یا نظموں میں خال خال ایسے اشعار ملیں گے جن میں الفاظ کی اصلی ترتیب نہیں پائی جاتی مگر وہاں مندرجہ ذیل تین وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ ضرور پائی جائے گی۔

(۱) مقطع لکھنا ہے مگر تخلص اپنی اصلی جگہ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ لہٰذا ایسی جگہ تخلص کی حد تک بے ترتیبی کو گوارا کر لیا گیا۔ مثال ملاحظہ ہو۔

تم آزاد کس خوابِ غفلت میں ہو   زمانے کا رُخ دوسرا ہو گیا

یہاں آزاد پہلے آنا چاہئے تھا اور تم اُس کے بعد۔

(۲) شعر اچھا ہے مگر اُس میں صرف ایک آدھ لفظ بے ترتیب آ گیا ہے اس لئے شعر کا خون کرنے کی بجائے بے ترتیبی کو گوارا کر لیا گیا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نزدیک ہے وہ دن کہ تری گرمیٔ بازار   کونین کو تیرا زربیعانہ بنا دے

ڈر شیخِ حرم اُٹھ کہ وہ غارتگرِ ایماں   کعبے کو دوبارہ نہ صنم خانہ بنا دے

پہلے شعر میں "نزدیک ہے وہ دن" بے ترتیب ہے۔ "وہ دن نزدیک ہے" ہونا چاہئے تھا۔ دوسرے شعر کے ثانی مصرع میں حرف "نہ" اپنی اصلی جگہ سے ہٹ کر نظم ہوا ہے۔ اس مصرع کی صحیح ترتیب یہ ہے "کعبے کو دوبارہ صنم خانہ نہ بنا دے"۔

(۱) بعض مقامات پر صنعتِ ترصیع و تقابل کو لازم گردان لینے کے سبب سے اس پابندی کو دانستہ ترک کر دیا گیا ہے۔ مثلاً اِک نظم الموسوم

بہ فیضانِ تاریخ کے دو شعر ملاحظہ ہوں ۔

جو راز تھے کل تک نہاں ۔ ہیں آج وہ بالکل عیاں
تاریخ سے بچتے کہاں ۔ دستِ رسا تاریخ ہے
کہتی ہے علمی روشنی ۔ وہ عقدے حل ہوں گے کبھی
ناموں سے بھی جن کے ابھی ۔ ناآشنا تاریخ ہے

پہلے شعر کی اصلی ترتیب یہ ہے "کل تک جو راز نہاں تھے وہ آج بالکل عیاں ہیں، تاریخ سے کہاں بچتے (کیونکہ) تاریخ دست رسا ہے" یعنی تاریخ کا ہاتھ بے حد رسا ہے ۔ دوسرے شعر کی اصلی ترتیب یہ ہے ۔ علمی روشنی کہتی ہے (کہ) وہ عقدے کبھی حل ہوں گے تاریخ ابھی جن کے ناموں سے بھی ناآشنا ہے"

مختصر یہ ہے کہ ہم نے مذکورۂ بالا وجوہ کے علاوہ اور کہیں اپنی اس اختیار کردہ پابندی سے عمر بھر انحراف نہیں کیا ۔ مثالوں سے دیوان بھرا پڑا ہے مگر یہاں بھی چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے کلام کی اصلی ترتیب سمجھنے میں کافی مدد مل سکے گی ۔

اُمید جزا کب تک ، امید سے کیا ہوگا ۔ کچھ آج ہوا ہوگا ۔ کچھ روزِ جزا ہوگا
بیدل بھی ہوں شاداں بھی ۔ شاکی بھی ہوں نازاں بھی ۔ جو داغ دیا ہوگا ۔ دلچسپ دیا ہوگا

تم کو بے شک روشِ اہلِ وفا آتی ہے — نہ محبّت، نہ محبّت کے مراسم کا لحاظ

ہم کو خود دردِ محبّت کی دوا آتی ہے — صبر ممکن سہی، امکان سے خارج تو نہیں

کوشش کر دیکھیئے کہ مندرجۂ بالا اشعار میں کوئی لفظ کسی صرفی یا نحوی قاعدے سے آگے پیچھے ہو سکتا یا نہیں۔ ہمارے خیال میں تو شاید آپ کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

(۲) سلاست و صفائی زبان۔ اس کی تعریف کی ضرورت نہیں۔ اس کو سب لکھے پڑھے اہل زبان سمجھتے ہیں۔ کلام کی یہی وہ ضروری اور دلچسپ صفت ہے جس کی ترقی و مزاولت سے کلام سہل ممتنع کلام کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس صفت کی جس قدر بہتات آپ کو ہمارے مجموعہ کلام میں ملیگی، شاید دوسری جگہ نہ مل سکے۔ اس لئے کہ الفاظ کی اصلی ترتیب کی پابندی نے اس کو ہمارے لئے لازم بنا دیا تھا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اب انہیں شکرِ جفا مطلوب ہے — اے وفا کے خبط اِلے کچھ اور سُن

درد لایا ہوں، دوا مطلوب ہے — مُضطر آیا ہوں، سکوں درکار ہے

حالتِ یارِ آشنا کیا ہے — کون اُس یارِ آشنا سے کہے

شکلِ بیمار دیکھتا کیا ہے — دردِ بیمار کا مداوا کر

سیکڑوں خوبیوں کے مالک ہو — ایک صاحبِ وفا نہیں، نہ سہی

آپ نے درد سُن لیا ہوتا — درد کی کچھ دوا نہیں، نہ سہی

دِل ازل سے ترا شناسا ہے — آنکھ شکل آشنا نہیں، نہ سہی

تُو ہوا اور تیری زلف ہائے رسا — میری قسمت رسا نہیں، نہ سہی

آپ کا تو پتا لگا ہی لیا — اب جو میرا پتا نہیں، نہ سہی

زلفوں والو! یہ اندھیر — دُہرے دُہرے کالے ناگ

میرا اَسرا اور تیرا در — دھن مری قسمت دھن مری بھاگ

دیکھ لی تیری تجلّی دیکھ لی — دیکھنے کو بھی کلیجا چاہیے

تیری وہ غفلت کہ پروا ہی نہیں — میری وہ حالت کہ دیکھا چاہیے

مے پی، دل کو غم سے نہ پاٹ — خوش جی۔ اور خوش جی کر کاٹ

آہ! خیالِ فرقتِ دوست — جی بھی بے کل، دل بھی اُچاٹ

جَور و جفا کی خو تو نہ ڈال — مہر و وفا کی جڑ تو نہ کاٹ

آزاد! آپ اور اِتنی دون — "ملبے ندّی تیرا پاٹ"

ندرتِ بیاں۔ یہ اچھوتے اندازِ بیان اور انوکھی، دلچسپ ترکیبوں یا ان دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں آپ کو ندرتِ بیان

کی بھی مثالیں ملیں گی۔ چند یہاں بھی درج کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔
باقی مجموعۂ ہٰذا میں ملاحظہ فرمائیے۔

چارہ سازِ زخمِ دل! درمانِ زخم اچھا کیا ٭ زخم کی سب لذّتیں مجروح درماں ہو گئیں

کیا خاک مان لوں کہ وہ نامہرباں نہ تھا ٭ اک طرزِ التفات سے کیا کچھ عیاں نہ تھا

مطربِ نغمہ کار ہو۔ ساقی بادہ بار ہو ٭ زہرہ نوا نگار ہو۔ میکدہ زا بہار ہو

دو عالم پرتوِ نقش و نگارِ جلوۂ جاناں ٭ بہارِ دو جہاں عکسِ بہارِ جلوۂ جاناں

(۴) تکرارِ الفاظ۔ کسی ایک لفظ یا چند لفظوں یا جملوں کا ایک مصرع یا ایک ہی شعر میں مکرر استعمال۔ تکرارِ الفاظ کلام کا سب سے بڑا عیب سمجھا جاتا ہے اور درحقیقت وہ ہے بھی سب سے بڑا عیب مگر اسی سب سے بڑے عیب کو خوبی خوش اسلوبی اور سلیقے سے برتا جائے تو یہی سب سے بڑا عیب کلام کا سب سے بڑا حسن بن جاتا ہے۔ تکرارِ الفاظ کو حسین و دلکش بنانے کے لئے بڑی احتیاط، اور سلیقہ کی ضرورت ہے جو ہر شاعر کو میسر نہیں آتا۔ یہ ہماری "الفاظ کی اصلی ترتیب" اور ترصیعِ جدید کی ایجاد کے بعد مخصوص خصوصیت ہے اس کا وجود اوروں کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ مگر کم۔ لیکن ہمارے مجموعۂ کلام میں یہ چیز آپ کو بہتات سے ملے گی۔ مثالیں ملاحظہ ہوں جن میں خط کشیدہ الفاظ

ترکیبیں اور جملے قابلِ غور ہیں۔

تم اور دل آزاریِ اربابِ محبت — اربابِ محبت کا یہ شیوا نہیں ہوتا

محبت میں بقا میری، محبت میں فنا میری — محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری

نظمِ ہستی بالبداہت دال ہے — نظمِ ہستی تحتِ کارِ حسنِ دوست

حسنِ عالم خود گواہِ حال ہے — حسنِ عالم مستعارِ حسنِ دوست

عالمِ نقش و نگارِ کائنات — پرتوِ نقش و نگارِ حسنِ دوست

حسنِ دنیائے بہارِ شش جہات — عکسِ دنیائے بہارِ حسنِ دوست

آرزوئے بہارِ جنت ہے — آرزوئے بہارِ جلوۂ روح

جستجوئے دیارِ وحدت ہے — جستجوئے دیارِ جلوۂ روح

خلافِ سلوکِ محبت کے خوگر! — خلافِ سلوکِ محبت کہاں تک

مسلسل ستم کی حکومت کے بانی! — مسلسل ستم کی حکومت کہاں تک

ارمانِ التفاتِ دلِ دوستاں درست — شایانِ التفاتِ دلِ دوستاں کہاں

(۵) صنعتِ ترصیع و تقابل۔ جس طرح نثر قوافی کے التزام کے ساتھ لکھی جائے تو وہ نثر مقفّیٰ کہلاتی ہے، اسی طرح جب نظم میں یہ التزام ملحوظ رکھا جاتا ہے تو وہ مرصع کہلاتی ہے۔ اور صنعتِ تقابل ہم وزن یا ہم قافیہ

مقابلے کے الفاظ استعمال کر نیسے وجود میں آتی ہے۔ یہ بھی صنعت ترصیع ہی کی اک قسم ہے۔ قاآنی کی طرح ہماری طبیعت کو اس صنعت سے خاص لگاؤ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے کلام میں جا بجا اس صنعت کی بہتات اور کثرت نظر آتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

صنعتِ ترصیع

نامِ خدا۔ جدھر گئے۔ دل میں اُتر اُتر گئے — خنجرِ آبدار ہو۔ دشنۂ تابدار ہو

رفعِ ملال چاہیئے۔ کچھ تو خیال چاہیئے — رُوحِ تنِ فگار ہو۔ راحتِ جانِ زار ہو

پھول نثار کیوں نہ ہوں۔ ٹوٹ کے ہار کیوں نہ ہوں — شاہدِ گل عذار ہو۔ غیرتِ صد بہار ہو

تم سے نظامِ دو جہاں تم سے قیامِ دو جہاں — مرجعِ ہر دیار ہو۔ مرکزِ ہر مدار ہو

گل و سرو صنوبر ہو۔ مہ و خورشید و اختر ہو — اِدھر بھی جلوہ گستر ہو۔ اُدھر بھی جلوہ گستر ہو

نگارانِ زمن صدقے، بہارانِ چمن صدقے — نگارِ حور پیکر ہو۔ بہارِ نور پیکر ہو

اب اس پردے سے کیا حاصل اُٹھا بھی دو کہ لا حاصل — تمہیں پردے کے باہر ہو تمہیں پردے کے اندر ہو

صنعتِ تقابل

وہ ترا[1] اندوزِ ازل[2] گرمِ تماشا[3] ہونا — وہ مرا[1] پہلے پہل[2] تجھ سے شناسا[3] ہونا

وہ ترا[1] پردۂ تفرید[2] سے باہر آنا[3] — وہ مرا[1] سُرمۂ[2] توحید سے بینا ہونا[3]

وہ ترا جوشِ غضب اور زیادہ بڑھنا　　وہ مرا شوقِ طلب اور دوبالا ہونا

وہ ترا میرے لئے جبرِ مجسّم بننا　　وہ مرا تیرے لئے صبر سراپا ہونا

اُدھر دل طولِ حسرت سے یہ حالِ زار شیون میں

اِدھر میں دل کی اس گت سے پریشانی میں، الجھن میں

تمھارا رنجِ فرقت ہے کہ طاری ہے مرے دل پر

تمھارا دردِ اُلفت ہے کہ ساری ہے مرے تن میں

یہ کیا آفت ہے اب تقدیر کروٹ تک نہیں لیتی

یہ کیا شامت ہے اب تاثیر آہوں میں نہ شیون میں

نزاکت ہے کہ قرباں ہے تری ترکیبِ اعضا پر

قیامت ہے کہ پنہاں ہے تری بے ساختہ پن میں

(۶) صنعتِ ترصیعِ جدید۔ جیسا کہ مجموعۂ ہذا کے صفحہ (۳) حاشیہ (۱) پر بالتشریح درج ہے، اس صنعت کے موجد ہمیں ہیں اگرچہ وہاں صراحت کردی گئی ہے مگر یہاں بھی اس کا مجملاً اظہار ضروری ہے۔ اس میں مطلع تو حسبِ رواجِ قدیم ہی ہوتا ہے لیکن باقی اشعار میں کبھی مقطع کے علاوہ اور کبھی بشمول مقطع باقی تمام دو دو شعروں کے اول مصرعے انگریزی نظم کی طرح ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف

ہوتے ہیں، اور ہر دو شعر کے بعد اول کے دونوں مصرعوں کا قافیہ بدل جاتا ہے۔ مگر ثانی مصرعوں کا نہیں بدلتا بلکہ حسبِ رواج قدیم آخر کے تمام مصرعے آخر تک مطلع ہی کے ہم قافیہ وہم ردیف چلے جاتے ہیں لیکن انگریزی نظم میں اور اس میں پھر بھی بہت بڑا فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ اس میں تو ہر دو شعر کے بعد اول کے دونوں مصرعوں کا بھی قافیہ بدل جاتا ہے اور آخر کے دونوں مصرعوں کا بھی۔ مگر اس میں ایسا نہیں ہوتا اس میں صرف اوّل مصرعوں کا قافیہ بدلتا ہے ثانی مصرعوں کا نہیں بدلتا۔ علاوہ ازیں انگریزی نظم میں نہ مطلع ہوتا ہے نہ مقطع۔ مگر اس میں اکثر لازماً یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ ہم نے اس صنعت کا غزلوں۔ قصیدوں اور ترکیب بندوں وغیرہ میں بہ کثرت استعمال کیا ہے اور بعض مقامات پر تو ترصیع قدیم اور ترصیع جدید کو مخلوط کر دیا ہے جس سے دوگونہ لطف پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال اصلی ترتیب کلام کی طرح یہ ہماری خاص چیز ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

وہ پھر میری سکونِ دل کا شیرازہ بکھر جانا
وہ پھر تیرے جنونِ شوق کا حد سے گزر جانا

وہ پھر مجھ کو ترا با طلعتِ قاتل نظر آنا
وہ پھر تیرا چھری لے کر مری دل میں اُتر جانا

وہ پھر تیرا کٹاری باندھ کر سینے میں در آنا
وہ پھر تیرا سناں بن کر کلیجے سے گزر جانا

وہ پھر میرا تری پہلی نظر میں تلملا اُٹھنا ۔۔۔ وہ پھر تیری نظر کا گھاؤ دل سے تا جگر جانا
وہ پھر میرے دلِ مظلوم سے شورِ بکا اُٹھنا ۔۔۔ وہ پھر تیرا مجھے اُلٹی چھری سے ذبح کر جانا

قدر قیمت فصلِ طیّارِ شباب ۔۔۔ حسن و صحت نقدِ دستارِ شباب
عزم و ہمّت خادمِ کارِ شباب ۔۔۔ تاب و طاقت کفش بردارِ شباب

عالمِ حسنِ حسینانِ جہاں ۔۔۔ پرتوِ دنیائے انوارِ شباب
جلوۂ روئے سبینِ مہ وشاں ۔۔۔ عکسِ روئے مہرِ آثارِ شباب

(۷) شعر میں اصطلاحاتِ علمیہ اور بعض مشہور قصّوں یا نظریوں کا تلمیحاً استعمال ۔ اس کی تعریف کی ضرورت نہیں ۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

پرستش کے قابل ہو، تحقیق ہے ۔۔۔ "تصوّر"[1] کے ہمراہ "تصدیق" ہے
وہ مجھ سے قریب اور میں اُس سے دور ۔۔۔ مری "جمع"[2] بھی رشکِ "تفریق" ہے

ترے بے خبر کو یہ کیا کم خبر ہے ۔۔۔ کہ تو "مبتدا"[3] اور عالم "خبر" ہے
وہ ہر "مذکور"[4] ہے تو کیا ۔ کہ ہنوز ۔۔۔ ابتدا انتہا "مقدّر" ہے

---

[1] "تصور" اور "تصدیق" علمِ منطق کی اصطلاحیں ہیں = [2] "جمع" اور "تفریق" علمِ حساب کی اصطلاحیں ہیں = [3] "مبتدا" اور "خبر" علمِ نحو کی اصطلاحیں ہیں [4] مذکور و مقدّر بھی علمِ نحو ہی کی اصطلاحات ہیں ۔

ہمیشہ غم نصیب آزاد نے تیری خوشی چاہی | ہمیشہ راحتِ دُنیا کو ممنوعہ شجر جانا
ستم ہے، یوں سکونِ دل کی مٹنے کا ستم دیکھیں | تمہارے درد کا "ردِّ عمل" ہو اور ہم دیکھیں
✓ تحقیق ہے کُل جہاں کا مصدر تو ہے | تصدیق ہے، تو ہے اور مقرر تو ہی
اے میرے "تصوّر" کے حقیقی معروض | ہر چیز "عرض" ہے اور "جوہر" تو ہی
تم سے نظامِ دو جہاں تم سے قیامِ دو جہاں | مرجعِ ہر دیار ہو۔ مرکزِ ہر "مدار" ہو

ہمارے مجموعۂ کلام میں مذکورۂ بالا خصوصیات کے علاوہ بعض اور بھی خصوصیات ملیں گی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور سے اُن کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

(۱) ہم نے حروفِ "کا" اور "تھا" کے علاوہ کہیں دبتا ہوا الف نظم نہیں کیا۔ صرف ایک رباعی کے اس مصرعے میں "سجدہ ترا زنّار ہے کعبہ ترا دیر" لفظ "ترا" کا الف دونوں جگہ دبا کر نظم کرنا پڑا ہے۔ مگر بوجہ مجبوری ترجمہ دیکھو صفحہ (۲۳۷) سطر آخر۔

(۲) "میں" ضمیر واحد متکلم اور "تو" ضمیر واحد مخاطب کو بھی کبھی بلا اشباع نظم نہیں کیا۔

(۳) (و-ن) - (ا-ن) اور (ی-ن) علامت ہائے جمع بھی کہیں دبا کے موزوں نہیں کی گئیں، اور انھیں پر کیا منحصر ہے۔ ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ کہیں اشعار میں دبتے ہوئے الفاظ نہ آنے پائیں۔ اور اگر آئیں تو اس طرح آئیں کہ ذوق پر گراں نہ گزریں۔

(۴) ہمیں رشک ورقابت کے مضامین سے چنداں لگاؤ نہیں رہا۔ اس لئے ہمارے مجموعہ بھر میں مضمونِ رشک کے حامل صرف دو شعر ملیں گے، اور وہ بھی معمولی اور اوسط درجہ کے۔

(۵) ہم نے آج تک کوئی ایسا شعر نہیں کہا جس میں کوئی شخص مرنے کے بعد زندوں کی طرح گفتگو کرتے دکھایا گیا ہو، اور نہ کوئی ایسا شعر کہ جس کو قبل از مرگ اور قبل از آمدِ محشر میدانِ محشر قائم کر کے باہم سوال وجواب کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔

(۶) ہم نے کبھی خلافِ فطرت شعر کہنے کی کوشش نہیں کی؛ اور نہ کبھی کسی ایسے خیال کو نظم کیا جس میں تھوڑی بہت صداقت نہ پائی جاتی ہو۔

(۷) اگر ہمارے زمانہ جاہلیت سے قطع نظر کر لی جائے تو ہم نے کبھی پست، سوقیانہ اور شرمناک جذبات و خیالات کو جامۂ شعر پہنانے کی

کوشش نہیں کی۔ ہمارے یہاں اکثر شوخ اشعار ملیں گے، مگر پستی و شرمناکی سے مبرّا۔

(۸) ہم نے ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ غزل کو مذہبی، قومی، سیاسی اور اخلاقی خیالات کی آمیزش سے پاک رکھا جائے، مگر پھر بھی کبھی کبھی بعض ایسے اشعار قلم سے ٹپک پڑے ہیں، مگر بہت کم، یہ اشعار آپ کو کہیں کہیں بعض غزلوں کے آخر میں مقطع سے پہلے نظر آئیں گے۔

(۹) جدید تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود مغربی شاعری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر نہ اتنی کہ ہماری مشرقی خصوصیات دب کے رہ جائیں۔

(۱۰) ہم نے ہمیشہ زبان و محاوراتِ دھلی کی پابندی کی ہے، لیکن بعض مواقع پر اس سے انحراف بھی کیا ہے، مگر بہت کم۔

(۱۱) ہماری شاعری تمام تر داخلی شاعری ہے، ہم نے خارجی شاعری کی طرف کبھی رُخ نہیں کیا اور اِس کام کو دوسروں کے لئے جو اس کے ہم سے زیادہ اہل ہیں چھوڑ دیا ہے۔

(۱۲) مجموعۂ ہٰذا کی حد تک ہماری شاعری زیادہ تر عاشقانہ، رندانہ

متصوفانہ، اور کسی قدر فلسفیانہ ہے، ہمارا دوسرا مجموعہ جو اس مجموعہ کے بعد "معارفِ جلیل" کے نام سے جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔ اُس کی شاعری اس مجموعے کی شاعری کے برخلاف مذہبی، قومی، سیاسی اور اخلاقی و اصلاحی وغیرہ ہوگی۔

اِصلاحات وہدایات

ہماری آرزو تھی کہ ہم اُن تمام اِصلاحات وہدایات کو جو ہمیں اپنے ہر دو اساتذۂ فن سے مسلسل (۲۴) یا (۲۵) سال تک وقتاً فوقتاً ملتی رہی تھیں، یہاں درج کرتے تاکہ طالبانِ فن اُن سے فائدہ اٹھاتے، اور تنقیدِ شعر و ادب میں مدد ملتی، مگر افسوس ہے کہ ہم اُس گراں بہا سرمائے کو کچھ اپنی نالائقی اور کچھ آفاتِ ارضی و سماوی کی بدولت محفوظ رکھنے میں کامیاب نہ رہ سکے، مجبوراً وہ چند اِصلاحات وہدایات جو آج تک حافظے میں محفوظ چلی آرہی ہیں یا وہ جو دماغ پر زور ڈالنے سے یاد آسکی ہیں انھیں کو غنیمت سمجھ کر حوالۂ قلم کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اصلاحاتِ حضرت مولانا بیدلؒ

(۱) ہمارا شعر
زلفوں میں دل ہے اور ہے دل میں خیالِ زلف
ہے پیچ و تاب دل کو تو دل پیچ و تاب میں

اصلاح
زلفوں میں تھا دل ہے اور ہے دل میں خیالِ زلف
اللہ! پھنس گیا ہوں یہ کس پیچ و تاب میں

(۲) ہمارا شعر
نئے گُل کھلیں شاید اس انجمن میں
اگر رنگِ یارانِ محفل یہی ہے،

اصلاح
نئے گُل کھلیں گے تری انجمن میں
اگر رنگِ یارانِ محفل یہی ہے

(۳) ہمارا شعر
عجب اک کچھ حالتِ دل ہے، کوئی غم، کچھ مصیبت ہو
جہاں دیکھو اسی کمبخت کو سینہ سپر دیکھو

اصلاح
عجب حالت ہے دل کی، کوئی غم ہو، کوئی آفت ہو
جہاں دیکھو، اسی کمبخت کو سینہ سپر دیکھو

لہ یہ دورِ اوّل کا شعر ہے جب ہماری طبیعت پر ذوق علیہ الرحمۃ کو خدائے سخن سمجھنے کی وجہ سے لکھنوی رنگ چھایا ہوا تھا۔ افسوس کہ یہ شعر پہلے یاد نہ آیا ورنہ ہم اسی بھی اُسی دور کے اشعار کے ساتھ درج کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ اب اس شعر کو ملا کر اُس دور کی چار میں شعر سمجھنے چاہئیں۔ آزاد۔ لہ دیکھو تفصیل صفحہ (۱۲۰) حاشیہ (۱) پر۔

(۴) ہمارا شعر
اللہ اپنا عشقِ عطار دا عطا کرے
اب مجھ کو آرزوئے وصالِ بتاں نہیں

اصلاح
اللہ اپنا عشق عطار دا عطا کرے
اب میرے دل کو خواہشِ وصلِ بتاں نہیں

(۵) ہمارا شعر۔ اس ندامت سے فائدہ کیا ہے + جلد کر کچھ تلافیٔ مافات +
اصلاح۔ ان پشیمانیوں سے کیا حاصل + بدستور

(۶) ہمارا شعر
تیری آنکھوں میں کبھی پاسِ مروّت نہ رہا
مثل طوطے کے تجھے آنکھ بدلتے دیکھا

اصلاح
تیری آنکھوں میں کبھی پاسِ مروّت نہ رہا
تجھ کو طوطے کی طرح آنکھ بدلتے دیکھا

(۷) ہمارا شعر
جب کبھی تڑپے گرفتار آپ کے
دُونے دُونے اُلجھے حلقے دام کے

اصلاح
آہ! جب تڑپے ذرا تیرے اسیر
اور دُونے اُلجھے حلقے دام کے

(۸) ہمارا شعر
ہوا جب بدرِ کامل بڑھ کے اسکا چاند سا چہرہ
تو بولا حُسن روز افزوں کہ صورت اس کو کہتے ہیں

اصلاح
ہوا جب بدرِ کامل بڑھ کے اُس کا چاند سا چہرہ
تو بولا حُسن روز افزوں کہ طلعت اس کو کہتے ہیں

ہدایات حضرت مولانا بیدلؔ علیہ الرحمۃ

(۱) لکھنوی رنگِ تغزّل چھوڑ کر دہلوی رنگِ تغزّل اختیار کرو کہ یہ رنگِ تغزّل صحیح رنگِ تغزّل ہے۔

(۲) میرؔ غالبؔ اور مومنؔ کے دیوانوں کا خصوصاً اور دیگر اساتذہ کے کلام کا عموماً بہ نظرِ غائر مطالعہ کرو، تاکہ مختلف اسالیبِ بیان سے واقف ہو سکو۔

(۳) پست اور شرمناک مضامین سے بچو۔

(۴) سوقیانہ الفاظ و محاورات سے اجتناب کرو۔

(۵) ثقیل الفاظ اور ثقیل تراکیب سے کلام کو گرانبار نہ ہونے دو۔ [۱]

(۶) عروض سے اتنی واقفیت بہم پہنچا لو کہ مروّجہ اوزان و بحور سے

[۱] حاشیہ صفحہ ۶۴ پر۔

واقف ہو کر شعر کی بے تکلّف تقطیع کر سکو، اور معائب و محاسنِ شعر کو سمجھ سکو۔

(۷) جب کوئی شعر موزوں کرو تو ہمیشہ اُس کی نثر بنا کر یہ دیکھ لیا کرو کہ ایسے موقع پر اہلِ زبان اسی طرح بولتے اور لکھتے ہیں یا نہیں، اگر اسی طرح بولتے اور لکھتے ہیں تو سمجھو کہ شعر بہ لحاظِ زبان صحیح ہے ورنہ غلط۔

(۸) اگر کسی شعر میں کوئی کمزوری یا غلطی پاؤ تو اوّل تو کوشش کرو کہ وہ درست ہو جائے، اگر درست نہ ہو سکے تو اس کو علیحدہ کرنے میں تامّل نہ کرو۔

اصلاحاتِ علامہ حاؔلی علیہ الرحمۃ

(۱) ہمارا شعر { بہ ظاہر مادّے کی بحث موزُوں بھی ہے دلکش بھی
مگر جب غور سے دیکھو، نرا جھانسا، کُھلا دھوکا

(حاشیہ ۱ صفحہ (۶۳) ہم نے زمانہ تعلیم میں تھوڑا بہت عروض پڑھا ضرور تھا مگر جب شعر کہنا شروع کیا ہے تو اُس پر حاوی نہ تھے۔ حضرت بیدؔل علیہ الرحمۃ کا یہ اشارہ ہماری اسی خامی کی طرف تھا۔ آزاد انصاری۔

اصلاح
یہ ظاہر مادے کی بحث موزوں بھی ہے دلکش بھی
مگر جب غور سے دیکھو، نرا چکما، کھلا دھوکا

(۲) ہمارا شعر
ترے برحق وجودِ پاک کا ابطال ناممکن
نہ یہ سائنس کی قدرت، نہ طبعیات کا یارا

اصلاح
ترے برحق وجودِ پاک کا ابطال ناممکن
یہ منقولات کی طاقت نہ معقولات کا یارا

(۳) ہمارا شعر
تشویشِ جزا کب تک، تشویش سے کیا ہوگا
کچھ آج ہوا ہوگا، کچھ روزِ جزا ہوگا

اصلاح
امیدِ جزا کب تک امید سے کیا ہوگا
کچھ آج ہوا ہوگا، کچھ روزِ جزا ہوگا

(۴) ہمارا شعر
نرالی آن پیدا کر، انوکھی شان پیدا کر
جگر مجروح پیدا کر، نظر حیران پیدا کر

اصلاح
نرالی آن پیدا کر انوکھی شان پیدا کر
جگر زخمی، دل آشفتہ، نظر حیران پیدا کر

واقف ہوکر شعر کی بے تکلّف تقطیع کر سکو، اور معائب و محاسنِ شعر کو سمجھ سکو۔

(۷) جب کوئی شعر موزوں کرو تو ہمیشہ اُس کی نثر بنا کر یہ دیکھ لیا کرو کہ ایسے موقع پر اہلِ زبان اسی طرح بولتے اور لکھتے ہیں یا نہیں، اگر اسی طرح بولتے اور لکھتے ہیں تو سمجھو کہ شعر بہ لحاظِ زبان صحیح ہے ورنہ غلط۔

(۸) اگر کسی شعر میں کوئی کمزوری یا غلطی پاؤ تو اوّل تو کوشش کرو کہ وہ درست ہو جائے، اگر درست نہ ہو سکے تو اس کو علیحدہ کرنے میں تامّل نہ کرو۔

اِصلاحاتِ علامہ حاؔلی علیہ الرحمتہ

(۱) ہمارا شعر
- بہ ظاہر مادّے کی بحث موزُوں بھی ہے دلکش بھی
- مگر جب غور سے دیکھو، نرا جھانسا، کُھلا ڈھونگا

(حاشیہ ۱ صفحہ ۶۳) ہم نے زمانہ تعلیم میں تھوڑا بہت عروض پڑھا ضرور تھا مگر جب شعر کہنا شروع کیا ہے تو اُس پر حاوی نہ تھے۔ حضرت بیدل علیہ الرحمتہ کا یہ اشارہ ہماری اسی خامی کی طرف تھا۔ آزاد انصاری۔

اِصلاح:
یہ ظاہر مادے کی بحث موزوں بھی ہے دلکش بھی
مگر جب غور سے دیکھو، نرا چکما، کھُلا دھوکا

(۲) ہمارا شعر:
ترے برحق وجودِ پاک کا اُبطال ناممکن
نہ یہ سائنس کی قدرت، نہ طبعیات کا یارا

اِصلاح:
ترے برحق وجودِ پاک کا اُبطال ناممکن
نہ منقُولات کی طاقت نہ معقولات کا یارا

(۳) ہمارا شعر:
تشویشِ جزا کب تک، تشویش سے کیا ہوگا
کچھ آج ہوا ہوگا، کچھ روزِ جزا ہوگا

اِصلاح:
اُمید جزا کب تک امید سے کیا ہوگا
کچھ آج ہوا ہوگا، کچھ روزِ جزا ہوگا

(۴) ہمارا شعر:
نرالی آن پیدا کر، انوکھی شان پیدا کر
جگر مجروح پیدا کر، نظر حیران پیدا کر

اصلاح:
نرالی آن پیدا کر انوکھی شان پیدا کر
جگر زخمی، دل آشفتہ، نظر حیران پیدا کر

(۵) ہمارا شعر
وہ جبر کئے جائیں، ہم صبر کئے جائیں
اللہ تو منصف ہے، اللہ جزا دے گا

اصلاح
تم جبر کئے جاؤ، ہم صبر کئے جائیں
اللہ تو منصف ہے، اللہ جزا دے گا

(۶) ہمارا شعر
آزاد! شکایاتِ فلک سب بے سُود
خاموش ہو، خاموش ہو، یہ ناممکن

اصلاح
آزاد! شکایاتِ مقدر کب تک
خاموش ہو، خاموش ہو، یہ ناممکن

(۷) ہمارا شعر
ممکن ہو تو اب رخصتِ فریاد عطا کر
فریاد! کہ اب ضبطِ تمنّا نہیں ہوتا

اِصلاح
پھر رخصتِ اظہارِ غمِ شوق عطا کر
فریاد کہ پھر ضبطِ تمنّا نہیں ہوتا

(۸) ہمارا شعر - کبھی شرطِ منصف مزاجی بجا لا ❊ کبھی حق رسائی آزاد فرما

اصلاح - بدستور ❊ کبھی حق رسیہائی آزاد فرما

(۹) ہمارا شعر ہم[1] اور اُمیدِ حصول چارٹر ❊ آئیے، مل جُل کے خوشیاں کیجئے

[1] (حاشیہ صفحہ ۶۷ پر)

اصلاح — ہم اور اپنے درس کا خود انتظام ✦ آئیے مل جل کے خوشیاں کیجیے

(۱۰) ہمارا شعر — ہم اور انعاماتِ شاہِ دادگر ✦ شکرِ احسانات یزداں کیجیے

اصلاح — ہم اور اپنے ڈھب کا تعلیمی نظام ✦ بدستور

(۱۱) ہمارا شعر — تا قیامِ گردشِ شمس و قمر ✦ قوم کو مرہونِ منت کر لیا

اصلاح — قوم کی خاطر مصائب جھیل کر ✦ بدستور

ہم بے کسی کیا کریں کیا بتائیں

(۱۲) ہمارا شعر — اکیلے ہیں کب تک شکستیں نہ کھائیں

مگر واہ! اس پر بھی کیا دل جگر ہیں

اصلاح

اسی طرح میداں میں سینہ سپر ہیں

ہدایاتِ حضرت علامہ حالی مع دیگر مفید معلومات

(۱) "شعر کی بنیاد، زبان، مضمون، اور کسی اچھوتے انداز بیان پر رکھو

(حاشیہ نمبرا - صفحہ (۶۶) سلہ یہ تینوں شعر اک قومی نظم الموسوم بہ مسلم یونیورسٹی کے جو ۱۹۱۱ء میں اس وقت لکھی گئی تھی - جب علیگڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کے لئے چندہ جمع کیا جا رہا تھا اور جس کے لئے ہز ہائینس سر آغا خاں نے بہ نفسِ نفیس تکلیف فرما کر تمام ہندوستان کا اسی غرض سے دورہ کیا تھا - آزاد انصاری -

یہ شعر نظم جنگِ بلقان کے ایک بند کی ٹیپ میں واقع ہوا تھا سن کر (باقی حاشیہ صفحہ ۶۸ پر)

نہ کہ صنائع و بدائع پر، البتہ صنعتِ ترصیع اِک دلچسپ صنعت ہے اور تمہاری طبیعت کو اُس سے لگاؤ بھی ہے، اس لئے اُس کے استعمال کا تم کو اختیار دیا جاتا ہے۔ مگر احتیاط کے ساتھ۔"

(۲) "ہمیشہ شعر میں کوئی نئی بات یا لطف پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ متقدمین کے نقّال نہ بنو۔"

(۳) "نہ زبان کے لئے مضمون کا خون کرو اور نہ مضمون کے لئے زبان کا۔ بلکہ ان دونوں کے مناسب امتزاج سے شعر طیار کرو۔"

(۴) "جب کوئی شعر لکھ چکو تو بار بار اس پر تنقیدی نظر ڈالو۔ اگر اُسے سُست پاؤ، یا اُس میں کوئی نقص نظر آئے تو حتّی الامکان اُسے چُست اور درست کرنے کی کوشش کرو۔ اگر نہ ہوسکے تو بہتر یہی ہے کہ اُسے فوراً قلمزن کر دو۔"

(۵) "کائنات کی ہر چیز کو گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی عادت ڈالو۔"

(بقیہ حاشیہ صـ۶۷) سُن کر فرمایا کہ اس کو قلمزن کر دو، کیونکہ اول یہ تو موقع کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ دوسرے اس شعر کے مضمون سے قوم ترک کی جو اک مشہور بہادر قوم ہے توہین مترشح ہوتی ہے۔ پھر کچھ دیر تامل کر کے فرمایا کہ اس جگہ یہ شعر مناسب ہوگا۔

واہ! اس پر بھی کیا دل جگر ہیں الخ۔ ہماری کل شاعری میں استاد علیہ الرحمۃ کا عطا کردہ صرف ... (آزاد انصاری)

تاکہ مضامینِ نو کی تخلیق میں مدد ملے۔"

(۶) بعض اوقات ہم اپنے خیالات کو مناسب الفاظ کا جامہ پہنانے میں کامیاب نہیں ہوتے تھے، اس لئے بعض اشعار اُلجھے ہوئے رہ جاتے تھے ایک روز چند ایسے اشعار سن کر ارشاد فرمایا کہ" اگرچہ تمہاری قوتِ ممیزہ تمہاری قوتِ متخیلہ سے بے حد طاقتور ہے مگر پھر بھی تم بعض مطالب کو سلجھا کر بیان کرنے میں ناکام رہتے ہو۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھو کہ تمہارا متخیلہ تمہارے ممیزہ پر غالب نہ آنے پائے۔"

(۷) ایک دن ارشاد فرمایا کہ" ہمارے اُستاد اور تمہارے دادا اُستاد کا قول ہے۔ توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے۔ سنو، اس عالم میں نہ بلندی کی انتہا ہے نہ پستی کی، جو لوگ پستی پر قناعت کر لیتے ہیں ان کو کبھی بلندی کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ یہی حال شعر کا ہے، جو شعرا پست الفاظ اور پست مضامین پر قانع ہو جاتے ہیں وہ شاعری میں کبھی اوجِ کمال تک نہیں پہنچتے، اگر تم اس فن میں منتہائے کمال تک پہونچنا چاہتے ہو تو اپنی نگاہ، اپنے خیال اور اپنی ہمت کو بلند رکھو، یاد رکھو جس قدر تمہاری نظر اور تمہاری ہمت بلند ہوگی

اُسی نسبت سے تمہاری شاعری بھی بلند ہوگی۔

(۸) ہم ابتدائً جب کوئی غزل یا نظم استاد کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا کرتے تھے تو بعض سُست شعر یا وہ مصرعے بھی جن پر ہم مصرع اولیٰ یا مصرع ثانی لگانے میں ناکام رہتے تھے اس امید پر پیش کر دیا کرتے تھے کہ اُستاد خود درست کر دیں گے یا مصرعے لگا دیں گے ایک روز ہماری اس بیہودہ عادت پر تنبیہاً ارشاد فرمایا کہ میاں آزاد! نہ دنیا میں مطالب کی کمی ہے اور نہ زبان میں الفاظ کی، اگر کمی ہے تو صرف محنت و کاوش دماغ کی۔ اگر محنت و کوشش سے کام لو تو فن شعر کی کوئی مشکل ایسی نہیں ہے جسے تم خود آسان نہ کر سکو۔ ہمارے سامنے کبھی کوئی ایسی چیز نہ لاؤ جس سے بعد فکر و کوشش تم خود مطمئن نہ ہو چکے ہو خود اپنے اشعار پر بار بار نظر ڈالو، خود ان کو پوری سعی و محنت سے درست کرو، اور جب درست کر چکو تو ہم کو دکھاؤ۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہاری ترقی رُک جائے گی، اور تم ہمیشہ کسی نہ کسی اُستاد کے محتاج رہو گے۔"

(۹) ایک دن ہم نے اپنی ایک نو تصنیف غزل جس کا پہلا مطلع یہ ہے

نہ یہ[1] سامان پیدا کر، نہ وہ سامان پیدا کر
بہ استقلال یکسو ہو کے اطمینان پیدا کر

بغرضِ اصلاح سُنانی شروع کی، یہ مطلع سُن کر فرمایا "ٹھیک ہے۔ صاد بنا دو۔"

دوسرے[2] مطلع کا مصرعِ ثانی ناپسند فرما کر بدل دیا، اور فرمایا کہ "اب تمھارا یہ مطلع لاجواب مطلع ہو گیا ہے۔ اس پر تین صاد بناؤ۔" دونوں مطلعوں پر اصلاح ہو جانے کے بعد ہم نے یہ شعر پڑھا۔

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی
ذرا آہستہ آہستہ اُدھر رجحان پیدا کر

تو کئی مرتبہ "بہت خوب" "بہت خوب" کہہ کر فرمایا کہ "یہ شعر بھی تین صاد کے قابل ہے اس پر بھی تین صاد بناؤ۔ اِس شعر کے بعد والے باقی تین[3] شعر سُن کر دو دو صاد بنانے کا حکم دیا، اور تین شعر جو غالباً کمزور تھے قلم زن کروا دئے، مگر جب یہ مقطع سُنا۔

---

[1] اس پوری غزل کی اصلاح کا مختصر حال بیاں اس لئے درج کیا گیا ہے تاکہ حضرت استاذی علیہ الرحمۃ کا طریقہ اصلاح روشنی میں آجائے۔ دیکھو پوری غزل صفحہ (۶۱) پر۔
[2] دیکھو اصلاحات علامہ حالی علیہ الرحمۃ [3] دیکھو پوری غزل صفحہ (۶۱) پر۔

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا

تو جا، اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

تو بے اختیار تڑپ اُٹھے، اور کئی مرتبہ بہت خوب، مرحبا، جزاک اللہ کی تکرار کے بعد فرمایا کہ "پھر پڑھو" ہم نے پھر پڑھا اور وہ پھر تڑپ اٹھے اور دیر تک جھومتے اور مزے لیتے رہے۔ کچھ دیر بعد پھر فرمایا کہ "بھئی! ایک بار وہ شعر پھر سُنا دو"۔ ہم نے پھر سنایا، اب ان کو یہ مقطع یاد ہو گیا تھا۔ بہت دیر تک خود پڑھ پڑھ کے جھومتے اور مزے لینے کے بعد غالبؔ علیہ الرحمۃ کا یہ مشہور مقطع پڑھا۔

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ — تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

اور پڑھ کر گویا ہوئے کہ حقیقت یہ ہے کہ تم کو یہ مقطع حضرت غالب علیہ الرحمۃ کے اس مشہور و لاجواب مقطع سے بھی کہیں بہتر و بلند تر نصیب ہوا ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اُسی رنگ اور اُسی انداز کا۔ اگر آج غالب مرحوم زندہ ہوتے تو وہ تم پر فخر کرتے۔ اور کیا تعجب کہ جس طرح حکیم مومن خان مرحوم کا یہ شعر سُن کر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

فرمایا تھا کہ "اگر مومن خاں مجھے اپنا یہ شعر دیدیں تو میں اس کے عوض میں اپنا سارا دیوان نذر کرنے کو طیار ہوں"۔ اسی طرح تمہارا یہ عجیب وغریب مقطع سن کر وہ تمہیں بھی اپنا پورا دیوان دے ڈالنے پر آمادہ ہو جاتے۔ مگر میری رائے ہے کہ اگرچہ حکیم مومن خاں مرحوم کا مذکورہ شعر بھی بے مثل ونادر شعر ہے مگر پھر بھی اتنا قیمتی نہیں کہ کوئی اپنا پورا دیوان اُس کے معاوضے میں دے کر بعد میں رنج و افسوس محسوس نہ کرے، لیکن تمہارا مقطع بالیقین اتنا گرانبہا ہے کہ اگر کوئی اُس کو اپنا پورا دیوان دے کر خرید لے تو وہ ہرگز خسارہ میں نہیں رہ سکتا"۔ ہم اُٹھے اور استاد علیہ الرحمتہ کی اس غیر معمولی داد پر جھک جھک کے پے در پے کئی آداب بجالائے، اور عرض کیا کہ یہ سب جناب کی توجہاتِ بے پایاں کا صدقہ ہے۔ ورنہ "من آنم کہ من دانم"۔

ہم اس واقعے کے بعد تقریباً اور تین روز تک پانی پت میں مقیم رہے ان تینوں دنوں میں حضرت اُستاذی علیہ الرحمتہ کا یہ حال اور یہ عالم رہا کہ وہ ہر گھنٹے آدھ گھنٹے کے بعد فرماتے کہ "ہاں میاں آزاد!

وہ اپنا مقطع تو پھر ذرا اُسنا دو"۔ ہم سُناتے، اور وہ سُن کر جھُومتے اور مزے لیتے۔ اور ہمیں دادیں دے کر ہمارا دل بڑھاتے، ہمارا خیال ہے کہ انھوں نے اس تین دن کے عرصے میں ہمارا مذکورۂ بالا مقطع پچاس ساٹھ بار سے ہرگز کم نہ سُنا ہوگا۔ مختصر یہ ہے کہ مسلسل تین روز تک اُن کے تقاضا کر کے سُننے اور ہمارے سُنانے کا سلسلہ یونہیں جاری رہا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے رخصت ہوتے وقت ایک مرتبہ پھر سُنا اور دعا دے کر رخصت فرمایا۔ واقعی ہم کو اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہیئے کہ ہمیں اپنی طالبانہ زندگی میں ایسے ایسے ماہر فن اتنے نکتہ رس اور اس قدر مہربان و قدرداں اُستاد میسر آئے اور ہمارے شوقِ شاعری کو اُن کے خرمنِ کمال سے خوشہ چینی کا موقع ملا۔ مگر آہ! اب حضرت اُستادی علیہ الرحمتہ کہاں، اور ہم کہاں، اب کون ہمارے شکوک رفع کرے، کون ہمیں اصلاح دے، کہاں جائیں کس کو دکھائیں، کس کو سُنائیں اور کس کو سُنا کر داد پائیں۔

(۱۰) ہم نے بطورِ خود کبھی یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ ہم شعر میں کلام کی اصلی ترتیب کے پابند ہیں۔ ایک روز اثنائے اصلاح میں حضرت اُستادی

علیہ الرحمتہ کو اس کا علم ہوا تو اول تو وہ حیرت میں رہ گئے۔ پھر وہ نظم جو اس وقت زیرِ اصلاح تھی ہمارے ہاتھ سے لے لی۔ اس پر کچھ دیر غائر نظر ڈالی، اور فرمایا کہ " واقعہ یہ ہے کہ تمھارا کام سخت دشوار کام ہے۔ تعجب ہے کہ تم اس کی مشکلات سے کیونکر عہدہ برآ ہوتے ہوئے" پھر پوچھا کہ " آخر تم نے اس قدر سخت محنت طلب پابندی کیوں اور کیا سمجھ کر اختیار کی"۔ اس کے جواب میں ہم نے وہ واقعہ تمام و کمال عرض کر دیا جو اس پابندی کو اختیار کرنے کا باعث ہوا تھا اور جس کا ہم اس سے پہلے "اپنی شاعرانہ خصوصیات" کے ضمن میں مفصل ذکر کر آئے ہیں۔ اس واقعے کو سن کر فرمایا کہ اگرچہ تمھاری یہ سخت پابندی آسانی کے ساتھ اظہارِ خیال کو مانع ہے، لیکن اگر تم اس کی دشواریوں پر اسی طرح غالب آتے رہے اور دامنِ استقلال ہاتھ سے نہ چھوڑا تو یہ تمھارا ایسا عجیب و غریب اور قابلِ قدر کارنامہ ہوگا کہ اردو زبان اور اردو شاعری ہمیشہ تم پر ناز کرے گی، جہاں تک میں غور کر سکا ہوں مجھ کو تو کلام کی اصلی ترتیب صنفِ نظم میں ناممکن العمل نظر آتی ہے۔ اور میری معلومات کی حد تک کسی ملک اور کسی زبان میں کوئی ایسا قادر الکلام شاعر نہیں گذرا

U 614

جس نے اِسے ممکن العمل بنا کے دکھایا ہو، در اصل یہ تمھاری شاعری کا معجزہ ہے، اور سخت حیرت میں ڈالنے والا معجزہ۔"

(۱۱) حضرت اُستاذی علیہ الرحمتہ کو یہ تو معلوم تھا کہ ہماری طبیعت کو صنعتِ ترصیع سے لگاؤ ہے۔ کیونکہ اکثر ہمارے ایسے اشعار اُن کی نظر سے گزرتے رہتے تھے، مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ہم اک جدید صنعت کے موجد و مخترع بھی ہیں۔ ایک روز جب اپنی ایک نئی نظم الموسوم بہ "درسِ حمیت" جو جدید صنعتِ ترصیع کی پابندی ملحوظ رکھ کر لکھی گئی تھی بہ غرضِ اصلاح اُن کی خدمت میں پیش کی تو اُن کو ہماری یہ نئی ایجاد، اور اُس کی یہ نئی پابندی دیکھ کر اور زیادہ حیرت ہوئی، پہلے تو دیر تک اُس نظم کو بہ غور ملاحظہ فرماتے رہے۔ پھر ہماری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ تمھاری طبیعت بے حد دشوار پسند واقع ہوئی ہے، مگر تعجب تو یہ ہے کہ تم ایسی سخت اور ناقابلِ عمل پابندیوں کے باوجود اس قدر صاف و سلیس اور اس قدر معنی خیز اشعار موزوں کرنے میں کیونکر کامیاب ہوتے ہو۔ دوسرے کے لئے تو ان ناقابلِ برداشت قیود کے ساتھ ایک شعر کہنا بھی محال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

تمھاری شاعری محالات کو ممکن کر دکھانے والی شاعری ہے۔" پھر فرمایا کہ "اچھّا یہ تو بتاؤ کہ تمھیں اس صنعت کی سوجھی کس طرح؟" ہم نے عرض کیا کہ یہ بھی جناب ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے، فرمایا "کس طرح" ہم نے عرض کیا اِس طرح کہ جب خوش قسمتی سے جناب کا دیوان ہمارے ہاتھ آیا ہے تو دورانِ مطالعہ میں جناب کے قصیدۂ نعتیہ اور مرثیۂ غالب کے یہ اشعار ہماری نظر سے گذرے۔

اشعار قصیدۂ نعتیہ

وہ شہنشاہ، اُمّتی جس کا　　یاں گنہگار اور وہاں مغفور
وہ خداوند، خادمتی جس کا　　یاں سبکسار اور وہاں ماجور

لبِ شیریں کلام سے اُس کے　　دوست بھی شاد، غیر بھی مسرور
اثرِ فیضِ عام سے اُس کے　　کعبہ آباد، میکدہ معمور

اشعار مرثیہ غالبؔ رح

خندۂ گل سے بے بقا تر ہے　　شان ہو جس میں دلربائی کی
جنسِ کاسد سے ناروا تر ہے　　خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی　　ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رمّاں میں
حصر تھی اِک بیاں میں رنگینی　　کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں

ہم کو جناب کے ان اشعار کا انداز بیاں جو جناب کے ہاں یہ صنعت لئے ہوئے اتّفاقاً پیدا ہو گیا ہو گا، بے حد پسند آیا، ہم نے اُس کی پیروی کرنی شروع کر دی، یہاں تک کہ اپنی سمجھ کے موافق اُس کو ترقی دیکر اپنی طرزِ خاص بنا لیا۔ اب اربابِ ادب کو اختیار ہے کہ اِسے پسند کریں یا ناپسند۔ قبول فرمائیں یا رد کر دیں۔ فرمایا کہ نہیں تمھاری یہ جدید طرز ایک نہ ایک روز ضرور مقبولِ عام ہو کے رہے گی۔ کیونکہ یہ اُردو شاعری میں اک نہایت دلچسپ اور نادر اضافہ ہے، خدا تم کو تادیر زندہ رکھے

کہ تم اسے تکمیل تک پہنچا سکو۔"

ہمارا خیال ہے کہ حضرت استاذی علیہ الرحمتہ کی اس دعا کا یہ حصّہ کہ "خدا تم کو تا دیر زندہ رکھے۔" بالیقین قبول کر لیا گیا ہے، کیونکہ بفضلہ ہم اب تک زندہ ہیں۔ رہا دوسرا حصّہ "یہاں تک زندہ رہو کہ اسے تکمیل تک پہونچا سکو۔" سو اس کی نسبت آئندہ ارباب ملک فیصلہ کریں گے ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم اس بارے میں اُن کی آرزو اور دعا کی مطابق کامیاب ہو سکے ہیں یا نہیں۔

(۱۲) ایک دن ہم نے عرض کیا کہ "نہ تھا" اور "نہیں تھا" میں کیا فرق ہے، فرمایا کہ "اس سے تمھارا کیا مطلب ہے"۔ ہم نے عرض کیا کہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ ان میں سے کونسا لفظ فصیح و صحیح ہے اور کونسا لفظ غیر فصیح و غیر صحیح۔ فرمایا کہ "دونوں فصیح و صحیح ہیں"۔ ہم نے عرض کیا دونوں فصیح و صحیح ہیں تو کیا وجہ ہے کہ "نہ تھا" نظم و نثر میں بہ کثرت مستعمل ہے۔ اور "نہیں تھا" بالکل مستعمل نہیں۔ اور اگر ہے تو بہت کم بلکہ شاذ و نادر، نثر کو چھوڑیئے کیونکہ وہ نظم کی طرح ذمّہ دارانہ اور قابلِ سند صنف نہیں مگر جہاں تک نظم کا تعلق ہے داغؔ و مجروحؔ کے ایک ایک شعر کے سوا

اور کہیں "نہیں تھا" کا استعمال ہماری نظر سے نہیں گزرا، اور یہ استعمال بھی درمیانِ شعر میں ہماری نظر سے گزرا ہے نہ کہ آخر شعر میں، اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ اگر غیر صحیح نہیں تو غیر فصیح ضرور ہے، علاوہ ازیں ایسی ہزاروں غزلیں اور نظمیں موجود ہیں جن میں "نہ تھا" کو ردیف قرار دے کر استعمال کیا گیا ہے، مگر "نہیں تھا" کا بطور ردیف کہیں وجود پایا نہیں جاتا۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لفظ غیر فصیح ہے حضرت استاذی علیہ الرحمۃ یہ سُن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، آٹھ دس منٹ تک سوچنے اور غور کرنے کے بعد فرمانے لگے کہ "بھئی آزاد تم نے یہ تو واقعی ٹھیک کہا کہ" لفظ (نہیں تھا) بطور ردیف بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اور ردیف سے قطع نظر بھی کر لی جائے تب بھی نظم و نثر اس سے ایک بڑی حد تک خالی نظر آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کبھی اس سے پہلے اس کی طرف ہمارا خیال نہیں گیا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ کسی لفظ کا بطور ردیف یا ردیف کے علاوہ کسی دوسری جگہ عام طور سے غیر مستعمل ہونا اس کو غیر فصیح یا غیر صحیح ثابت کرنے کے کافی نہیں۔ خصوصاً جب کہ وہ لفظ روزمرہ میں داخل ہو۔ اور رات دن بولا جاتا ہو، ہزاروں لفظ

ایسے ہیں جو عام طور سے بولے جاتے، مگر کبھی نظم و نثر میں استعمال نہیں کئے گئے، لیکن کوئی ان کو صرف ایک اس بناء پر غلط یا غیر فصیح نہیں سمجھتا۔ جب یہ صحیح ہے تو "نہیں تھا" بھی غلط یا غیر فصیح نہیں ہو سکتا، البتہ تحریر میں استعمال و عدم استعمال یا کثرت و قلتِ استعمال کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ "نہیں تھا" فصیح ہے اور "نہ تھا" فصیح تر۔"

پھر فرمایا لیکن ایک بات اب بھی باقی رہ گئی اور وہ یہ کہ آخر کیا وجہ ہے کہ فصحا لفظ "نہیں تھا" کے استعمال سے اس قدر اجتناب کرتے ہیں، مگر یہ غور طلب معاملہ ہے۔ انشا اللہ ہم غور کرنے کے بعد پھر کبھی تم کو اس سے مطلع کرینگے"۔ مگر افسوس کہ ہم پھر کبھی مطلع نہ ہو سکے کیونکہ اس واقعے سے تھوڑے ہی عرصے بعد یہ معلوم ہوا کہ استاذی علیہ الرحمتہ رحلت فرما گئے۔ اور یہ عقدہ ہمیشہ کے لئے لاینحل رہ گیا۔

(۱۳) ایک دن ہم نے عرض کیا کہ وہ عربی الفاظ جو اپنے لغوی معنی چھوڑ کر اردو میں مستعمل ہو گئے ہیں۔ مثلاً

لفظ	معنی	لفظ	معنی	لفظ	معنی
عنایت	مہربانی	طیار	آمادہ	محرم	انگیا

لفظ - معنی	لفظ - معنی	لفظ - معنی
غریب - مفلس	فقیر - گدا	مذاق - دلّگی
غلیظ - گندہ	نقد - روپیہ پیسہ	کیمیا - اکسیر
سلوک - برتاؤ	عرصہ - مدت	

کیا ہم اِن الفاظ کو ان اپنے پیدا کئے ہوئے معنوں میں بہ عطف و اضافت استعمال کر سکتے ہیں۔ فرمایا کہ اِن میں سے بعض الفاظ مثلاً عنایت، کیمیا، فقیر، نقد وغیرہ تو ایسے الفاظ ہیں جو اردو میں آنے سے پہلے یعنی فارسی ہی میں اپنے اصلی معنی چھوڑ چکے تھے اس لئے ان الفاظ کا عطف و اضافت کے ساتھ استعمال پہلے ہی سے جائز ہے، رہ گئے باقی الفاظ طیار، محرم، مذاق اور سلوک وغیرہ جن کے معنی اردو میں آکر بدلے ہیں، میری رائے یہ ہے کہ ان کا استعمال بھی بہ عطف و اضافت بالکل درست ہے کیونکہ اہلِ فارس بھی یہی کرتے آئے ہیں اور ہم کو یہی کرنا چاہیئے۔

(۴۴) ایک دن ہم نے عرض کیا یہ جو ہم نے عنایت، جذبہ اور نغمہ وغیرہ کی جمعیں عنایات، جذبات اور نغمات وغیرہ بنالی ہیں

حالانکہ عربی میں ان جمعوں کا وجود نہیں پایا جاتا، کیا یہ درست ہیں اور کیا ہم اِن کو بہ عطف و اضافت استعمال کر سکتے ہیں، فرمایا کہ ان میں سے ایک لفظ عنایت کی جمع عنایات تو ایسی ہے جو ہمیں فارسی سے بنی بنائی پہنچی ہے۔ کیونکہ بعض فارسی اہلِ زبان نے اس کو استعمال کیا ہے۔ باقی رہ گئیں جذبہ، اور نغمہ کی جمعیں جذبات اور نغمات، سو یہ بھی جائز ہونی چاہئیں کیونکہ ہم نے یہ جمعیں بھی اسی قاعدۂ عربی سے بنائی ہیں جس قاعدے سے اہلِ فارس نے عنایت کی جمع عنایات بنائی ہے۔ اگر یہ جمعیں عربی میں رائج نہیں تو نہ ہوں مگر ہم نے انہیں عربی قاعدے ہی سے بنایا ہے لہذا غلط نہیں ہو سکتیں اور جب یہ خود غلط نہیں ہیں تو ان کا بہ عطف و اضافت استعمال بھی صحیح ہے اور بالکل صحیح"۔ پھر فرمایا کہ ایک عنایات، جذبات اور نغمات ہی پر کیا منحصر ہے، اگر ہم اپنی زبان کی ترقی کے خواہشمند ہیں تو آئندہ ہمیں ایسی ہزاروں جمعیں بنانی پڑیں گی۔

پھر ہم نے عرض کیا کہ یہ جو بعض فارسی الفاظ مثلاً دیہہ۔ باغ۔ خواہش کی جمعیں بہ قاعدۂ عربی دیہات۔ باغات۔ اور خواہشات

بنالی گئی ہیں ان کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے، فرمایا کہ اگرچہ یہ جمعیں
بے قاعدہ بنالی گئی ہیں، کیونکہ الفاظ فارسی ہیں اور قاعدہ جمع عربی
ہے۔ جو کسی طرح درست نہیں۔ مگر زبان کی رَو کا کون مقابلہ کر سکتا ہے
بولنے والے بول رہے ہیں؛ لکھنے والے لکھ رہے ہیں؛ صرف ایک فصحا کا
طبقہ ایسا ہے جو ان الفاظ کے استعمال سے ابھی تک اِجتناب کر رہا ہے
مگر کہاں تک؟ میرا خیال ہے کہ ایک روز یہ بے قاعدہ الفاظ بھی
عام ہو کے رہیں گے؛ لیکن ابھی وہ وقت دُور ہے، اس لئے بہتر یہی
ہے کہ ابھی اپنے ادب کو ان الفاظ سے محفوظ رکھا جائے۔"

(۵۱) ایک دن ہم نے عرض کیا الفاظ صَدَمہ، غَلبہ، حَرَکت، بَرَکت،
در اصل بہ حَرکتِ حرفِ دوم صحیح ہیں۔ مگر ہم ان سب کو بہ سکونِ
حرفِ دُوم بولتے ہیں۔ کیا یہ اس صُورت میں بھی صحیح ہیں؟ فرمایا کہ "ہاں
صحیح ہیں"۔ کیونکہ یہ سب الفاظ بہ سکونِ حرفِ دوم ہی ہماری زبانوں پر
جاری وساری ہیں"۔ ہم نے عرض کیا کہ اگر یہ الفاظ بہ سکونِ حرفِ دوم
صحیح ہیں تو کیا ان کو بہ عطف واضافت بھی استعمال کیا جا سکتا ہے؟
فرمایا کہ "کیا جا سکتا ہے۔ اور کرنا بھی چاہئیے۔ کیونکہ اہلِ فارس

پہلے سے یہ عمل کرتے آرہے ہیں"۔ ہم نے عرض کیا کہ وہ کس طرح؟
فرمایا کہ بات یہ ہے کہ اہلِ فارس کی زبان پر توالیِ حرکات گراں ہے
اسی لئے انہوں نے تسکینِ اوسط کا قاعدہ نکالا ہے۔ وہ جس جگہ یا جس
لفظ میں تین حروف مسلسل متحرک پاتے ہیں، بالاکثر متحرکِ دوم کو ساکن
کر لیتے ہیں۔ اور صرف ساکن ہی نہیں کر لیتے، بلکہ ایسے الفاظ کا بہ عطف
و اضافت استعمال کرنا بھی عیب میں داخل نہیں، مثلاً عربی الفاظ
حَیَوان اور حَیَران درحقیقت بروزن فَعَلان تھے، یعنی اِن دونوں
لفظوں کے ابتدائی تین تین حروف مسلسل متحرک تھے۔ اہل فارس نے
اِن دونوں کے حرفِ **یا** کو جو متحرکِ دُوم ہے۔ ساکن کرلیا۔ اور حرفِ
ن کو جو عربی میں غُنّہ نہ تھا غُنّہ کر کے حیْوان اور حیْران بروزنِ
فَعْلُن بنا لیا۔ پھر اسی پر بس نہیں کی۔ بلکہ اپنا عطف و اضافت کا قاعدہ
بھی ان میں جاری کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح توالیِ حرکات
اہلِ فارس کی زبان پر گراں ہے اسی طرح ہماری زبان پر بھی گراں ہے
اور یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان بھی جہاں کہیں مسلسل تین حروف متحرک
پاتی ہے ان میں سے متحرکِ دُوم کو ہمیشہ ساکن کر لیتی ہے اس لئے ہم کو

بھی ایسے الفاظ سے وہی برتاؤ کرنا چاہیئے جو اہلِ فارس پہلے سے
کرتے چلے آرہے ہیں ۔ یعنی اُن کو غلط بھی نہ سمجھنا چاہیئے اور انھیں
بہ عطف و اضافت استعمال کرنے میں باک نہ کرنا چاہیئے ۔

یہ سُن کر ہم نے عرض کیا کہ جو ان الفاظ کی جمعیں صَدَمات ۔
حَرَکات اور بَرَکات بہ توالیٔ حرکات آتی ہیں اِن کے سَاتھ کیا
سُلوک کرنا چاہیئے ۔ فرمایا کہ " اگرچہ اہلِ فارس جمع کی صُورت میں
تسکینِ اوسط سے بالاکثر مجتنب رہے ہیں ، مگر ہمیں ایسا نہ کرنا چاہیئے
کیونکہ توالیٔ حرکات ہماری زبانوں پر اہلِ فارس سے بھی زیادہ
گراں ہے ۔ اس لئے ہمیں ایسے الفاظ میں بھی تسکین اوسط اور عطف
و اضافت کے قاعدے بے خوف جاری کر دینے چاہئیں ۔ ہمارے لئے
اسی میں آسانی ہے ۔ ہم ہر بات میں اہلِ ایران کی تقلید کے عادی
چلے آرہے ہیں ۔ اب ہمیں یہ عادت چھوڑنی چاہیئے ۔ اور جہاں ضرورت
ہو اجتہاد سے کام لینا چاہیئے ۔"

(۱۶) ایک دن ہم نے عرض کیا کہ یہ جو بعض لوگ الفاظ مشکور
(شکر گذار) اور مسلوک (سلوک کرنے والا) کے معنوں میں بولتے اور

لکھتے ہیں کیا اس کو جائز رکھنا چاہیئے۔ فرمایا کہ" یہ تو جہاں کے الفاظ ہیں، یہ کیونکر جائز رکھے جا سکتے ہیں، ایسے الفاظ سے ہمیشہ اجتناب کرنا چاہیئے"۔

پھر ہم نے عرض کیا آجکل بعض اصحاب نے اِک نیا لفظ "ایزاد" گھڑ لیا ہے، جسے وہ زیادت کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ یہ کہاں تک درست ہے، فرمایا" یہ لفظ بھی جاہلانہ لفظ ہے، اس سے بھی محترز رہنا چاہیئے"۔

بعض عذرات اور خاتمہ

اگرچہ ابھی بعض اور بھی چند ایسے واقعات حافظے میں محفوظ ہیں جن کا اظہار ضروری بھی ہے اور مفید بھی، مگر مقدمہ طول پکڑتا جا رہا ہے، اور بعض وجوہ سے اس وقت مقدمہ کو مزید طول دینا مناسب نہیں لہٰذا اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے اگر زندگی باقی رہی اور افکار زمانہ نے مہلت بھی دی تو مجموعۂ ہٰذا کی طباعت ثانی کے موقع پر اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

اس سے پہلے کہ مقدمہ ختم ہو، ہم اس حقیقت کے اظہار پر

باز نہیں رہ سکتے کہ غزل مخصوص ہے جذبات و احساساتِ حسن و عشق
کے اظہار کے لئے اگرچہ چند صدیوں سے اُس میں رندانہ، عارفانہ،
اور فلسفیانہ خیالات و مسائل شامل کر کے اُس کے میدان کو وسیع
بھی کر لیا گیا ہے۔ اور اُس کو رفعت و پاکیزگی بھی بخشدی گئی ہے
مگر وہیں تک جہاں تک کہ یہ خیالات و مسائل تغزل میں مخل نہ ہوں
اور مقصدِ غزل فوت نہ ہونے پائے۔ یہی سبب ہے کہ رندانہ،
عارفانہ اور فلسفیانہ خیالات و مسائل شامل کر لینے کے باوجود غزل میں
جذبات و احساساتِ حسن و عشق کا غلبہ نظر آتا ہے، اور غلبہ نظر آنا بھی
چاہیئے۔ کیونکہ یہ جذبات و احساسات تمام دوسرے جذبات و احساسات
سے محبوب و مرغوب تر جذبات و احساسات ہیں، یہ نہ کبھی پہلے
چھپائے جا سکے ہیں اور نہ آئندہ چھپائے جا سکیں گے۔ یہ ہمیشہ ظاہر
کئے جاتے رہے ہیں اور ہمیشہ ظاہر کئے جاتے رہیں گے۔ یہ اس قدر قوی ہیں
کہ کوئی مخالف و مزاحم قوت ان کے اظہار کو نہیں روک سکتی۔
جس طرح زندگی میں کھانا پینا، چلنا پھرنا اور سانس لینا ضروری ہے
اسی طرح ان کا اظہار بھی ضروری ہے۔ مگر یہ جذبات و احساسات

احساسات محدود ہیں غیر محدود نہیں ، اور چونکہ یہ محدود ہیں اس لیے
انسان ان کی تکرار پر مجبور ہے ؛ ان کی پہلے بھی تکرار ہوتی رہی
ہے اور آیندہ بھی تکرار ہوتی رہے گی - یہ ہمیشہ دُہرائے گئے
ہیں اور ہمیشہ دُہرائے جائیں گے - ازل سے یہ سُنّت جاری ہے اور
ابد تک جاری رہے گی ، پھر اگر ہم کو بھی اپنی زندگی میں اُن کے
دُہرانے پر مجبور ہونا پڑا ہے تو ہمیں زیادہ قابلِ الزام قرار نہ دینا
چاہیئے - اگرچہ ہم کبھی کبھی ان جذبات و احساسات کے ایسے ایسے
عمیق پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں ،
جہاں تک متقدمین کی نظریں نہیں پہونچ سکی تھیں ، مگر واقعہ یہ ہے
کہ ہمیں زیادہ تر انہیں جذبات و احساسات کو دُہرانا پڑتا ہے جو
ہر زمانے میں ہزاروں اور لاکھوں بار دُہرائے جا چکے ہیں ، لیکن
یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم نے اُنہیں بجنسہٖ نہیں دُہرایا ، بلکہ جب سے ہماری
شاعری سنِ بلوغ و رشد کو پہنچی ہے ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے
کہ اُن کو دُہرائیں تو اس طرح دُہرائیں کہ انہیں اک نئی روح اور
نیا پیکر نصیب ہو جائے - ایسی نئی روح اور ایسا نیا پیکر جو دورِ حاضر
میں اپنے لئے مناسب جگہ بھی پیدا کر سکے اور ہماری مشرقی خصوصیات
و روایات کے منافی بھی نہ ہو ، مگر ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اپنی
اس کوشش میں کامیاب ہو سکے ہیں یا نہیں ، اور اگر کامیاب ہو سکے
ہیں تو کہاں تک -

آخر میں صرف اتنا عرض کر دینا اور باقی رہ گیا ہے کہ اگرچہ ہم نے معائب شعر سے بچنے کی تا امکان پوری کوشش کی ہے، مگر ہم انسان ہیں، اور ہمارا کلام بھی انسانی کلام ہے، ظاہر ہے کہ نہ کوئی انسان سہو و خطا سے بالکلیہ مبرا ہو سکتا ہے اور نہ کوئی انسانی کلام معائب و اسقام سے - اس لئے ہم بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہمارا کلام معائب و اسقام سے قطعی پاک ہے - ہم کو اعتراف ہے کہ ہمارے کلام میں بھی معائب و اسقام ہیں، اگرچہ کم ہیں، مگر ہیں ضرور، ان معائب و اسقام میں سے بعض معائب و اسقام کا ہمیں علم ہے اور جن معائب و اسقام کا ہمیں علم ہے وہ دو قسم کے ہیں:

اوّل - وہ معائب جو ہمیں ہمیشہ محبوب و مرغوب رہے ہیں اور جن کا ارتکاب ہم نے بلا خوف دیدہ و دانستہ کیا ہے - ان کے ارتکاب پر ہم نادم نہیں، بلکہ نازاں ہیں -

دوم وہ معائب و اسقام جنھیں بعض اچھے اشعار کو خونِ ناحق سے بچانے کے لئے کہیں کہیں گوارا کر لیا گیا ہے، ایسے معائب و اسقام بھی ہمارے لئے چنداں قابل افسوس نہیں، لیکن اس کو ہم مانتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوتے تو اچھا تھا -

اب رہ گئے وہ معائب و اسقام جن کا ہمیں کوئی علم نہیں البتہ ایسے معائب و اسقام اگر کبھی ہمارے علم میں آئے یا لائے گئے تو ہمیں اپنی لاعلمی پر ضرور ایک گونہ افسوس ہوگا، مگر نہ اتنا کہ وہ

رنج و ندامت کے درجہ تک پہونچ جائے، کیونکہ ہم نے کبھی ہمہ دانی کا دعوےٰ نہیں کیا۔

ہم خاتمے پر پھر ایک مرتبہ اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس تمام لمبی چوڑی رام کہانی سُنانے سے ہرگز ہمارا یہ منشاء نہیں ہے کہ اپنے کو شاعری میں یکتائے فن اور بے عدیل روزگار ثابت کیا جائے۔ بلکہ اس کے حسب ذیل چار مقصد ہیں۔

پہلا مقصد یہ ہے کہ ارباب ملک واقف ہو جائیں کہ شاعری وہ دشوار فن ہے جو کسی کو بھی آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہم کو بھی آسانی سے حاصل نہیں ہوا۔ اور فن تو عموماً پانچ سات سال یا زیادہ سے آٹھ دس سال میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں، مگر فن شعر اپنی حد کمال تک پہنچنے کے لئے کم سے کم تیس چالیس سال کی لگاتار محنت و مشق کا طلبگار رہے ہے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ یہ امر روشنی میں آ جائے کہ ہماری شاعری کی ابتدا کس قدر پست و حقیر تھی، اور اُس نے ماہران فن اساتذہ کی رہنمائی میں لگاتار محنت و مشق کی بدولت کہاں سے کہاں پہنچ کر دم لیا

تیسرا مقصد جیسا کہ اس سے پہلے بھی ظاہر کر دیا گیا ہے یہ ہے کہ ہم نے جو نقاطہ نگاہ ملحوظ رکھ کر زبان و شعر و ادب کی خدمت کی ہے اُن کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

چوتھا مقصد یہ ہے کہ شاید اس عام کجرائی، کجروی اور تمرّد و خود پسندی کے زمانے میں بعض حق شناس اور راستی جو طالبانِ فن ایسے بھی نکل آئیں جو ہمارے اس لگاتار پنجاہ سالہ سفر کے نقوشِ قدم سے کم و بیش رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اگر ہمارے یہ مقاصد تھوڑے بہت بھی پورے ہو سکے تو ہم سمجھیں گے ہماری محنت ٹھکانے لگی ؎ ورنہ ما بخیر و شما بسلامت۔

خاکسار

آزاد انصاری

سہارنپوری

دہلی۔ ۱۵ر فروری ۱۹۳۷ء

عثمانیہ المعارف پریس

فی الحمد[1]

آخر عشرۂ جون ۱۹۱۰ء چھاؤنی انبالہ طرح طبع زاد

(مسلسل)

بڑا کہنا تجھے شایاں۔ خدا کہنا تجھے زیبا
بڑائی بھی ترا حصّا۔ خدائی بھی ترا حصّا

تری ذات اطہر و اقدس۔ تری شان ارفع و اعلےٰ
قیود فہم سے باہر۔ حدود وہم سے بالا

جو کاشی میں ترے درشن۔ تو کعبے میں ترا جلوہ
جدھر ڈھونڈا تجھے پایا۔ جدھر دیکھا تجھے دیکھا

مناور میں تری سیوا۔ مساجد میں تری پوجا
تجھے سب نے خدا جانا۔ تجھے سب نے خدا مانا

---

[1] میں غزلیات کی مندرجہ ترتیب کے خیال تک بہت غور و فکر کے بعد پہنچا ہوں۔ اولاً میرا خیال تھا کہ تمام غزلیات کو خواہ وہ کسی ردیف کی ہوں حسب زمانۂ تصنیف (جیسا کہ مغربی تصانیف کے اتباع میں آجکل ضروری سمجھا جاتا ہے) ترتیب دوں۔ مگر اس میں یہ خرابی پیدا ہو جاتی کہ اگر کوئی کسی ردیف کی غزل تلاش کرنی چاہتا تو اس کو سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ یعنی تمام دیوان کے اوراق چھاننے پر بھی وہ غزل اس کو بہ مشکل دستیاب ہو سکتی۔ اس لئے مجھ کو مجبوراً تمام غزلیات حسب رواج قدیم ردیف وار ہی ترتیب دینی پڑیں۔ لیکن میں نے غزلیات کو ردیف وار ترتیب دینے پر بھی یہ جدت کی ہے کہ ان کو ہر ردیف کے ماتحت حسب زمانہ تصنیف ترتیب دیا ہے۔ اس سے اک بڑی حد تک دونوں مقصد حاصل ہو جاتے ہیں۔ یعنی ترتیب زمانی بھی قایم رہتی ہے۔ اور مذکورہ بالا دقت بھی رفع ہو جاتی ہے۔ لیکن حمدیہ اور نعتیہ غزلوں کو اس ترتیب سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کو ادباً و احتراماً آغاز دیوان ہی میں درج کرنا چاہیئے تھا۔ اور یہی میں نے کیا۔ آزاد انصاری

جسے دیکھو، تری برحق خدائی کا ہے دل قائل — موافق بھی ترا بندا۔ مخالف بھی ترا بندا

جسے پوچھو، تری ناچیز مخلوقات میں داخل — نہ ارواح اس سے مستثنے۔ نہ اجسام اس سے مستثنے

وہ قومیں جو ترے انکار کی خوگر ہیں، قاصر ہیں — تری قدرت کے نظاروں نے اندھا کر دیا ہوگا

بظاہر مادے کی بحث موزوں بھی ہے لیکن بھی — مگر جب غور سے دیکھو۔ نرا چکما، کھلا دھوکا

یہ ثابت ہو چکا ہے۔ مادہ بے جان و بے حس ہے — جب ایسا ہے تو ذات حق اناادی[1] اور وہ نو پیدا

اگر ہم فرض کر لیں۔ مادہ خلاق عالم ہے — جب امر حق یہی ہے، دل گواہی کیوں نہیں دیتا

کہاں کا مادہ، کس کی قدامت، لغو قصے ہیں — کوئی تیرے سوا خلاق عالم ہو نہیں سکتا

ترے برحق وجود پاک کا بطلان ناممکن — نہ منقولات کی طاقت نہ معقولات کا یارا

ترے منکر کی بابت عقل و دانش کا یہ فتوے ہے — وہ جاہل ور نرا جاہل۔ وہ اندھا اور نہایت اندھا

جو تو صانع تو ہم مصنوع۔ ظاہر بھی ہے، ثابت بھی — جو تو خالق تو ہم مخلوق۔ "آمنا و صدقنا"

بہر حالت کوئی معبود برحق ہے تو وہ تو ہے — یہ وہ دعوے ہے جس کو کوئی باطل کر نہیں سکتا

یہاں بھی قابل عزت۔ وہاں بھی قابل عزت — خوشا! اُس قوم کی تقدیر جس نے تجھ کو پہچانا

لو وہ آزاد آیا اور وہ اُس کی صدا آئی

"ھو الخالق۔ ھو المالک۔ ھو الوالی۔ ھو المولے"

[1] اناادی ہندی لفظ ہے۔ بمعنی قدیم۔ آزاد انصاری

فی النعت لسید الکائنات علیہ الصلوٰت والتحیات

اوائل جنوری ۱۹۲۰ء ۔ علیگڈھ طرحِ مرغوب

مسلسل بہ طرزِ ترسیعِ جدید[1]

سچ تو یوں ہے۔ تو نے سچ کا کامل اعلا کر دیا   حق تو یوں ہے۔ تو نے حق کا بول بالا کر دیا

پرچمِ توحید چاروں کھونٹ لہرانے لگے   چپّے چپّے پر نشانِ صدق برپا کر دیا
سیکڑوں انوارِ گوناگوں نظر آنے لگے   دل کی آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں کو بینا کر دیا

سرکشوں کا سر خدا کے سامنے جھکوا دیا   مشرکوں کو ذاتِ واحد سے شناسا کر دیا
ملحدوں کو آتشِ توحید سے گرما دیا   منکروں کو روشناسِ حق تعالےٰ کر دیا

---

[1] "ترسیعِ جدید"۔ اِس صنعت کا موجد خاکسار ہی ہے۔ میں نے اِس صنعت کا (جیسا کہ آپ آگے جابجا ملاحظہ فرمائیں گے) اکثر غزلوں، نظموں، قصیدوں، اور ترکیب بندوں وغیرہ میں استعمال کیا ہے۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مطلع تو حسبِ دستور رواجِ قدیم ہی کے موافق ہوتا ہے۔ لیکن باقی اشعار میں کبھی مقطع کے علاوہ اور کبھی بشمول مقطع باقی تمام دو دو شعروں کے اول مصرعے انگریزی نظم کی طرح ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اور ہر دو شعر کے بعد اول کے دونوں مصرعوں کا قافیہ بدل جاتا ہے۔ مگر ثانی مصرعوں کا نہیں بدلتا۔ بلکہ حسبِ رواجِ قدیم آخر کے تمام مصرعے تمام اشعار میں آخر تک مطلع ہی کے ہم قافیہ و ہم ردیف چلے جاتے ہیں۔ یہ طرز میں نے کچھ تو حضرت استاذی مولانا حالی کے بعض اس قسم کے اشعار سے۔ اور زیادہ تر انگریزی نظموں سے اخذ کی ہے۔ لیکن انگریزی نظم میں اور اس میں پھر بھی بڑا فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ اُس میں تو ہر دو شعر کے بعد اول کے دونوں مصرعوں کا بھی قافیہ بدل جاتا ہے۔ اور آخر کے دونوں مصرعوں کا بھی۔ مگر اِس میں ایسا نہیں ہوتا۔ اِس میں صرف اول کے مصرعوں کا قافیہ بدلتا ہے۔ ثانی مصرعوں کا نہیں۔ علاوہ ازیں انگریزی نظم میں نہ مطلع ہوتا ہے اور نہ مقطع۔ مگر اِس میں اکثر للزوماً یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ آزاد انصاری

[2] یہ نعت "سرکارِ بطحےٰ" کی سُرخی سے رسالہ "ہزار داستان" لاہور میں شائع ہو چکی ہے۔ آزاد انصاری

سیکڑوں جور و جفا کاری کے دریا رک گئے
جوشِ طوفانِ ستم دھیمے سے دھیما کر دیا

سیکڑوں خطے نکوکاری کی جانب جھک گئے
بارِ عصیانِ جہاں ہلکے سے ہلکا کر دیا

شورِ تکبیر و اذاں سے آسماں تک گونج اٹھے
پایۂ احکامِ حق اونچے سے اونچا کر دیا

ذکرِ مولائے جہاں سے دو جہاں[1] تک گونج اٹھے
رتبۂ نامِ خدا بالا سے بالا کر دیا

خامکاروں کو رہِ صدق و صفا پر ڈال کر
دین میں مضبوط۔ ایمانوں میں پکا کر دیا

کج مداروں کو صراطِ اتقا پر ڈال کر
شورِ عصیاں سرد۔ جوشِ فسق ٹھنڈا کر دیا

بد شعاروں سے عنانِ ملک و دولت چھین کر
اوجِ کثرت پست۔ زورِ کفر ڈھیلا کر دیا

نابکاروں سے نشانِ فتح و نصرت چھین کر
شیطنت کی سلطنت کا تخت اوندھا کر دیا

متصل کجراہیوں۔ کج فہمیوں سے روک کر
کجرووں کو ٹھیک۔ کج فہموں کو سیدھا کر دیا

رات دن خود غرضیوں، خود کامیوں پہ ٹوک کر
خود پرستوں کو رضائے حق کا جویا کر دیا

کوششِ پیہم سے کفرِ مادیت توڑ کر
ہر طرف اشغالِ روحانی کا چرچا کر دیا

ہمتِ محکم سے سرکشیوں کی طاقت توڑ کر
جابجا احکامِ ربانی کا اجرا کر دیا

---

[1] میں لفظ "دو" باشباع کو فارسی ترکیب میں بھی جائز و فصیح سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری۔

عشق ربِ دوسرا[1] کا خلق میں دم پھونک کر
چہرۂ اہلِ جہاں پر نور پیدا کر دیا
عظمتِ ذاتِ خدا کا اسمِ اعظم پھونک کر
مُردہ روحانیت عالم کو زندہ کر دیا

گردِ غیر اللہ دامانِ جہاں سے جھاڑ کر
ترکِ غیر اللہ کا راہِل دنیا کر دیا
پردۂ روئے حقیقت ایکدم سے پھاڑ کر
سرِ مخفی عام؛ رازِ مضمر افشا کر دیا

رشتۂ دنیا و دین دامانِ حق سے جوڑ کر
دین کو کار آمد دُنیا و عقبےٰ کر دیا
خلق کا رُخ جانبِ نورِ ہدایت موڑ کر
ملتِ بیضا کو اسمِ بامُسمّےٰ کر دیا

شاخِ نومیدی نہالِ زندگی سے چھانٹ کر
رنجِ نومیدی دلِ دُنیا سے عنقا کر دیا
دولتِ صبر و رضا اہلِ جہاں کو بانٹ کر
زندگی کی کلفتوں کو راحت افزا کر دیا

کاہلوں کو مستعد رہنے کی عادت ڈال دی
نادتوں میں فرض کا احساس پیدا کر دیا
غیرتیں دے کر بنا دے پاسِ غیرت ڈال دی
غیرتوں میں فردِ خودداری میں یکتا کر دیا

مختلف اشخاص مِل کر جسمِ واحد بن گئے
منتشر افراد کی طاقت کو یکجا کر دیا
جب بڑھے سیلابِ عالمگیر کی صورت بڑھے
قطرے قطرے کو ملا کر رشکِ دریا کر دیا

---

[1] دیکھو صفحہ (۸۴) حاشیہ (۱)

اِک طرف سچی حیاتِ جاودانی بخش دی
اِک طرف بالکل فنا فی العشق مولےٰ کر دیا
اِک طرف آسائشِ دُنیائے فانی بخش دی
اِک طرف حقدارِ نعمتہائے اُخرے کر دیا

ایکہ تیرا نام شایانِ تحیّات و سلام
ایکہ تو نے حق و باطل آشکارا کر دیا
ایکہ تیرا کام نفع العام تحسین خیز کام
ایکہ تو نے عقدۂ دنیا و دیں وا کر دیا

مرحبا! تخمِ کرم کشتِ جہاں میں بو دیا
حبّذا! حقدارِ لطفِ حق تعالےٰ کر دیا
ماحصل یہ ہے کہ ہر خطرہ دلوں سے دھو دیا
مختصر یہ ہے کہ ہر دُکھ کا مداوا کر دیا

حضرتِ آزاد! شکرِ لطفِ حق، جس نے ہمیں
تا ابد وابستۂ سرکارِ بلطیے کر دیا

۲۶ فروری ۱۸۹۸ء سہارنپور - برطرحِ مشاعرۂ منعقدۂ تحصیلی اسکول سہارنپور

حالِ دلِ فگار سُنایا نہ جائیگا
زخمِ درونِ سینہ دکھایا نہ جائیگا
ظاہر کا ربط و ضبط بڑھانے سے فائدہ
دل ایسی چیز ہے کہ گنوایا نہ جائیگا
اک مدعائے اجبُ الاظہار دل میں ہے
لیکن زبان تک کبھی لایا نہ جائیگا
یارانِ غمگسار کی غمخواریاں فضول
اُلفت وہ درد ہے کہ بٹایا نہ جائیگا
اب تیری عادتوں کا بدلنا محال ہے
جو ہم نے کھو دیا ہے وہ پایا نہ جائیگا
تیرے ستم جو آج نہ بھولے تو کل سہی
لیکن ترا خیال بھلایا نہ جائیگا

انجامِ کار کا بھی تجھے کچھ خیال ہے | کیا جو ستائیگا وہ ستایا نہ جائیگا
غیروں کے واسطے ہی مسیحائے وقت ہو | ہم کو تو خاک میں بھی ملایا نہ جائیگا
آزاد! مفت جان کھپانے سے فائدہ؟ | قسمت کی خوبیوں سے بر آیا نہ جائیگا

---

۱۸ نومبر ۱۸۹۸ء - سہارنپور - بر طرح گلدستۂ خورشیدِ سخن

کیا خاک مان لوں کہ وہ نامہرباں نہ تھا | اک طرزِ التفات سے کیا کچھ عیاں نہ تھا
کیا میری بیخودی بھی یونہیں رائگاں گئی | اتنا تو پوچھ لو کہ کہاں تھا کہاں نہ تھا
یوں یاد آؤگے ہمیں اصلا خبر نہ تھی | یوں بھول جاؤگے ہمیں وہم و گماں نہ تھا
اُمید کے لحاظ سے میرا گماں غلط - | برتاؤ کے خیال سے تو مہرباں نہ تھا
اربابِ فہم کیوں متاثر نہ ہو سکے | میرا سکوت بھی تو کم از داستاں نہ تھا
اتنی خبر تو ٹھیک کہ "اک قافلہ لٹا" | لیکن یہی غلط کہ "مرا کارواں نہ تھا"
تم آئے اور بزم کا نقشہ بدل گیا | دم بھر میں وہ طرب - وہ طرب کا سماں نہ تھا
آزاد! آہ قوم کی نااتفاقیاں[1] | گویا کہ اتفاق کا نام و نشاں نہ تھا

---

۲۲ - فروری ۱۹۰۰ء - سہارنپور - طرح طبعزاد

لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا | آہ! کسی مصرف کا نہ رکھا

---

[1] یہ اس زمانے کی غزل ہے جس زمانے میں ہم غزل میں بہ اتباع اُستاد مرحوم ہر قسم کے مضامین اصلاحی یا ملکی - قومی وغیرہ باندھنا جائز سمجھتے تھے - مگر بعد میں یہ خیال بدل گیا - اور اس پر جم گئے کہ غزل کو غزل ہی رہنا چاہئے - آزاد انصاری -

آنکھ ہے اور سودائے تماشا — دل ہے اور دُنیائے تمنّا
آجتک آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں — ہائے! وہ پیارا پیارا جلوا
رحم نہ کھانا ٹھیک نہیں ہے — دیکھ! ستا کر کچھ نہ ملے گا
دامنِ غفلت چھوٹ نہ جائے — آنکھ اُٹھا کر دیکھ نہ لینا
شکوۂ غفلت کروں تو کس سے — حرفِ شکایت کون سُنے گا
زیست کے دن کاٹے نہیں کٹتے — کاش! ترا ارمان نہ ہوتا
صبر کبھی آیا ہے نہ آئے — حسبِ عادت بھول نہ جانا
آہ! ہماری ناؤ کی حالت — موجیں حائل۔ طوفاں برپا
آزاد! آپ اور قیدِ علائق — "مرضیٔ مولےٰ از ہمہ اولےٰ"

۱۰ر مارچ سنہ ۱۹۰۰ء۔ سہارنپور۔ طرحِ مرغوب

تیری حسرت ہے کہ سودا ہو گیا — آہ! کیا جانے۔ مجھے کیا ہو گیا
اے ہجومِ شوق! ظالم۔ رحم کر — کوئی پامالِ تمنّا ہو گیا
اے جنونِ عشق! کافر۔ باز آ — کوئی دنیا بھر میں رُسوا ہو گیا
آپکا ارمان ہو یا خبط ہو — دل بہر حالت نکمّا ہو گیا
لطف کی نظریں قیامت ڈھا گئیں — اِضطرابِ شوق دُونا ہو گیا
میں ہوں اور تیری تمنا کے ستم — کُلفتِ جاوید حِصّا ہو گیا

غفلتیں اور غفلتوں میں کوششیں — آہ! پتھر کا کلیجا ہو گیا
جان لیوا غفلتیں جائز نہ رکھ — آس ٹوٹی اور تڑکا ہو گیا
شوق کو یہ لت کہ "چل اور اُس کو ڈھونڈھ" — عقل کہتی ہے کہ "سودا ہو گیا"
ہائے! مکروہات دنیا اور ہم — ہائے! کیا کیا کچھ گوارا ہو گیا
آہ! جس دل پر کبھی سو ناز تھے — صرف صدا فکار دُنیا ہو گیا
اِتفاق باہمی کچھ چیز ہے — قطرہ قطرہ مِل کے دریا ہو گیا
حالتِ آزادؔ پر افسوس ہے — تختۂ مشقِ اطبّا ہو گیا

یکم مئی سنہ ۱۹۰۰ء ۔ سہارنپور۔ طرح طبع زاد

تیرا عدیل کوئی تیرے سوا نہ ہوگا — تجھ سا کہاں سے لاؤں۔ تجھ سا ہوا نہ ہوگا
کیا اضطرابِ دل کی صرف اک تھپکی دوا ہو — کیا اور کوئی پہلو تسکین کا نہ ہوگا
صرف اک نظر اُٹھا کر قصّہ تمام کر دے — ان چشم پوشیوں سے کچھ فیصلہ نہ ہوگا
اِک دن یہ بے نیازی کچھ فائدہ نہ دیگی — اِک روز یہ تعلّق۔ یہ واسطہ نہ ہوگا
تھوڑی سی بھی تلافی اِس وقت تک تھی ہمّت — پھر کوششیں کروگے اور فائدہ نہ ہوگا
اُس روز زندگی کا بس خاتمہ سمجھئے — جس روز دل لگی کا کچھ مشغلہ نہ ہوگا
منزل کی جستجو سے پہلے کسے خبر تھی — رستوں کے پیچ ہوں گے۔ اور رہنما نہ ہوگا
آزادؔ رند مشرب! فکرِ مآل کر لے — اِک روز یہ اُمنگیں۔ یہ ولولہ نہ ہوگا

اوائلِ ستمبر سنہ ۱۹۰۰ء ۔ سہارنپور ۔ طرحِ مشاعرہ منعقدۂ تحصیلی اسکول سہارنپور

اچانک نزولِ بلا ہو گیا ۔۔۔ یکایک ترا سامنا ہو گیا

ترے لطف سے جان پر آ بنی ۔۔۔ دوا سے مرض لا دوا ہو گیا

وہ کافر نگاہیں ۔ خدا کی پناہ ۔۔۔ جدھر پھر گئیں فیصلہ ہو گیا

زہے! آپ کی بے نیازی کے ڈھنگ ۔۔۔ ہر اُمّید کا خاتمہ ہو گیا

مری بے کسی قابلِ رحم تھی ۔۔۔ مجھے بھول کر کیا بھلا ہو گیا

کچھ اب بھی تلافیٔ مافات کر ۔۔۔ ترحّم! کہ جو ہو گیا ۔ ہو گیا

طبیعت ہی درد آشنا ہو گئی ۔۔۔ دوا کا نہ ہونا دوا ہو گیا

سزا کے سزاوار کیوں ٹھیرتے ۔۔۔ خطا کا نہ کرنا خطا ہو گیا

اب اُس کو ستانے میں بھی عذر ہے ۔۔۔ ستم بھی مرا مدّعا ہو گیا

اگر حد سے گزریں تو بے شک حرام ۔۔۔ جو تھوڑی سی پی لی تو کیا ہو گیا

وہ اگلی سی دُنیا نہ پہلے سے ہم ۔۔۔ غمِ دوست میں کیا سے کیا ہو گیا

زمانے کی مجبوریاں ۔ الاماں! ۔۔۔ کہ جو کچھ گوارا نہ تھا ہو گیا

قطعہ

بطرزِ ترصیعِ جدید[1]

وہ دل، جو کبھی خرم و شاد تھا ۱ غمِ عشق میں مبتلا ہو گیا

وہ گھر، جو کبھی عشرت آباد تھا ۲ جہانِ ہجومِ بلا ہو گیا

---

[1] دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

وہ ذکرِ مسرّت، جو مرغوب تھا ۳ مبدّل بہ آہ و بکا ہو گیا
وہ سامانِ عشرت، جو محبوب تھا ۴ الم آفریں۔ صدمہ زا ہو گیا

وہ بے تابیاں، جن کی عادت نہ تھی ۵ شب و روز کا مشغلہ ہو گیا
وہ شورِ فغاں، جس کی طاقت نہ تھی ۶ لبِ ناتواں سے بپا ہو گیا

وہ پاسِ وفا، جس کا سودا نہ تھا ۷ دلِ زار کا مدّعا ہو گیا
وہ شکرِ جفا، جو گوارا نہ تھا ۸ فرائض سے بھی کچھ سوا ہو گیا

وہ سر، جو کہیں جا کے جھکتا نہ تھا ۹ یہاں تک جھکا۔ جبہ سا ہو گیا
وہ جوشِ طبیعت، جو رکتا نہ تھا ۱۰ رکا۔ اور رک کر فنا ہو گیا

وہ لطفِ مقدّر، جو مبذول تھا ۱۱ فقط قصۂ ما مضیٰ ہو گیا
وہ عیشِ دمادم، جو معمول تھا ۱۲ فقط خواب کا ماجرا ہو گیا

ستم تھی ستم، شوق کی ابتدا ۱۳ غضب ہے غضب کیا سے کیا ہو گیا

تم آزاد! کس خوابِ غفلت میں ہو
زمانے کا رخ دوسرا ہو گیا

اوائل اگست ۱۹۰۶ء سہارنپور[۱]۔ برطرح مشاعرۂ سالانہ بابو پتن لال صاحب رئیسِ کانپور

کیا کہوں۔ ناکامیٔ دل کا نتیجہ کیا ہوا	حوصلے بھی مٹ گئے، دل بھی گیا گزرا ہوا
اِس طرف میں ہوں کہ تجھ بن صبر آتا ہے نہ چین	اُس طرف تو ہے کہ غافل۔ بےخبر۔ بھولا ہوا
اب تو دل کی حسرتیں ناکام رہ کر مٹ گئیں	اب تو باز آ۔ اب تو بس کر۔ اب تو دل ٹھنڈا ہوا
تو ہے اور یہ ہٹ کہ جب تک ہو سکے غافل رہو	میں ہوں اور یہ غم کہ نالوں کا اثر اُلٹا ہوا
مجھ کو یہ حسرت کہ میرا دل ہو اور صبر و سکوں	دل کو وہ وحشت کہ میری جان کو آیا ہوا
ہم نے غم جھیلے تو کس حسرت سے کس ارمان سے	ہم نے دل پایا تو ذوقِ درد میں ڈوبا ہوا
سخت مشکل ہے کہ ضبطِ شوق ہو سکتا نہیں	سخت نادم ہوں کہ میرے ساتھ تو رسوا ہوا
یہ تو بتلا دو کہ ہم کو بھول کر کیا مل گیا	یہ تو سمجھا دو کہ غفلت کا نتیجہ کیا ہوا
وہ کسی کا بادہ نوشی پر تغافل مستزاد	وہ کسی کا ساغرِ صبر و سکوں چھلکا ہوا
آس کہتی ہے کہ "مجھ کو صبر کر، میں مٹ چلی"	صبر کہتا ہے کہ "دل کو تھام، میں چلتا ہوا"
آہ! کب تک دل کی بیتابانہ حالت دیکھیے	اور اُس دل کی کہ جس کا آسرا ٹوٹا ہوا
آج ضبطِ غم کی خدمت کون سرانجام دے	میں بھی گھبرایا ہوا ہوں، دل بھی گھبرایا ہوا

[۱] جس وقت یہ طرح ہوئی میں کانپور ہی میں تھا۔ اور مشاعرے میں مدعو کیا گیا تھا لیکن ابھی مشاعرے کے انعقاد میں کچھ عرصہ تھا کہ مجھ کو ایک ضروری کام سے سہارنپور جانا پڑا۔ اور بوجہ طوالت کار وہاں ڈیڑھ دو مہینے تک مقیم رہنا پڑا وہیں میں نے اپنے فرصت کے اوقات میں یہ غزل لکھی۔ گو میں نے یہ غزل کافی جانکاہی اور محنت سے لکھی تھی مگر افسوس شاملِ مشاعرہ نہ ہو سکا۔ یہ مشاعرہ بڑی شان اور بڑے لطف کا ہوتا تھا رئیس موصوف اس مشاعرہ پر سالانہ ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے تھے۔ آزاد انصاری

جتنی اُمیدیں تھیں، بالآخر غلط ثابت ہوئیں — ہم نے کچھ سمجھا۔ وہ کچھ نکلے۔ بڑا دھوکا ہوا
جس قدر مایوس ہوں اُس سے زیادہ شاد ہوں — زحمتِ اُمیدواری سے تو چھٹکارا ہوا
کون کہتا ہے کہ مُنھ مانگی مُرادیں بخشدے — یہہ گزارش تھی کہ اِک سائل کا دل تھوڑا ہوا

قطعہ

۱ وہ کسی کے دل میں اپنے خاکسار دل سے غبار — وہ کسی پر آسمانِ رنج و غم ٹوٹا ہوا
۲ وہ جُدائی کا زمانہ، وہ کمالِ بیکسی — وہ تو حش، وہ ہجومِ غم، وہ دل اُجڑا ہوا
۳ وہ مقدر کے گلے، وہ یاس، وہ بیچارگی — وہ تمنا کا جنازہ سامنے رکھا ہوا
۴ اے خوشا وہ دن! کہ وصلِ دوست سے دل شاد تھا — اب جدھر دیکھو۔ اُداسی کا سماں چھایا ہوا
۵ اب کسی دلچسپ نظارے سے دلچسپی ہیں — جس کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں وہ تماشا کیا ہوا
بس اب اے آزاد! چرخ و بخت کے شکوے فضول — صبر کر، جو کچھ ہوا، بہتر ہوا، اچھا ہوا

اوائل نومبر ۱۹۰۶ء۔ کانپور۔ طرح مشاعرہ منعقدہ مکانِ جناب اطہر کانپوری[1]

وہ یکایک دلِ مرحوم کا دھیان آ جانا — وہ اُداسی کا سماں چار طرف چھا جانا
لا کہ تجھ کو ترے اوصاف میں یکتا جانا — جس نے دیکھا ہی نہیں اُس نے تجھے کیا جانا
آپ اک چشمِ کرم پر بھی نہ مجبور ہوئے — ہم نے ہر رنج و مصیبت کو گوارا جانا

---

[1] سید احمد علی صاحب اطہر کانپوری وسط درجے کے شاعر تھے۔ زبان اچھی لکھتے تھے۔ مگر پڑھتے بہت خوب تھے۔ جب غزل پڑھتے تھے سارے مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ سُنا ہے کہ اُن کا انتقال ہوگیا ہے۔ خدا تعالےٰ غریقِ رحمت کرے۔ آزاد انصاری

وہ مرا شکرِ ستم کر کے پشیماں ہونا | وہ ترا عذرِ ستم اور وہ شرما جانا
پھر کوئی شخص بہ اُمیدِ کرم حاضر ہے | حسبِ عادت کہیں اغماض نہ فرما جانا
سچ تو یہ ہے کہ مری حسرتِ دیدار فضول | یعنی دشوار ترا آنکھ سے دیکھا جانا
آپ نے جور کو الطاف سے تعبیر کیا | ہم نے سودائے محبت کا نتیجا جانا
آپ نے یاس کو تقدیر سے منسوب کیا | ہم نے خبطِ نگہِ لطف کا ثمرا جانا
مدعا یہ ہے کہ پھر منتظرِ جور رہو | ہم نے جانا سببِ مہر و مدارا جانا
مختصر یہ ہے کہ تم جان کے بھی گاہک ہو | ہم نے جانا۔ نظرِ لطف کا منشا جانا
دیکھ۔ ظالم! ہمیں تشریح پہ مجبور نہ کر | جاننے والے نے جو کچھ تجھے جانا۔ جانا
مجھ کو میرا دلِ بے تاب نہ جینے دیگا | کچھ مرے ساتھ مرے دل کو بھی سمجھا جانا
شکوۂ غم بھی غلط۔ کلفتِ پیہم بھی غلط | ماحصل یہ ہے کہ تم نے ہمیں جھوٹا جانا
آہ! کس نے مجھے دنیا سے مٹانا چاہا | آہ! اس نے کہ جسے حاصلِ دنیا جانا
جب کہیں سے کوئی آوازِ المناک آئی | ہم نے اپنے دلِ مرحوم کا نوحا جانا
ولولے ٹھیک۔ مگر طاقتِ رفتار کہاں | آہ! کب منزلِ مقصود کا رستا جانا

قطعہ

وہ اچانک مری اُمید کا باطل ہونا ۱ وہ یکایک تری عادات کا بدلا جانا
وہ ترا غفلتِ جاوید کو جائز رکھنا ۲ وہ مرا حسرتِ تادیر سے اُکتا جانا
وہ طبیعت کی خرابی۔ وہ ہجومِ وحشت ۳ وہ پریشان خیالات۔ وہ بَولا جانا

وہ کمالِ غمِ فرقت، وہ اتمِ مایوسی ۴ وہ محبت کا خیال آتے ہی تھرّا جانا
اُف! تمنّا کا گلا اور تغافل کی چھری ۵ کچھ نہ جانا، جو تجھے جانِ تمنّا جانا

اے زہے رحم! کہ تو مائلِ انصاف ہوا
اے زہے لُطف! کہ آزاد کو بندا جانا

اواخر نومبر ۱۹۰۶ء۔ سہارنپور۔ برطرحِ مشاعرۂ منعقدۂ تحصیلی اسکول سہارنپور

نیم مُسلسل

آج دل سے ضبطِ غم کا حوصلا جاتا رہا
آج دل ہم سے گیا گذرا ہوا۔ جاتا رہا
اَلفِرَاق۔ اے فرصتِ عشق و محبت اَلفِرَاق
وہ اُمنگیں مٹ گئیں۔ وہ حوصلا جاتا رہا
اَلوِدَاع۔ اے آرزوئے چشمِ الفت اَلوِدَاع
وہ طبیعت مر گئی۔ وہ ولولہ جاتا رہا
آج تا حدِ نظر خوش رنگ منظر ہیں تو ہوں
جس سے دل چسپی تھی وہ رنگِ فضا جاتا رہا
آج سو سامانِ عشرت جلوہ گستر ہیں تو ہوں
اِک خوشی تھی چل بسی۔ اک لُطف تھا۔ جاتا رہا
عالمِ حسرت ہے۔ کیا مسرور ہوں، کیا شاد ہوں
جو بنائے شوق تھا وہ سلسلہ جاتا رہا
وحشتِ دل سے نہ گھبراؤں تو آخر کیا کروں
جس سے لُطفِ زیست تھا وہ مشغلہ جاتا رہا
ایک خوش وقتی کی صورت کیا مٹی۔ دل مر گیا
ایک دل کیا مر گیا۔ ہر حوصلا جاتا رہا
کام کیا بگڑا کہ دل صرفِ ہجومِ یاس ہے
آس کیا ٹوٹی کہ جینے کا مزا جاتا رہا
مغتنم ہے، اب کسی کی دشمنی بھی مغتنم
دوستی کا واسطہ جاتا رہا۔ جاتا رہا
جب خدا بخشے دلِ مرحوم کا دھیان آگیا
ہاتھ سے سرِ رشتۂ صبر و رضا جاتا رہا

حسرتِ دنیا و مافیہا نہ فکرِ عاقبت — دل سے ہر غم اک ترے غم کے سوا جاتا رہا

یا نشاطِ وصل تھی، سو عیش تھے سو لطف تھے — یا بہ استثنائے حسرت ہر مزا جاتا رہا

رحم کر اور در گذر فرما کہ لاگ اچھی نہیں — وہ تعلق مٹ چکا۔ وہ واسطا جاتا رہا

کیا کہوں۔ کیا چیز تھی، صہبا تھی یا اکسیر تھی — چار قطرِ دل میں غم ہر دوسرا جاتا رہا*

آہ! بالکل امتیازِ رطب و یابس اٹھ گیا — آہ! سارا غرۂ خُذْ مَا صَفَا جاتا رہا

مرحبا۔ اے دوستانِ باوفا! صد مرحبا — وہ وفائیں کیں کہ ارمانِ وفا جاتا رہا

اب تو آزاد ہے اور قیدِ افکارِ جہاں — اب وہ آزادی کا سچا ادعا جاتا رہا

اوائل ستمبر ۱۹۰۷ء۔ سہارنپور۔ بر طرح مشاعرہ منعقدہ مکان احقر

کیا کہوں۔ کیا بات تھی، کیوں مجھ کو دل پر ناز تھا — یار تھا۔ غمخوار تھا۔ ہمدرد تھا۔ ہمراز تھا

وائے بدبختی! کہ اب ہر طرح صرفِ یاس ہے — وہ کسی کا آسرا جو آج تک دمساز تھا

یا وہی کافر طبیعت ہے کہ قابو میں نہیں — یا یہی میری طبیعت تھی کہ مجھ کو ناز تھا

لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا کہ دم پر آبنی — اے جزاک اللہ! اچھا لطف کا انداز تھا

ہم کسی سے بات کیا کرتے کہ شرمِ ضبط تھی — ہم کسی سے درد کیا کہتے کہ دل کا راز تھا

آپ کے الطاف کیا تھے، جور کی تمہید تھی — آپ کی امید کیا تھی، یاس کا پرداز تھا

تیرے اندازِ ستم بھی لطف سے خالی نہیں — بیرخی کیا تھی کہ خاصا التفاتِ ناز تھا

چند روزہ کامرانی اتفاقی بات تھی۔ — بعد ازاں آزاد تھا اور ماتمِ ممتاز[1] تھا

---

[1] اہلیۂ مرحومہ ۔ آزاد انصاری

* دیکھو صفحہ (۴) حاشیہ (۱)

اواخر جنوری ۱۹۰۸ء۔ سہارنپور۔ طرحِ طبع زاد

کبھی مہرباں ہو کے دلشاد فرما / کبھی قدرِ خدماتِ آزاد فرما

اگر ہو سکے۔ بھول کر یاد فرما / اگر شاد فرما سکے۔ شاد فرما

کبھی اپنی موجودہ غفلت سے باز آ / کبھی اُلفتِ مامضےٰ یاد فرما

یہ خاموشیِ حیرت افزا کہاں تک / کچھ احباب کے حق میں ارشاد فرما

اسیرانِ اُلفت بہ تنگ آ چکے ہیں / جو خوفِ خُدا ہے تو آزاد فرما

کچھ احساسِ تکلیفِ شوقِ نہاں کر / کچھ اظہارِ دردِ خُداداد فرما

جو بر لا سکے، حاجتِ شوق بر لا / جو فرما سکے، فکرِ امداد فرما

ترے لُطفِ بے انتہا ہیں تو ہونگے / کبھی کوئی تشریحِ اعداد فرما

جہاں تک ہو، پامالِ جور و جفا کر / جہاں تک ہو، تکمیلِ بیداد فرما

کہاں تک، جنونِ تغافل کہاں تک / کچھ اِصلاحِ طبعِ خداداد فرما

کبھی شرطِ منصف مزاجی بجا لا / کبھی حقِ رسیہائے آزاد فرما

وسطِ مارچ ۱۹۰۸ء۔ سہارنپور۔ طرحِ طبع زاد

اُمیدِ جزا کب تک، اُمید سے کیا ہوگا / کچھ آج ہوا ہوگا، کچھ روزِ جزا ہوگا

کچھ بھید نہیں کھلتا، کیوں رحم کیا ہوگا / کیا سہو ہوا ہوگا، کیوں پوچھ لیا ہوگا

اغماض روا باشد۔ لیکن یہ سمجھ رکھئے / آگے بھی گلا ہوگا، پیچھے بھی گلا ہوگا

اِنصاف کے خوگر ہو، باور ہو تو کیونکر ہو / ہر جبر بجا ہوگا، ہر ظلم روا ہوگا

مبدل بھی ہوئی شاداں بھی، شاکی بھی ہوئی نازاں بھی
جو داغ دیا ہوگا، دل چھپ دیا ہوگا

ظاہر ہے کہ بیکس ہوں، ثابت ہے کہ بے بس ہوں
جو ظلم کیا ہوگا، برداشت کیا ہوگا

بدبخت سہی لیکن حقدارِ ترحم ہوں
جب صبر کیا ہوگا، صبر آ نہ سکا ہوگا

احساس قلق برحق، لیکن یہ گزارش بھی
جب رحم کیا ہوگا، جینے نہ دیا ہوگا

کیا حاصلِ غفلت، کچھ فکر تلافی کر
دل ٹوٹ گیا ہوگا، جی چھوٹ گیا ہوگا

تھا، جب سرِ عشرت تھا۔ زاں بعد قیمت تھا
ارمان الگ ہوں گے، افسوس جدا ہوگا

مجرم ہوں اور انصافاً شایانِ معافی ہوں
جب جرم کیا ہوگا، اقبال کیا ہوگا

تقصیر سے کیوں ہیچ کوں تعزیر سے کیوں جھجکوں
جو قبل خطا ہوگا۔ وہ بعدِ خطا ہوگا

جو ساکنِ ساحل ہیں، آسودۂ ساحل ہیں
جو ڈوب رہا ہوگا۔ وہ ڈوب رہا ہوگا

جو واقفِ منزل تھے، سب فائزِ منزل ہیں
جو چھوٹ گیا ہوگا۔ وہ چھوٹ گیا ہوگا

درویش ہیں ہم درویش، ہر ایک کے خیر اندیش
"دنیا کا بھلا چاہو، عقبےٰ کا بھلا ہوگا"

کوئی تو ہماری بھی فریاد کو پہنچے گا
کوئی تو ہمارا بھی عالم میں خدا ہوگا

آزاد کو جس تس نے دیکھا، یہ پکار اٹھا
"آزاد! کبھی تو بھی آزادِ بلا ہوگا"

آواخر نومبر ۱۹۰۸ء۔ کانپور۔ طرح طبع زاد

اے کاش! خبر ہوتی، تو دل سے بھلا دیگا
اے کاش! سمجھ سکتے، تو دل کے دغا دیگا

اک روز ترا سودا ہر خبط مٹا دے گا
اک روز ترا ملنا اللہ سے ملا دیگا

اک دن گلۂ غفلت سننے کو ترسیے گا
اک دن الم فرقت کچھ دیکے سلا دیگا

تم جبر کیے جاؤ، ہم صبر کیے جائیں — اللہ تو منصف ہے اللہ جزا دیگا

اُمیدِ سکوں رخصت، تسکینِ دروں رخصت — اب درد کی باری ہے اب درد مزا دیگا

اِک روز دلِ رہزن خود راہ نما ہوگا — اِک روز یہی دشمن، منزل کا پتا دیگا

درویش جب آ نکلے، آواز لگا نکلے — درویش کو بھی سمجھو، درویش دعا دیگا

آزادِ گدا مشرب! دنیا سے غرض مطلب؟ — کوئی ہمیں کیا دیگا، دیگا تو خدا دیگا

۱۰ / آخر مئی سنہ ۱۹۰۹ء۔ کانپور۔ بر طرحِ مشاعرۂ منعقدہ مکانِ مولوی (عبد الحق[1] صاحب عروج)

جو دل[2] لگانے کی حسرت ہے کر جگر پیدا — وہ حوصلے کہ جو پیدا نہیں ہیں، کر پیدا

کہاں جمالِ حقیقی، کہاں مری آنکھیں — خدا کرے تو کرے چشمِ حق نگر پیدا

نہ تو ہے اور نہ تیری تجلّیاں محدود — کہاں تک آنکھ کرے وسعتِ نظر پیدا

یہ کیا بنی! کہ بُری بن گئی طبیعت پر — یہ کیا ہوا، کہ ہوا شورِ الحذر پیدا

جسے زمانے میں سب عشق عشق کہتے ہیں — وہ آگ ہے کہ ہوئی دل کو پھونک کر پیدا

کبھی تو ساحلِ مقصود تک پہنچ جاتے — مگر نصیب، جدھر دیکھئے بھنور پیدا

ملی ہے اور نہ ملے فکرِ این و آں سے نجات — ہوئی ہے اور نہ ہو صورتِ مفر پیدا

---

[1] مولوی عبد الحق صاحب عروج کانپوری اُس زمانے کے سخت ہنگامہ پرور نوجوان شعراء میں تھے۔ فن سے ناواقف ہونے کے باوجود بہت سے شاگرد گھیر رکھے تھے۔ ذرا سی بات پر معاصر شعراء سے لڑ پڑتے تھے معمولی درجے کا کلام ہوتا تھا۔ اب خبر نہیں کیا کہتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ زندہ ہیں یا نہیں (آزاد انصاری)

[2] اِس غزل کی طرح میرے رنگ کی نہ تھی۔ احباب کے تقاضوں سے تنگ آ کر مجبوراً غزل لکھنی پڑی چنانچہ مقطع میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ آزاد انصاری

کہاں سے لاؤں مضامینِ آبدار آزادؔ | زمینِ خشک میں ہوں خاک شعرِ تر پیدا

اوائل جنوری ۱۹۱۲ء ۔ انبالہ چھاؤنی ۔ برطرحِ گلدستہ زبانِ اُردو[1] شاہجہان پور

بیشک دلِ عُشّاق شکیبا نہیں ہوتا	لیکن وہ محبت سے مُعرّا نہیں ہوتا
پھر رخصتِ اظہارِ غمِ شوق عطا کر	فریاد! کہ پھر ضبطِ تمنا نہیں ہوتا
تم اور دلِ آزاریٔ اربابِ محبّت	اربابِ محبت کا یہ شیوا نہیں ہوتا
ممکن ہے، جفا دخلِ انداز وادا ہو	تاہم یہ محبت کا تقاضا نہیں ہوتا
قُربانِ مقدّر! کہ ترا غم مجھے بخشا	ہر ایک کو یہ خبط ۔ یہ سودا نہیں ہوتا
افلاک سے بھی بارِ غمِ عشق نہ اُٹھا	ہر ایک کا یہہ دل، یہ کلیجا نہیں ہوتا
بیمارِ غمِ عشق شفا یاب نہ دیکھے	دل قائلِ اعجازِ مسیحا نہیں ہوتا
بیداد روا رکھ، مگر انصاف کر انصاف	اُمّیدِ ترحُّم کا یہ منشا نہیں ہوتا
اِک وہ ہیں کہ بے خوف و خطر گرمِ شکایات	اِک ہم ہیں کہ اظہارِ تمنّا نہیں ہوتا
اب مصلحت اِس میں ہے کہ قصہ ہی چکا دو	یوں خاتمۂ لذتِ ایذا نہیں ہوتا

آزادؔ! غمِ ہر دو جہاں تم کو مُبارک
ہم سے تو یہ خلجان گوارا نہیں ہوتا ۔

[1] گلدستہ زبان اُردو اُس زمانے کا اِک دلچسپ ماہانہ گلدستہ تھا جو محلہ قلعہ شہر شاہجہان پور سے شائع ہوتا تھا۔ تقریباً دو سال تک بہت خوبی و خوش اسلوبی سے شائع ہوتا رہا۔ اور بعد میں شاید مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ آزادؔ انصاری۔

اوائل جنوری ۱۹۱۸ء ـ انبالہ چھاؤنی برطرحِ مشاعرہ منعقدہ مکان منشی محمد اکبر خان صاحب اکبر حیدری[1]

آج دل میں اثرِ اُلفت کامل دیکھا
آج دل کو ترے ارمان کے قابل دیکھا

دونوں عالم کی خوشی نذرِ نظر کر بیٹھا
آپ نے بندۂ درگاہ کا بھی دل دیکھا

ہم نے پایا بھی تو اک درد بھرا دل پایا
ہم نے دیکھا بھی تو یہ زیست کا حاصل دیکھا

طلبِ دوست کے صدقے کہ زباں کو دن رات
دوست کے نام کی تسبیح میں شاغل دیکھا

ہم تو محتاج ہیں، شاہوں کو گدا بن بن کر
تیری سرکارِ گدا دوست میں سائل دیکھا

ساقیٔ بزم! ترا جام بہ کف آنا تھا
بزم کی بزم کا ایماں متزلزل دیکھا

بحرِ اُلفت متلاطم ہے تو ہو ـ کیا پروا
اب خدا چاہے تو نظارۂ ساحل دیکھا

جس قدر درد بڑھا، رنگِ ایمن ڈوبا
مرضِ عشق کو خود چارہ گرِ دل دیکھا

شکر صد شکر، صعوباتِ سفر ختم ہوئیں
اور آنکھوں سے جمالِ رخِ منزل دیکھا

عشقِ اصنام بھی ہے، دعویٔ اسلام بھی ہے
تم کو آزادؔ! عجب مرشدِ کامل دیکھا

---

[1] پروفیسر محمد اکبر خان صاحب اکبر حیدری ساکن انبالہ چھاؤنی حال مقیم دہلی عمر ۲۵ سال۔ ملک کے اُن مشہور اور ممتاز نوجوانوں میں ہیں جن کو کسی زبان کے ادب شعر کی خوش قسمتی اپنی معزز خدمت کیلئے چُن لیا کرتی ہے۔ آپ شاعر بھی ہیں اور شاعر گر بھی ـ آپ ادیب بھی ہیں اور ادب نواز بھی۔ آپ کو نظم پر بھی اک خاص قدرت حاصل ہے۔ اور نثر پر بھی ـ آپ کا پہلا مجموعہ نظم "روحِ جذبات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شعر کو عام شاہراہ سے ہٹ کر اک خاص انداز میں ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یہ ظاہر کرکے مسرت معلوم ہوتی ہے کہ آپ ایک کافی عرصہ تک فنِ شعر میں مجھ سے بُرا بھلا مشورہ حاصل کرتے رہے ہیں۔

آزاد انصاری

اواخرِ اگست سنہ ۱۹۱۹ء - علی گڈھ - برطرح مشاعرۂ ٹونڈلہ - منجانب حضرت سیمابؔ

کونسا خورشیدِ طلعت جلوہ گستر ہوگیا
ساری دُنیا کا سیہ خانہ منوّر ہوگیا

کس کے جلوے کی جھلک نے میری آنکھیں کھول دیں
ذرہ ذرہ غیرتِ خورشیدِ خاور ہوگیا

پھر اچانک وحشتِ دل سوئے صحرا لے چلی
پھر ہمارا کاروبارِ شوق ابتر ہوگیا

پھر اُٹھی، گردِ ہجومِ یاس دل سے پھر اُٹھی
پھر مری اُمید کا مطلع مکدّر ہوگیا

اب اگر تم مجھ سے خوش بھی ہو تو مجھ کو کیا خوشی
غم مری قسمت، الم میرا مقدر ہوگیا

آفریں! اچھی مسیحائی دکھائی آفریں!!
زندگی تو زندگی مرنا بھی دوبھر ہوگیا

اب اُنھیں سوجھی کہ درمانِ غمِ اُلفت کریں
جب غمِ اُلفت غذائے روح پرور ہوگیا

لاکھ جائیں تیری تکلیفِ عیادت کے نثار
دردِ درماں ہے، مرض صحت سے بڑھ کر ہوگیا

آج وہ دن ہے کہ اک ساقی کے دستِ خاص سے
پی اور اتنی پی کہ میں حقدارِ کوثر ہوگیا

کس نے تا منزل رفاقت کی، طلب کے شوق نے
کون رہبر ہوگیا، اللہ رہبر ہوگیا

عام ہے، فیضانِ آزادِ خدا آگاہ عام
جو عقیدت سے مِلا، مقبولِ داور ہوگیا

مولانا عاشق حسین صاحب سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی عمر دہ سال جدید ترقی یافتہ دَور کے مشہور و معروف شاعر بھی ہیں اور علامہ بھی۔ آپ ناظم بھی ہیں اور ناثر بھی۔ نثر ہو یا نظم۔ آپ کے اندازِ بیان سے جابجا آپکی مخصوص طباعی اور ممتاز ترذہانت و جدت ٹپکتی نظر آتی ہے۔ آپ اب سے دس بارہ سال پہلے بمقام ٹونڈلا ایسٹ انڈین ریلوے کے دفتر میں ملازم تھے۔ مگر یہ شغل آپکی طبیعت کے بالکل منافی تھا لہذا استعفٰے دیدیا اور ہمہ تن خدمتِ ادب و شعر میں مشغول ہوگئے۔ اب آپ کا یہی محبوب مشغلہ بھی ہے اور یہی ذریعہ معاش بھی۔ اسی ادبی انہماک و تبلیغ کی بدولت آپنے چند ہی روز میں اپنا حلقہ تلامذہ بھی خاصا وسیع کرلیا ہے۔ اور اپنی دستارِ فضیلت کو طرۂ علامگی سے مزین کیا۔ اللّٰھُمَّ زِد فزد۔ آزاد انصاری۔

وسط اپریل سنہ ۱۹۲۰ء ۔ علی گڈھ ۔ برطرح مشاعرۂ ٹونڈلہ منجانب حضرت سیماب اکبر آبادی

مسلسل

وہ ترا[لہ] روزِ ازل گرمِ تماشا ہونا — وہ مرا پہلے پہل تجھ سے شناسا ہونا

وہ ترا پردۂ تفرید سے باہر آنا — وہ مرا سُرمۂ توحید سے بینا ہونا

وہ ترا ساغرِ صہبائے محبت دینا — وہ مرا مستِ مئے شوق و تمنا ہونا

وہ ترا باہمہ انداز مرا دل لینا — وہ مرا بادل و جان عاشقِ شیدا ہونا

وہ ترا حاضر و غائب مرے آگے رہنا — وہ مرا ظاہر و باطن متجلّے ہونا

وہ مرا کُل ترے اوصاف میں تجھ سے ملنا — وہ مرا کُل تری مخلوق میں تجھ سا ہونا

وہ ترا کوششِ ہر مہر و مدارا کرنا — وہ مرا قابلِ ہر نعمتِ عظمےٰ ہونا

بعد ازاں میری تباہی کا زمانہ آنا — اور کُل عالمِ راحت تہ و بالا ہونا

وہ ترا میرے مقدر کی طرح پھر جانا — وہ مرا راندۂ درگاہِ معلّےٰ ہونا

وہ ترا مجھ کو نگاہوں سے گرا کر چھپنا — وہ مرا قعرِ مذلّت میں ٹھکانا ہونا

وہ ترا اُٹھ کے پھر مجھ سے مکدر رہنا — وہ مرا خاک بسر بادیہ پیما ہونا

وہ مرا دم تری فرقت سے لبوں پر آنا — وہ ترا غم مری صورت سے ہویدا ہونا

وہ ترا جوشِ غضب اور زیادہ بڑھنا — وہ مرا ذوقِ طلب اور دوبالا ہونا

[لہ] یہ غزل محبت کی اولین سرگزشت کی سرخی سے رسالہ ہمایوں میں شائع ہو چکی ہے ۔ آزاد انصاری

وہ ترا میرے لئے جبرِ مجسّم بننا ‏ ‏ وہ مرا تیرے لئے صبرِ سراپا ہونا

وہ بالآخر ترے دل کا سوئے نرمی آنا ‏ ‏ وہ بالآخر مری تقدیر کا سیدھا ہونا
وہ ترا قلب مری آہ سے ہل ہل جانا ‏ ‏ وہ مرا درد ترے دل میں بھی پیدا ہونا
وہ ترا غفلتِ پیہم سے کنارہ کرنا ‏ ‏ وہ مرا غم مجھے فی الجملہ گوارا ہونا
وہ ترا وعدۂ فردا سے تسلّی دینا ‏ ‏ وہ مرا بادلِ ناشاد شکیبا ہونا
وہ ترا اپنی مدد سے مجھے تھامے رکھنا ‏ ‏ وہ مرا تیری معیت سے توانا ہونا

آخرِ کار ترا رشکِ مسیحا بننا ‏ ‏ آخرِ کار مرے دُکھ کا مداوا ہونا
وہ ہمیشہ کو ترا کارکشا بن جانا ‏ ‏ وہ ہمیشہ کو مرا عقدۂ دل وا ہونا
وہ ترا عالمِ باقی سے طلب فرمانا ‏ ‏ وہ مرا عالمِ فانی سے روانہ ہونا
وہ ترا مُستترِ دامنِ رحمت کرنا ‏ ‏ وہ مرا منجذبِ مرکزِ اعلےٰ ہونا
وہ ترا اپنے یمِ ذات میں گُم کرلینا ‏ ‏ وہ مرا قطرۂ ناچیز سے دریا ہونا
وہ مرا اور ترا ایک دل و یک جاں بننا ‏ ‏ وہ مرا اور ترا "لَا یَتَجَزّا" ہونا
ماحصل یہ کہ بڑی ذات ہے ذاتِ باری ‏ ‏ مختصر یہ کہ بڑی بات ہے بندا ہونا

اگر آزاد تمہیں دعوئ آزادی ہے
پہلے کچھ سوچ لو، پھر بندۂ دنیا ہونا

اوائل اگست ۱۹۲۲ء - دہلی - برطرحِ مشاعرۂ دین و دنیا منعقدۂ مکان

لالہ پارس داس صاحب خزانچی - دہلی

میں ہوش کھو کے مالکِ دنیائے ہوش تھا — یعنی ترے لئے ہمہ تن چشم و گوش تھا

اے تابِ دیدِ واقعۂ دید کیا سنوں — پہلے تو یہ بتا - تجھے اپنا بھی ہوش تھا

اب بے خودی کی نذرِ محقر قبول کر — وہ دن گئے کہ حوصلۂ عرضِ ہوش تھا

کیا چیز تھا کسی کا غمِ عشق، کیا کہوں — اک نیش تھا کہ دل کے لئے رشکِ نوش تھا

دل کارزارِ عشق میں یوں جی نہ ہارتا — لیکن غریب بارِ دو عالم بہ دوش تھا

میں بدنصیبِ دادِ وفا کس سے چاہتا — قسمت سے لطفِ دوست بھی بیداد کوش تھا

ظالم! تری نگاہ کا پہلا پیامِ لطف — گویا پیامِ خاتمۂ عقل و ہوش تھا

دورِ بہارِ عالمِ جاناں نہ کیا کہوں — اک جلوہ تھا کہ آٹھ پہر گل فروش تھا

دیوانہ تھا ؟ کہ سعیٔ طلب چھوڑ بیٹھتا — دل کی صدا میں رنگِ صدائے سروش تھا

اخفائے رازِ جور ہماری خطا نہ تھی — ظالم خیالِ پاسِ وفا پردہ پوش تھا

صرف اس قدر تو یاد ہے، اک تیر سی لگی — بس اس کے بعد ہم کو خبر تھی نہ ہوش تھا

قطعہ[2]

بطرزِ ترصیعِ جدید[1]

ہاں یاد ہے، وہ دورِ طرب اب بھی یاد ہے — ۱ — جس دور میں نشاطِ حقیقی کا جوش تھا

ہاں یاد ہے، وہ عہدِ عجب اب بھی یاد ہے — ۲ — جس عہد میں ربابِ غم و ہم خموش تھا

[1] دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱) [2] یہ قطعہ انجامِ عیش کی سرخی سے اخبارِ فتح دہلی میں شائع ہو چکا ہے

آزاد انصاری

وہ وہ پری رُخانِ خوش آواز جمع تھے ۳ جن کا کمال دلکشِ ہر شمع و گوش تھا

وہ وہ سہی قدانِ سرافراز جمع تھے ۴ جن کا جمال رہزنِ ہر عقل و ہوش تھا

جو صبح تھی وہ رنگِ تجلی کا شرق تھی ۵ جو رنگ تھا وہ حُلّۂ انوار پوش تھا

جو شام تھی وہ کیفِ مسرت میں غرق تھی ۶ جو کیف تھا وہ بادۂ عشرت فروش تھا

وہ عالمِ بہار عجب تھا کہ رات دن ۷ جو تھا وہ محوِ مشغلۂ نائے و نوش تھا

وہ انہماکِ جوشِ طرب تھا کہ رات دن ۸ جو تھا وہ صرفِ عیش طلب عیش کوش تھا

سب بے ہراس نغمہ نوازِ نشاط تھے ۹ ساقی خموش تھا نہ مغنّی خموش تھا

سب بے دریغ منہمکِ انبساط تھے ۱۰ مرنے کی فرصتیں تھیں نہ جینے کا ہوش تھا

لیکن مآلِ عشرتِ پیہم نہ پوچھئے ۱۱ کچھ روز بعد خاتمۂ عہدِ جوش تھا

پھر کیا ہوا یہ واقعۂ غم نہ پوچھئے ۱۲ پھر وہ نشاطِ چشم نہ وہ عیشِ گوش تھا

یا ہم تھے اور روشنیٔ عیش دائمی ۱۳ جس سے ظہورِ جلوۂ جوش و خروش تھا

یا عمر بھر کو روشنیٔ عیش یوں مٹی ۱۴ گویا چراغِ عیش چراغِ خموش تھا

آزاد کیا حقیقتاً آزاد تھا؟ غلط

سب جانتے ہیں حلقۂ الفت بہ گوش تھا

وسط دسمبر ۱۹۲۲ء - دہلی - برطرح مشاعرۂ سالانہ بزم سخن بمن جانب پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی[۵] - واقع محلہ کونڈہ والا[۱]

مسلسل - بہ طرز ترصیع جدید[۲]

ایک دن ہر ساز سرتاپا صدا ہو جائیگا ۔۔۔ ایک دن ہر راز برملا ہو جائیگا

ایک دن ہر جزو و کل کا امتیاز اُٹھ جائیگا ۔۔۔ ایک دن ہر قطرہ دریا میں فنا ہو جائیگا

ایک دن ہر خار و گل کا اِمتیاز اُٹھ جائیگا ۔۔۔ ایک دن ہر ذرّہ مہر جلوہ نما ہو جائیگا

ایک دن ہر رنج راحت انتما بن جائیگا ۔۔۔ ایک دن ہر دکھ ہم آغوش دوا ہو جائیگا

ایک دن ہر قہر لطفِ جاں فزا بن جائیگا ۔۔۔ ایک دن ہر زہر تریاقِ شفا ہو جائیگا

ایک دن ہر ساز سے اُس کی صدائیں آئیں گی ۔۔۔ ایک دن نغمات کا طوفاں بپا ہو جائیگا

ایک دن ہر سمت آنکھیں اُس کو پیدا پائیں گی ۔۔۔ ایک دن چاروں طرف سجدہ روا ہو جائیگا

ایک دن ہر بابِ الطافِ کرم کھل جائیگا ۔۔۔ ایک دن ہر رُوک ہٹ کر راستا ہو جائیگا

ایک دن ہر لن ترانی کا بھرم کھل جائیگا ۔۔۔ ایک دن ہر پردہ اُٹھ کر سامنا ہو جائیگا

ایک دن ہر دوری فانی کے غم مٹ جائیں گے ۔۔۔ ایک دن ہر صدمہ باقی فنا ہو جائیگا

ایک دن ہر بُعدِ جسمانی کے غم مٹ جائیں گے ۔۔۔ ایک دن ہر قربِ روحانی عطا ہو جائیگا

دیکھو صفحہ ۱-۹ حاشیہ (۱) ۵ دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

ایک دن تقدیر بالکل راہ پر آجائیگی | ایک دن بختِ رسا بختِ رسا ہو جائیگا
ماحصل یہ ہے کہ ہر اُمید بر آجائیگی | مختصر یہ ہے کہ ہر فضلِ خدا ہو جائیگا

بس اب اے آزادؔ تصریحِ مزید اچھی نہیں | جا اور اطمینان رکھ، جو کہہ دیا - ہو جائیگا

اوائلِ فروری ۱۹۲۳ء - دہلی - بہ طرحِ مشاعرۂ "دین و دنیا" - منجانب کارپردازان "دین و دنیا"

مسلسل بہ طرزِ ترصیع جدید[1]

وہ تیرا دل میں رہ کر آنکھ سے مستور ہو جانا | وہ میرا باوجودِ قرب تجھ سے دور ہو جانا

وہ تیرا میرے ضبطِ غم کی قدرت لیکے چل دینا | وہ میرا رنگِ رخسارِ خوشی کافور ہو جانا
وہ تیرا میرے دل کو داغِ فرقت دیکے چل دینا | وہ میرا داغ زخم اور زخم سے ناسور ہو جانا

وہ تیرا میری اُمیدوں کو بیدردی سے ٹھکرانا | وہ میرا شیشۂ دل سنگِ غم سے چور ہو جانا
وہ تیرا جور پر تاکیدِ شکرِ جور فرمانا | وہ میرا امتثالِ امر سے معذور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر مژدۂ یاسِ وفا دینا | وہ میری غم نصیب اُمید کا مسرور ہو جانا
وہ تیرا مجھ کو آخر اپنی منزل کا پتا دینا | وہ میری جد و جہدِ شوق کا مشکور ہو جانا

---

[1] دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

وہ تیرا مجھ کو باصد طلعتِ دلبر نظر آنا — وہ میرا نذرِ عقل و ہوش پر مجبور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو باصد حسنِ افسوں گر نظر آنا — وہ میرا دیکھنا اور دیکھ کر مسحور ہو جانا

وہ تیرا برخلافِ پاسِ ضبطِ راز کھل پڑنا — وہ میرا قصہ عینِ قصۂ منصور ہو جانا

وہ تیرا باہزاراں برق زا انداز کھل پڑنا — وہ میرا حال رشکِ حالِ کوہِ طور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو پیہم بادۂ "لاتقنطوا" دینا — وہ میرا ہر مئے امید سے مخمور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو ہر دم ساغرِ ہر آرزو دینا — وہ میرا ہر تمنا کے نشے میں چور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنے درد کی دولت عطا کرنا — وہ میرے دامنِ امید کا بھرپور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنی "لم یزل" الفت عطا کرنا — وہ میرا سرمدی تسکین سے معمور ہو جانا

وہ تیرا اپنی الفت کا مجھے کافی صلا دینا — وہ میرا اپنی محنت سے سوا ماجور ہو جانا

وہ تیرا اپنی رحمت سے مجھے کامل جزا دینا — وہ میرا زمرۂ عشاق میں محشور ہو جانا

خوشا آزاد کا فیضانِ صحبت، جس نے سمجھایا — خدا کا قرب کیا شے ہے۔ خودی سے دور ہو جانا

---

[1] اواخر فروری ۱۹۲۴ء حیدرآباد دکن برطرح مشاعرۂ منعقدۂ مکان سید کاظم علی صاحب بلند باغ

ساحل ہوں سعیِ قدرتِ پروردگار کا — حامل ہوں دردِ دل کی امانت کے بار کا

[1] نوٹ صفحہ (۳۰) پر تحریر ہے۔

اعجاز دیکھئے نگہِ لطفِ یار کا
خوگر بنا دیا ستمِ بے شمار کا

للہ قصدِ ترکِ محبت سے درگزر
دل ٹوٹ جائیگا کسی امیدوار کا

للہ نقضِ عہد کی حرکت سے درگزر
جی چھوٹ جائیگا نگہِ انتظار کا

یک لخت دل کا رازِ نہاں فاش کر دیا
یارب! برا ہو نالۂ بے اختیار کا

آباد گھر کو غیرتِ صحرا بنا دیا
خانہ خراب خاطرِ وحشت شعار کا

اب وعدۂ وصال کی تکلیف بے محل
وہ دن گئے کہ حوصلہ تھا انتظار کا

ہر آرزو بر آئی مگر صد ہزار حیف
ارمان رہ گیا نگہِ لطفِ یار کا

صبر و سکوں کو صبر نہ کر لوں تو کیا کروں
صبر اختیار کا نہ سکوں اختیار کا

عالم میں باغ باغ ہیں گل گل میں رنگ و بو
اللہ رے جمال کسی گل عذار کا

جو خاک بن چکا ہو وہ کیا سر اٹھا سکے
پیسا ہوا ہوں گردشِ لیل و نہار کا

پھر تلخیِ غمِ دو جہاں حد سے بڑھ چلی
ساقی! پھر ایک جام مئے خوشگوار کا

آزاد! وجہِ بے خودیِ دمبدم نہ پوچھ
اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

(نوٹ صفحہ ۳۰) مولوی سید کاظم علی صاحب باغ علیگڈھی۔ حال مقیم حیدر آباد دکن حضرت فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔ گو آپ کا رنگِ سخن قدیم طرز کا ہے۔ مگر آپ کے کلام میں لطفِ زبان کافی حد تک پایا جاتا ہے۔ آپ کی طبیعت خدمت ادب و شعر کی بیحد دلدادہ واقع ہوئی ہے۔ اور آپ کی فرصت کا بڑا حصہ اسی دلچسپ شغل میں بسر ہوتا ہے جب خاکسار اوائل اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء میں وارد حیدر آباد ہوا تو شعرائے دکن میں سے سب سے پہلے آپ سے ہی تعارف کی عزت حاصل ہوسکی تھی۔ اور آپ کی بدولت دیگر باکمال شعرائے دکن سے۔ اس لئے کہ آپ کو بزم مشاعرہ ترتیب دینے اور اس کو دلچسپ بنانے میں خاص سلیقہ حاصل ہے۔
آزاد

وسطِ اگست ۱۹۲۵ء - حیدرآباد دکن - برطرح مشاعرۂ منعقدہ مکان
سید کاظم علی[1] صاحب باغ - اندرونِ دروازۂ چادرگھاٹ

یہ مانا، ہم نے تم کو ایک حد تک خاص کر جانا
مگر کیا جس قدر ارمانِ دل تھا اُس قدر جانا؟

نہ اس کو مقتدر مانا، نہ اُس کو مفتخر جانا
تمھیں کو عمر بھر مانا تمھیں کو عمر بھر جانا

وہ تیری آرزو میں زیست کا ہر عیش تج دینا
وہ تیری جستجو میں لامکاں سے بھی اُدھر جانا

مری قسمت، کہ میں نے تم سے راہ و رسم پیدا کی
مری شامت کہ میں نے تم کو منظورِ نظر جانا

اگر جانا ہی تھا، جاتے مگر اتنا بتا جاتے
یہ آنا ہے تو کیا آنا، اِدھر آنا، اُدھر جانا

وہ اک حیرت فزا ساعت، وہ اک بالکل نئی حالت
وہ اک جلوہ نظر آنا، وہ اک عالم گزر جانا

تمھارا ماننا طاقت سے باہر تھا، مگر مانا
تمھارا جاننا امکان سے خارج تھا، مگر جانا

جو شوقِ زیست ہے۔ یوں ہی کچھ خوفِ مرگ مٹ جائے
یہ جینا کون جینا ہے کہ جینا اور مر جانا

جو ممکن ہو بہ ذاتِ خود ہمارا فیصلہ کرنا
نہ اِس کی بات پر جانا، نہ اُس کی بات پر جانا

ہمیشہ غم نصیب آزاد نے تیری خوشی چاہی
ہمیشہ راحتِ دنیا کو "ممنوعہ شجر" جانا

اوائل ستمبر ۱۹۲۵ء - حیدرآباد دکن - برطرح مشاعرۂ منعقدہ مکان
سید کاظم علی صاحب باغ - واقع اندرونِ دروازۂ چادرگھاٹ

مسلسل بہ طرزِ ترصیع جدید[2]

[3] وہ پھر تیرے جنونِ شوق کا حد سے گزر جانا
وہ پھر میرے سکونِ دل کا شیرازہ بکھر جانا

---

[1] دیکھو صفحہ (۳۰) حاشیہ (۲) [2] دیکھو صفحہ (۴) حاشیہ (۱)
[3] یہ غزل "محبت کی دوسری سرگزشت" کے عنوان سے رسالۂ "ہمایوں" لاہور میں شائع ہو چکی ہے۔

وہ پھر مجھ کو ترا با طلعتِ قاتل نظر آنا — وہ پھر تیرا چھری لیکر مرے دل میں اُتر جانا
وہ پھر تیرا کٹاری باندھ کر سینے میں دَر آنا — وہ پھر تیرا سنان بن کر کلیجے سے گزر جانا

وہ پھر میرا تری پہلی نظر میں تلملا اُٹھنا — وہ پھر تیری نظر کا گھاؤ دل سے تا جگر جانا
وہ پھر میرے دلِ مظلوم سے شورِ بکا اُٹھنا — وہ پھر تیرا مجھے اُلٹی چھری سے ذبح کر جانا

وہ پھر تیرا ستم کرنا، وہ پھر تیرا غضب ڈھانا — وہ پھر میرا دل و دین چھین لینا اور مکر جانا
وہ پھر تیرے خمِ زلفِ دوتا کا داؤں چل جانا — وہ پھر میرے دلِ آزاد کی بازی کا ہر جانا

وہ پھر تیرا مری رگ رگ میں خونِ شوق دوڑانا — وہ پھر میری تمنّاؤں کا رنگِ رُخ نکھر جانا
وہ پھر تیرا مری ٹوٹی ہوئی اُمّید بندھوانا — وہ پھر میرے دلِ خالی کا ارمانوں سے بھر جانا

وہ پھر تیرے تعشّق کا مجھے دُونا نشہ چڑھنا — وہ پھر تیرے تعلّق کا جنونِ وَ نا اُبھر جانا
وہ پھر تیری محبت کا ہزاروں رنگ سے بڑھنا — وہ پھر تیری تمنّا کا ہزاروں گُل کتر جانا

وہ پھر تیرا مجھے اپنے کرم سے ہوش میں لانا — وہ پھر میرا خمارِ بادۂ غفلت اُتر جانا
وہ پھر تیرا مرے جذباتِ اُلفت جوش میں لانا — وہ پھر تیرا مری مُردہ طبیعت زندہ کر جانا

وہ پھر تیرا مجھے اک خاص بیتابی عطا کرنا — وہ پھر میرے دلِ بے حِس کی حالت کا سُدھر جانا
وہ پھر تیرا مجھے ماسُوَا خوف ماسوا کرنا — وہ پھر میری طبیعت کا سکوں پانا ٹھہر جانا

وہ پھر آزاد کو ہر قید سے آزادیاں ملنی — وہ پھر آزاد کے بگڑے مقدر کا سنور جانا

اوائل ستمبر ۱۹۲۶ء - حیدرآباد دکن - برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان حضرت شیخ ضامن کنتوری

مُسلسل

پھر تقاضائے نظر سلسلہ جُنباں ہوگا
پھر تماشائے بہار رخ جاناں ہوگا

پھر غم دوست کے آنے کی خبر پہونچی ہے
پھر وہی خانۂ دل اور وہی مہماں ہوگا

پھر سکوں عالم وحشت سے بدل جائیگا
پھر جنوں گرم تقاضائے بیاباں ہوگا

پھر نڈر عرصۂ اُلفت میں قدم رکھوں گا
پھر وہی پائے ثبات اور وہی میداں ہوگا

پھر وہی نغمۂ دل دوز وفا چھیڑوں گا
پھر وہی زخمہ، وہی تار رگ جاں ہوگا

پھر وہی دل میں غم عشق کی رو دوڑے گی
پھر وہی شوق کے جذبات میں ہیجاں ہوگا

پھر تعشق کا جُنوں اور سوا اُبھرے گا
پھر تعلّق میں غلو اور دوچنداں ہوگا

پھر نئے سر سے محبت کے مزے آئیں گے
پھر نیا سلسلۂ حسرت و ارماں ہوگا

مولوی سید محمد ضامن صاحب ضامن ساکن کنتور ضلع بارہ بنکی حال مقیم حیدرآباد دکن اُن نازک خیال اور بلند فکر شعرا میں سے ہیں جو کسی زبان کی خوش قسمتی سے اس کو صدیوں بعد نصیب ہوتے ہیں۔ آپ کی علمی دستگاہ۔ آپ کی نازک خیالی۔ اور آپ کی فکر بلند نے آپ کی پنجاہ سالہ مشق اور مخصوص انداز بیاں سے مل کر آپ کو شعر کے بلند ترین مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔ بعض احباب کا خیال ہے کہ آپکا کلام بے حد ابہام و اغلاق کا حامل ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپکے خیالات اور آپ کا انداز بیان اس قدر بلند ہے جہاں تمام عام اذہان دفعتاً نہیں پہونچ سکتے۔ لیکن جب ذرا غائر نظر ڈالی جاتی ہے تو اوسط درجہ کا مذاق سخن رکھنے والا انسان بھی اُس کی دلچسپیوں میں کھو جاتا ہے۔ آپنے اپنی عمر کا بڑا حصہ حیدرآباد ہی میں گزارا ہے۔ یہیں ملازمت کی ہے اور اب پنشن پا رہے ہیں۔ آپ صاحب دیوان ہیں۔ آپکا پہلا دیوان عرصہ ہوا "ترنگ خیال" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ مگر دوسرا دیوان جو تمامتر زمانۂ پختگی کے کلام پر مشتمل ہے ہنوز شایع نہیں ہوا۔ اگر اردو کی خوش قسمتی سے وہ کسی وقت شایع ہو گیا تو معلوم ہو سکے گا ہمارے ادب میں کس قدر بلند اور بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ جب سے میں وارد حیدرآباد ہوا ہوں مجھے آپ کی خدمت میں اکثر ہی شرف نیاز حاصل ہے۔

آزاد

پھر کوئی غیرتِ گلزارِ جہاں دل لے گا | پھر مقدّرِ گُل مقصود بہ داماں ہوگا
پھر گلستانِ محبت میں بہار آئے گی | پھر شبستانِ تمنا میں چراغاں ہوگا
پھر تمنائے حزیں سازِ طرب چھیڑے گی | پھر دلِ غمزدہ خوش ہو کے غزلخواں ہوگا
پھر لبِ اظہارِ غمِ شوق کے گُر سیکھیں گے | پھر دل اسرارِ محبت کا زباں داں ہوگا
پھر مرا دُکھ مجھے تسکین دوا بخشے گا | پھر مرا درد مجھے غیرتِ درماں ہوگا
پھر مری طبع مجھے کُفر کی دعوت دے گی | پھر مرا کفر مجھے دولتِ ایماں ہوگا
پھر اُمیدِ کرمِ یار میں خوش گزرے گی | پھر علاج ستمِ گردشِ دوراں ہوگا
پھر تمنائے سکوں شکلِ سکوں دیکھے گی | پھر مداوائے خیالاتِ پریشاں ہوگا
پھر مجھے فکرِ دو عالم سے نجاتیں ہوں گی | پھر مجھے زیست کا ہر مرحلہ آساں ہوگا
غلط، آزاد! ترے دل کے یہ شبہات غلط | مطمئن ہوں کہ مرے درد کا درماں ہوگا

اواخر جولائی ۱۹۳۷ء - حیدرآباد دکن - برطرح مشاعرۂ منعقدۂ مکانِ مکرمی سید عبدالرزاق صاحب[1] مددگار صدر محاسبی سرکار عالی

شکر ہے کہ دل دے کر یارِ دلرُبا پایا | یعنی جس قدر کھویا اُس سے کچھ سوا پایا
خنجرِ فنا کھا کر ثمرۂ بقا پایا | زیست کی بنا ڈھا کر زیست کا مزا پایا
جس نے ہر دو عالم کو چشمِ غور سے دیکھا | اُس نے ہر دو عالم سے تم کو ماورا پایا

[1] جناب مولوی سید عبدالرزاق صاحب راشد مددگار صدر محاسبی سرکار عالی حیدرآباد دکن عمر قریباً ۴۸ سال اُن بلند پایہ اور بے نظیر ادیبوں میں ہیں جن کی ذات پر کسی زبان کا ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ آپ شعر بہت کم کہتے ہیں۔ مگر جب کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں بہت خوب کہتے ہیں۔ (باقی نوٹ صفحہ ۳۵ پر ہے)

ہم نے بے نشاں ہو کر آپ کا نشاں ڈھونڈا ہم نے آپ کو کھو کر آپ کا پتا پایا

شاد رہ کے بھی شاکر، رنج سہہ کے بھی شاکر بندۂ محبت کو بندۂ رضا پایا

ہم کو بتکدے میں بھی شانِ حق نظر آئی ہم نے بتکدے کو بھی خانۂ خدا پایا

صرف اک غمِ الفت وجہِ صد خوشی دیکھا ورنہ ہر تعلق کو رنج و غم فزا پایا

ہاں متاعِ راحت بھی قیمتی ہے سہی لیکن جنسِ دردِ الفت کو جنسِ بے بہا پایا

اے ندیمِ دُور اندیش! میں نے عشقِ جاناں میں یہ نہ پوچھ، کیا کھویا۔ اِس کو دیکھ، کیا پایا

اس میں شک نہیں آزادؔ شوخ بھی ہے منہ پھٹ بھی کچھ سہی، مگر اُس کو آدمی کھرا پایا

اوائل فروری سنہ ۱۹۲۹ء۔ حیدر آباد دکن۔ بر مصرعِ طرحِ رسالۂ "مشاعرہ" حیدر آباد دکن

مسلسل

"سرسبز پھر بہار سے سارا چمن ہوا"[1] معمورِ جلوۂ گل و سرو و سمن ہوا

پھر حکم، میکشیٔ مسرت کا عام ہے پھر اذنِ چارۂ غم و رنج و محن ہوا

(نوٹ صفحہ ۳۴) آپ عدیم المثال اردو کے نثار ہیں۔ آپ کی نثر کا مرتبہ نظم سے بلند ہے۔ اور اِس قدر بلند کہ جہاں آپ اپنے معاصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال کے اردو مجموعۂ کلام پر جو آپ نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے اُس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اردو کے صرف اک بلند پایہ ادیب ہی نہیں بلکہ فنِ نقد و تبصرہ میں بھی آپ کو قابلیتِ تامّہ حاصل ہے۔ اواخر سنہ ۱۹۲۳ء سے جب سے کہ میں حیدر آباد آیا ہوں مجھے آپ کی خدمت میں نیاز خصوصی حاصل ہے۔ اور اگر میں یہ ظاہر نہ کردوں تو احسان فراموشی ہوگی کہ جب میں نے حیدر آباد میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا تو سب سے اول اور سب سے زیادہ آپ ہی نے مجھ کو ذرائع حصولِ معاش میں مفید مشورے دے کر میری ہر قسم کی امداد و اعانت فرمائی ورنہ حیدر آباد میں میرا قیام مشکل تھا۔ آزاد انصاری۔

[1] یہ مصرع رسالۂ "مشاعرہ" (جو سنہ ۱۹۲۹ء میں چند روز کے لئے بلدۂ حیدر آباد دکن سے شائع ہو کر بند ہو گیا) کا مصرعِ طرح تھا۔ خاکسار نے اسی پر دوسرا مصرع ضم کر کے مطلع بنا لیا تھا۔ آزاد انصاری۔

پھر شیخ دل سے پیرِ مغاں کا مرید ہے — پھر زاہدوں کا نشۂ تقویٰ ہرن ہوا

پھر محوِ سادہ زاہدِ شب زندہ دار ہے — پھر رہنِ بادہ خرقۂ زہدِ کہن ہوا

پھر جام لے کے ساقیِ رنگیں ادا اُٹھا — پھر گرمِ نغمہ مطربِ گل پیرہن ہوا

پھر صحنِ گلستاں میں بساطِ طرب بچھی — پھر شغلِ مے کشی بہ لبِ نہرِ چمن ہوا

پھر جلسۂ طرب میں غزلخوانیاں چھڑیں — پھر انعقادِ محفلِ شعر و سخن ہوا

پھر چار سمت سرو قدوں کے ہجوم ہیں — پھر اجتماعِ لالہ رخانِ زمن ہوا

پھر ہم زبان ہر صنمِ گلبدن بنا — پھر مہربان ہر بتِ غنچہ دہن ہوا

پھر اخترِ مقدرِ عالم چمک اُٹھا — پھر آفتابِ لطفِ خدا ضو فگن ہوا

پھر ایک سال بادۂ ظرافت کے خم لنڈھے — آزادِ فاقہ مست بھی پی کر مگن ہوا

اوائلِ جولائی ۱۹۳۲ء حیدرآباد دکن۔ برطرحِ مشاعرہ منعقدۂ خاص باغ

مہاراجہ سر[1] کشن پرشاد بہادر شادؔ، صدرِ اعظم مملکتِ حیدرآباد دکن

حق بنا۔ باطل بنا۔ ناقص بنا۔ کامل بنا — جو بنانا ہو بنا۔ لیکن کسی قابل بنا

شوق کے لائق بنا۔ ارمان کے قابل بنا — اہلِ دل بننے کی حسرت ہے، تو دل کو دل بنا

---

[1] سر یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شادؔ صدرِ اعظم دولتِ آصفیہ (عمر قریباً ۷۲ سال) اُن مشہور ذی کرم، صاحبِ اخلاق، علم دوست اور معارف نواز ہستیوں میں سے ہیں جن کی نسبت قصّوں اور تاریخوں میں تو مبالغہ آمیز افسانے مذکور ہیں مگر وجود کہیں نہیں پایا جاتا۔ شعراء، علماء، صلحاء، فقراء اور مصنفین میں سے کون سا وہ طبقہ ہے جس کی وہ اپنی بساط سے بڑھ کر مدد و سرپرستی نہ فرماتے ہوں۔ گو آپ ایک مشہور تاریخی ہندو خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور نامِ نامی بھی ہندوانہ ہے۔ مگر درحقیقت آپ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ اور نہ عیسائی وغیرہ۔ بلکہ آپ صرف موحد ہیں۔ اور صلحِ کل آپ کا مذہب ہے لیکن آپ ہر مذہب کا ویسا ہی احترام کرتے ہیں جیسا کہ ایک اہلِ مذہب کو کرنا چاہیے (باقی نوٹ صفحہ ۳۷ پر)

عُقدہ تو بے شک کھُلا لیکن بصد دِقّت کھُلا
کام تو بے شک بنا لیکن بصد مشکل بنا

جب اُبھارا ہے تو اپنے قُرب کی حد تک اُبھار
جب بنایا ہے تو اپنے لطف کے قابل بنا

سب جہانوں سے جُدا اپنا جہاں تخلیق کر
سب مکانوں سے جُدا اپنا مکانِ دل بنا

پھر نئے سر سے جنونِ قیس کی بنیاد رکھ
پھر نئی لیلےٰ - نیا ناقہ - نیا محمل بنا

کون واقف تھا کہ بن کر یوں بگاڑا جاؤں گا
وائے قسمت ایں بنا - اور محض لاحاصل بنا

بن تو بیٹھے آج آزادؔ ایک کامل فرد ہے
یہ نہ سمجھے، ایک ناقص کس طرح کامل بنا

اوائل اگست ۱۹۳۲ء - حیدرآباد دکن - بر طرح مشاعرۂ منعقدۂ خاص باغ
مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شادؔ - صدر اعظم مملکتِ حیدرآباد دکن

مُسلسل

یادِ ایّامے کہ میں دلدادۂ جانانہ تھا
یار کے ہوتے غمِ اغیار سے بیگانہ تھا

یادِ ایّامے کہ عالمِ غیرتِ میخانہ تھا
نظمِ ہستی تحتِ نظمِ نرگسِ مستانہ تھا

(صفحہ ۳۶ کا باقی نوٹ) آپ ایک کہنہ مشق اور بلند پایہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی - آپ کو قدرت کی طرف سے خدمت ادب و شعر کا اک مخصوص اور نا مختتم ذوق عطا ہوا - جس کا ظہور لگاتار مشاعروں کے انعقاد - شعراء کی سرپرستی - اور ان کی فیاضانہ خاطر و مدارات کی صورت میں ہوتا رہتا ہے آپ مشاعروں میں خود شرکت گوارا فرماتے ہیں - توجہ کے ساتھ شعراء کا کلام سنتے ہیں - اور قابلِ داد اشعار پر داد دے کر ان کا دل بڑھاتے ہیں - اور پھر ذوق کی اس انتہا کو دیکھئے کہ اس پیرانہ سالی و ضعیفی کے باوجود چھ چھ گھنٹے - آٹھ آٹھ گھنٹے - اور بعض اوقات رات رات بھر مشاعروں میں تشریف فرما رہنے پر بھی آپکی دلچسپی میں مطلق فرق نہیں آتا - بعض شعراء کی آپ کی سرکار سے تنخواہیں مقرر ہیں - اور جن کی تنخواہیں نہیں وہ دوسرے طریق پر انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے رہتے ہیں مختصر یہ کہ شعر و ادب کی گرم بازاری اور اس کی بڑی حد تک سرپرستی خصوصاً دکن میں آپ ہی کی فیاضانہ توجہات کی رہین منت ہے حق تو یہ ہے کہ قدردانی شعر و ادب کے لحاظ سے دکن تو دکن تمام ہندوستان مل کر بھی آپکی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے - آزاد انصاری

(۱) [illegible] ۲

یاد آیا ہے کہ ایسے ایسے خوش رو جمع تھے — جن کے آگے قصۂ حور و پری افسانہ تھا

یاد آیا ہے کہ ایسے ایسے دلجو جمع تھے — جن کے ہوتے کچھ غم دنیا و ما فیہا نہ تھا

جو جبیں تھی حاملِ انوارِ محبوبانہ تھی — جو حسیں تھا صاحبِ اندازِ معشوقانہ تھا

حق گزارِ مہر و الفت نرگسِ مستانہ تھی — دوستدارِ رحم و رافت عشوۂ ترکانہ تھا

خوگرانِ قہر کے دل مہر سے لبریز تھے — دلبرانِ دہر کا برتاؤ دلدارانہ تھا

جملہ اسبابِ نشاطِ زندگی موجود تھے — جملہ سامانِ طرب زینت دہِ کاشانہ تھا

وہ امنگیں تھیں کہ بے شغلِ طرب بنتی نہ تھی — وہ ترنگیں تھیں کہ بے بادہ کشی چارہ نہ تھا

دن کو فکرِ سرخوشی تھی اور مینا کا نہ تھی — شب کو شغلِ میکشی تھا اور آزادانہ تھا

ایک جانب مطربوں کے نغمہ ہائے مست تھے — ایک جانب مغبچوں کا رقصِ سرشارانہ تھا

کون سی وہ رات تھی جو کیف کی حامل نہ تھی — کون سا وہ روز تھا جو لطفِ سرتاپا نہ تھا

رات دن میخواریاں تھیں۔ رات دن رقص و سرود — رات دن گردش میں ساقی، دور میں پیمانہ تھا

اُس طرف اُس کی طبیعت مائلِ الطاف تھی — اِس طرف میں گرمِ خدماتِ وفادارانہ تھا

جو عطا تھی بے حد و عد، جو کرم تھا بے حساب — ہر سلوکِ دوست میرے ساتھ فیاضانہ تھا

میری دم بھر بے مے و ساغر بسر ہوتی نہ تھی — مجھ کو پل بھر بے وصالِ یار چین آتا نہ تھا

عشق کو خود دار رہنے کا سبق دیتا تو کون — حسن کا برتاؤ خود ہی غیر خود دارانہ تھا

کچھ نہیں معلوم کیوں مجرم نہ گردانا گیا — میں کہ جو مجموعۂ افعالِ گستاخانہ تھا

کیا کہوں، کیوں اُس بتِ کافر کو میری چاہ تھی — کیا کہوں، کیوں وہ عدوئے دیں مرا دیوانہ تھا

جب کوئی توجیہہ عقلی داخلِ امکاں نہ ہو | کیوں نہ یہ سمجھوں، لباسِ شمع میں پروانہ تھا
اب کوئی کیونکر دکھا سکتا ہے کیا کیا لطف تھے | اب کوئی کیونکر بتا سکتا ہے، کیا تھا کیا نہ تھا

ماحصل یہ ہے کہ میں تھا اور نشاطِ جاوداں | مختصر یہ ہے کہ میں تھا اور غمِ جاناں نہ تھا
آہ آزاد - اب وہ ہم باقی نہ وہ لطفِ حیات | "خواب تھا، جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا - افسانہ تھا"

وسط نومبر ۱۹۳۲ء حیدرآباد دکن - بہ طرح مشاعرہ منعقدۂ فرحت منزل
منجانب طلبائے جامعہ عثمانیہ - بہ تشریف آوری مولانا شوکت علیخاں صاحب[1]
فانی بدایونی - بی - اے - ال - بی - زیر صدارت مہاراجہ
سر[2] کشن پرشاد بہادر شاد صدر اعظم

مسلسل

قربانِ عشق! بندۂ جاناں بنا دیا | فرمانروائے عالمِ امکاں بنا دیا
اک ناسزا کو سلطنتِ درد سونپ دی | اک بے نوا کو غیرتِ سلطاں بنا دیا
اک بے بصر کو طاقتِ دیدار بخش دی | اک بے خبر کو صاحبِ عرفاں بنا دیا

---

[1] مولانا شوکت علیخاں صاحب فانی بدایونی بی - اے - ال - بی - عمر قریباً (۵۵) سال اُن جلیل القدر اور فرید روزگار افراد میں سے ہیں جن کو قدرت ملیح شعر بنا کر کسی قوم کی طرف بھیجا کرتی ہے خصوصاً اُس وقت جب کہ اُس قوم کا مذاقِ شعر پست اور خراب ہو جایا کرتا ہے۔ آپ کی مخصوص جولانگاہِ فکر غزل ہے جس کو آپ کی غیر معمولی بلند خیالی - اور مخصوص اندازِ بیان نے مشق جاری کی بدولت بلند سے بلند مرتبے پر پہنچا دیا ہے - آپ کی غزل ہر قسم کے جذباتِ عالیہ مثلاً عشق و محبت - حقائق و معارف - فلسفہ و تصوف کا اک گنج بے بہا ہوتی ہے - مگر چونکہ آپ کی طبیعت باوجود زندہ دل اور خوش مزاج ہونے کے منحت قنوطی واقع ہوئی ہے - اِس لئے آپ کا لفظ لفظ بے پایاں درد اور انتہائی سوز و گداز میں (باقی حصہ صفحہ ۴۰ پر)

[2] دیکھو صفحہ (۳۶) حاشیہ (۱)

قطرے کو رتبۂ یمِ ذخّار دے دیا | ذرّے کو آفتابِ درخشاں بنا دیا

فرشِ زمیں سے عرش پہ لا کر بٹھا دیا | ہم پایۂ عطارد و کیواں بنا دیا

غمناک کو نگارِ طرب سے ملا دیا | خاشاک کو بہار بہ داماں بنا دیا

دورِ ستم کو دورِ کرم سے بدل دیا | فصلِ خزاں کو فصلِ بہاراں بنا دیا

ہستی کا چپّہ چپّہ بہاروں سے بھر دیا | عالم کا گوشہ گوشہ گلستاں بنا دیا

میخوار و نغمہ بار و مے افشاں دکھا دیا | گل ریز و رنگ بیز و غزلخواں بنا دیا

ساری زمیں کو جلوۂ جاناں سے پاٹ کر | سارے جہاں کو روضۂ رضواں بنا دیا

سر تا بہ پا حیات میں تبدیل کر دیا | سر تا بہ پا مجسّمۂ جاں بنا دیا

سر تا قدم ثبات میں تبدیل کر دیا | سر تا قدم حرارتِ ایماں بنا دیا

خاموشِ گفتگو کا طریقہ سکھا دیا | اربابِ آرزو کا زباں داں بنا دیا

جامِ شرابِ فقر کا چسکا لگا دیا | لذّت شناسِ بادۂ عرفاں بنا دیا

سارا جہان شورِ "انا الحق" سے گونج اٹھا | کُل دہر کو حقیقتِ عُریاں بنا دیا

آفاتِ روزگار کا خطرہ مٹا دیا | مامونِ فتنۂ غمِ دوراں بنا دیا

(صفحہ ۳۹ کا باقی نوٹ) ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے آپ کو امامِ یاسیات کے مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔ کچھ روز سے آپ نے رباعی کی طرف بھی توجہ مبذول کرنی شروع کر دی ہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اک خاص تعداد رباعیات کی لکھ ڈالی ہے۔ آپ کی رباعیات بھی انہیں خصوصیات کی حامل ہیں جن کی کہ غزل۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ رباعی میں آپ اور زیادہ بلندی کی طرف مائلِ پرواز نظر آتے ہیں۔ آپ صاحبِ دیوان ہیں۔ آپ کا پہلا دیوان سنہ ۱۹۲۵ء میں "باقیاتِ فانی" کے نام سے آگرہ سے شائع ہو چکا ہے۔ خاکسار کو اک عرصہ سے آپ کی خدمت میں نیازِ خصوصی حاصل ہے اور آپ بھی ازراہِ کرم توجہاتِ مخصوصہ سے دریغ نہیں فرماتے۔ آزاد انصاری۔

دامِ جفائے دیوِ لعیں سے چھڑا دیا — مقرونِ فضل و رحمتِ یزداں بنا دیا

بیگانۂ خیالِ غمِ ہجر کر دیا — ناقابلِ تصوّرِ حرماں بنا دیا

دشوارئ نجات کا قصّہ چکا دیا — غمخوارئ حیات کو آساں بنا دیا

کثرت میں جلوۂ رخِ وحدت دکھا دیا — کافر بنا کے رشکِ مسلماں بنا دیا

صدق و صفا کا جذبۂ بے خوف ابھار کر — غارت گرِ مکائدِ شیطاں بنا دیا

کارِ بزرگِ خدمتِ میخانہ سونپ کر — پیرِ طریقِ بادہ گساراں بنا دیا

نشترِ گنہ کی جا [illegible] بخشش کر — پیغمبرِ شریعتِ عصیاں بنا دیا

آزاد! شکرِ عشقِ بتاں جس کے فیض نے — دلدادۂ پرستشِ یزداں بنا دیا

ناتمام غزلیات کے اشعار

حسبِ سابق بہ ترتیبِ زمانۂ تصنیف

مئی سنہ ۱۸۹۶ء - سہارنپور

کیا کہوں، کیوں خبطِ امیدِ کرم باطل ہوا — جب ہوا، تیرا کرم مثلِ بلا نازل ہوا

ایک میرے آشیاں کے چار تنکے پھونک کے — سچ بتا۔ اے برقِ عالم سوز! کیا حاصل ہوا

ستمبر سنہ ۱۸۹۷ء - سہارنپور

ہم یوں گنوائے بیٹھے ہیں سرمایۂ شکیب — جیسے کوئی غریب مسافر لٹا ہوا

ﻠﮧ ان میں وہ اشعار بھی شامل ہیں کہ اتفاقیہ کوئی مضمون ذہن میں آیا اور شعر موزوں ہو گیا اور وہ اشعار بھی جو کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر لئے گئے ہیں۔ آزاد انصاری۔

اگست ۱۸۹۹ء - سہارنپور

اُمید ٹوٹ جانے کی حالت نہ پوچھیے — سوا اضطراب ایک دلِ نا صبور تھا

کیوں تیرے التفات کا نشا نہ پا سکا — میری بھی رائے یہ ہے کہ میرا قصور تھا

مارچ ۱۹۰۹ء - کانپور

کہیں ایسا نہ ہو کچھ اور نتیجہ نکلے — کچھ سمجھ کر مجھے محفل سے نکالا ہوتا

وعدۂ وصل کیا تھا تو وفا بھی کرتے — از رہِ لطف کھٹائی میں نہ ڈالا ہوتا

اکتوبر ۱۹۰۹ء - سہارنپور

غلط نکلا، خیالِ خویشتن داری غلط نکلا — "اَلا یَا اَیُّھَا السَّاقی اَدِر کاساً و ناوِلھا"

اگر نا آشنائے بحرِ الفت ہیں تو کیا پروا — "دل افگنیم بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا"

۷ نومبر ۱۹۰۹ء - سہارنپور

کہاں تک قصۂ دنیا، گئے سیری کے اُڑے جلوا[1] — کہاں کا خطرۂ عقبیٰ، لگے رگڑا، مٹے جھگڑا

دسمبر ۱۹۲۰ء - علی گڑھ

کسی کا مال و زر لوٹا کسی کا گھر لوٹا — تری کافر ادا اُن نے جسے لوٹا نڈر لوٹا

وسط مئی ۱۹۲۱ء - دہلی

کسی دن کچھ ہمارے حق میں بھی ارشاد کرنا تھا — ہمیں بھی یاد کرنا تھا، ہمیں بھی شاد کرنا تھا

---

[1] "اُڑے جلوا"۔ "جلوے اُڑنا"۔ اور "جلوے اُڑانا" بھنگڑوں کے محاورے ہیں۔ جن کو وہ "مزے اُڑنا" - اور مزے اُڑانا کے معنوں میں بولتے ہیں۔ "آزاد"

وسطِ دسمبر ۱۹۲۲ء - دہلی

بندہ پرور! میں وہ بندہ ہوں، کہ بہرِ بندگی ——— جس کے آگے سر جھکا دوں گا، خدا ہو جائیگا

۸ نومبر ۱۹۲۶ء - حیدر آباد دکن

چَین دل سے لے لیا، یہہ کیا کیا ——— اے غمِ جاناں! بڑا ساکھا کیا

مئی ۱۹۲۷ء - حیدر آباد دکن

دل ہمیں دنیا سے کھو کر ہی رہا ——— جو نہ ہونا تھا، وہ ہو کر ہی رہا

۱۵ دسمبر ۱۹۲۷ء - حیدر آباد دکن

اگر یونہیں مشقِ تصوّر رہے گی[1] ——— تو اک روز دل آنکھ کا کام دیگا

۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ء - حیدر آباد دکن

جب تک اہلِ دل و نظر نہ بنے ——— آدمی کام کا نہیں ہوتا

۱۵ اپریل ۱۹۲۹ء حیدر آباد دکن

صحنِ مکاں سے ہر شے تا حدِ بام میری ——— بامِ مکاں سے سب کچھ تا آسمان تمھارا[2]

---

[1] اکتوبر یا نومبر ۱۹۲۷ء کے رسالہ "نگار" لکھنؤ میں اک فارسی غزل شائع ہوئی تھی (یاد نہیں کہ کس کی غزل تھی) اُسکا مطلع تھا - "چو شوقِ دیدِ رُخِ یار بیشتر گردد ÷ ز اہلِ دیدہ شنیدم کہ دل نظر گردد" مجھ کو یہ خیال بہت پسند آیا - اور میں نے کوشش کی کہ اِس خیال کو اُردو میں منتقل کر لوں میں اپنی اس کوشش میں پوری طرح تو کامیاب نہ ہو سکا، مگر ایک حد تک ضرور کامیاب ہوا - اور جس حد تک کامیاب ہوا - وہ ترجمہ سے ظاہر ہے - آزاد انصاری -

[2] یہ شعر فارسی کے مندرجۂ ذیل شعر کا (جو فارسی و اردو دونوں زبانوں میں بطورِ ضرب المثل مستعمل ہے) اُردو ترجمہ ہے -

از صحنِ خانہ تا لبِ بام از آنِ من ÷ وز بامِ خانہ تا بہ ثریا از آنِ تو - آزاد انصاری

وسطِ نومبر ۱۹۳۲ء۔ حیدر آباد دکن

آزاد! شکرِ الفتِ حق، جس کے جوش نے ۔۔۔ مجھ کو حریفِ طاقتِ باطل بنادیا

۵ نومبر ۱۹۳۴ء۔ حیدر آباد دکن

آزاد! آہ۔ اک بُتِ کافر کی یاد نے ۔۔۔ مجھ کو خدا کی یاد سے بیگانہ کر دیا

ب

وسط مارچ ۱۸۹۵ء۔ سہارنپور۔ طرحِ طبع زاد

اَیکہ ہر سُو تیرے جلوے بے نقاب ۔۔۔ ایک مُشتاقِ لقا سے یہ حجاب؟

میری حالت مُجھ سے پوچھا چاہیئے ۔۔۔ اِک دلِ کُلفت زدہ، سو اضطراب

میری بیتی مجھ سے سُننا چاہیئے ۔۔۔ ایک جانِ مبتلا، لاکھوں عذاب

اے ترا وہ التفاتِ جاں فزا ۔۔۔ اے ترے وہ لُطف ہائے بے حساب

وہ مرے سارے عمل مبنی بہ جبر ۔۔۔ اور وہ اُس کا ظالمانہ احتساب

یا وہ خاطر داریاں، یا یہ سُلوک؟ ۔۔۔ انقلاب اور اِس بلا کا انقلاب؟

ہم سے بدقسمت اور اُس کا التفات ۔۔۔ اِیں بہ بیداریست یارب، یا بخواب؟

وہ مسلسل اُس کی جانب سے کشش ۔۔۔ اور وہ میرا سُوئے مرکز انجذاب

تو ضرورت سے زیادہ سنگدل ۔۔۔ میں اور اِک آٹھوں پہر کا اضطراب

حضرت آزاد! یہہ بے فکریاں؟ کیا ہمیشہ یونہیں گزرے گی؟ جناب!

اوائل اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء - علی گڑھ - طرح طبع زاد

سرگشتۂ طلب کو مقامِ فنا نصیب | رہگیرِ جانِ طلب کو دوامِ بقا نصیب

تم اور چارۂ غمِ فرقت، خوشا نصیب! | دُکھ کو دوا نصیب، مرض کو شفا نصیب

اس خوبیٔ نصیب کے قربان جائیے | حسرت ستم نصیب، تمنا بلا نصیب

میں بے نصیب تھا، مرے سر منڈھ دیا گیا | غم آشنا نصیب، ستم آشنا نصیب

آزاد! کیا گزارشِ حالِ بتر کروں | میں اور قیدِ غم، مری قسمت، مرا نصیب

اواخر دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء حیدر آباد دکن - برائے مشاعرۂ سالانہ جامعۂ عثمانیہ
بصدارت جناب مولوی عبدالحق[1] صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔
طرح طبع زاد
مسلسل بہ طرز ترصیع جدید[2]

بیت[3]

قدر و قیمت فصلِ تیارِ شباب | حسن و صحت نقدِ دستارِ شباب

عزم و ہمت خادمِ کارِ شباب | تاب و طاقت کفش بردارِ شباب

---

[1] جناب مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو۔ سابق پرنسپل اورنگ آباد کالج پنشنر حال پروفیسر اردو عثمانیہ کالج حیدر آباد دکن اُن مشاہیر ملک میں سے ہیں جو اردو ادب کے رُکن رکین مانے جاتے ہیں اور جن کے احسانات عظیم کے بار سے زبانِ اردو کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کا قیام۔ رسالہ "اردو"۔ اور اس کے بعد رسالہ "سائنس" کا اجرا آپ ہی کی مسلسل مساعی کا رہینِ منت ہے۔ عرصہ ہوا کہ آپ ایک مبسوط اور جامع "قواعد اردو" لکھ کر اردو زبان کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کر چکے ہیں۔ اور اب ایک اردو کی مکمل لغات کی تیاری میں مصروف ہیں۔ (باقی نوٹ صفحہ ۴۶ پر تحریر ہے)

[2] دیکھو صفحہ (۳) حاشیہ (۱)

[3] یہ غزل "شباب" کی سرخی سے رسالہ "ہمایوں" لاہور میں شائع ہوچکی ہے۔ - آزاد انصاری

جرأتِ بے خوف و عزمِ استوار — بندۂ بے دامِ سرکارِ شباب
تابِ سعی و تابِ کوشش تا بکار — خادمِ خدّامِ دربارِ شباب

زہد و تقوے کو جواں کیا منہ لگائیں — زہد و تقوے باعثِ عارِ شباب
رندی و مستی سے کیوں امن چاہئیں — رندی و مستی سزاوارِ شباب

پرسشِ اعمال بے جا ناروا — عفو کے قابل گنہگارِ شباب
باوجودِ علمِ اقدامِ خطا — داد کے لائق خطاکارِ شباب

عالمِ حسنِ حسینانِ جہاں — پرتوِ دنیائے انوارِ شباب
جلوۂ روئے مہینِ مہوشاں — عکسِ روئے مہر آثارِ شباب

جلوہ ہائے مہر سے بھی دل پذیر — جلوہ ہائے حسنِ رخسارِ شباب
پیچ ہائے بخت سے بھی سخت گیر — پیچ ہائے زلفِ خمدارِ شباب

ہر سخن نغماتِ ساماں کیوں نہ ہو — نغمہ زا گفتارِ گفتارِ شباب
ہر قدم محشر بہ داماں کیوں نہ ہو — حشر زا رفتارِ رفتارِ شباب

(صفحہ ۴۵ کا بقیہ نوٹ) جس کے متعلق اکثر فنی عملہ آپ کے ماتحت کام کر رہا ہے۔ نثر میں آپ ایک مخصوص اور دلچسپ رنگ کے بانی ہیں۔ خصوصاً فنِ نقد و تبصرہ اور مقدمات نگاری تو آپ کا حصہ ہے جس میں بڑے سے بڑا ادیب بھی آپ کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس مشاعرے میں مصرعِ طرح تو کچھ اور تھا مگر "شباب" کا موضوع نظموں کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ خاکسار نے غزل تو نہیں لکھی تھی لیکن "شباب" پر طبع آزمائی کی ضرور کوشش کی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ غزل ہے۔ آزاد انصاری

کامگارِ سیرِ باغِ خُلد ہے — کامگارِ سیرِ گلزارِ شباب
میگسارِ صد ایاغِ خلد ہے — میگسارِ کیفِ دیدارِ شباب

واقعی گُل پر بھی جوبن ہے مگر — گُل سے جوبن میں سوا خارِ شباب
درحقیقت دن بھی روشن ہے مگر — دن سے بھی روشن شبِ تارِ شباب

مستِ صہبائے تمنّا کر دیا — اے جزاک اللہ! سرشارِ شباب
زندگی میں کیف پیدا کر دیا — اے حماک اللہ! میخوارِ شباب

حضرتِ آزاد اک دن ہم بھی تھے — فائزِ خدماتِ سرکارِ شباب
لیکن اب کیا کیا ہیں، کوئی کیا کہے
راندۂ و مقہورِ دربارِ شباب

آپ

وسطِ دسمبر ۱۹۲۳ء حیدرآباد دکن طرحِ طبع زاد

حقِ اُلفت ادا کریں گے آپ؟ — آپ پاسِ وفا کریں گے آپ؟
ہم فریبِ نگاہ کیوں کھاتے — کیا خبر تھی، دغا کریں گے آپ
کون واقف، کسی کا دل لے کر — کیا بنائیں گے، کیا کریں گے آپ

آپ کیوں درپئے دل و جاں ہیں
ہم نثار اِدا کریں گے آپ

آپ پُرسانِ حالِ غم ہونگے؟
آپ، خوفِ خدا کریں گے آپ؟

کب تک آزادؔ جبر کے ہوتے
صبر پر اِکتفا کریں گے آپ

ت

اوائل نومبر ۱۹۲۳ء - حیدر آباد دکن - طرح طبعزاد[1]

اُس کو قیدِ مکاں سے کیا نسبت
بے نشاں ہے نشاں سے کیا نسبت

عرش[1] و کُرسی کی رفعتیں برحق
مگر اُس آستاں سے کیا نسبت

مہر بھی ضو فشاں سہی - لیکن
اُس رُخِ ضو فشاں سے کیا نسبت

---

[1] جس زمانے میں میں نے یہ غزل لکھی ہے اُس سے پہلے کوئی غزل اِس ردیف و قافیہ میں میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اِس طرح کو طرح طبع زاد لکھ دیا تھا۔ مگر کئی سال بعد اسی طرح پر ایک غزل مولانا حسرت موہانی کی میری نظر سے گزری۔ اور اتفاق ملاحظہ ہو کہ شعر زیر بحث معنًا بالکلیہ اور لفظاً بالاکثر متوارد پایا گیا۔ مولانائے موصوف کا شعر تو مجھے یاد نہیں رہا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ الفاظ بھی یہی تھے۔ اور مضمون بھی یہی تھا۔ صرف پہلے مصرع میں ایک یا دو لفظ بدلے ہوئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا توارد کیونکر ہو گیا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اِس شعر کو غزل سے نکال دوں گا۔ مگر بعد میں میری رائے بدل گئی کیونکہ میں سارق نہیں ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ توارد ہو گیا۔ مجھ کو کچھ علم نہیں کہ اِس طرح پر غزل مولانائے موصوف نے پہلے لکھی تھی یا میں نے۔

آزاد انصاری

شیخ! کعبہ خدا کا گھر ہی سہی — پھر بھی دیرِ مغاں سے کیا نسبت
برقِ مضطر سہی، مگر آزاد! — میرے قلبِ تپاں سے کیا نسبت

اوائل جون ۱۹۲۶ء حیدرآباد دکن۔ طرحِ طبعزاد

مُسلسل بہ طرزِ ترصیعِ جدید[1]

[2]

جلوۂ جنت بہارِ حُسن دوست — آتشِ دوزخ شرارِ حُسن دوست

نظمِ ہستی بالبداہت دال ہے — نظمِ ہستی تحتِ کارِ حسن دوست
حُسنِ عالم خود گواہِ حال ہے — حُسنِ عالم مُستعارِ حسنِ دوست

عالمِ نقش و نگارِ کائنات — پرتو نقش و نگارِ حسنِ دوست
حُسنِ دُنیائے بہارِ شش جہات — عکسِ دُنیائے بہارِ حُسنِ دوست

ہر طرف شکلِ نجوم انوار بار — طلعتِ انوار بارِ حُسنِ دوست
ہر طرف شکلِ بہار اندر بہار — جلوہ ہائے بے شمارِ حُسنِ دوست

اہتمامِ جلوہ آرائی نہ پوچھ — مہر و مہ آئینہ دارِ حُسنِ دوست
انتظامِ حُسن پیرائی نہ پوچھ — نسر و پرویں پیشکارِ حسنِ دوست

---

[1] دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

[2] یہ غزل "حدیث حُسنِ دوست" کی سرخی سے رسالہ "ہزار داستان" لاہور میں شائع ہو چکی ہے۔ آزاد انصاری

واہ حسنِ دوست کے فیضانِ عام
جس طرف دیکھو، بہارِ حسنِ دوست
واہ حسنِ دوست کے الطافِ تمام
جس طرف جاؤ، دوچارِ حسنِ دوست

کون حسنِ دوست پر مائل نہیں
جنّ و انساں، سب نثارِ حسنِ دوست
کون اس شمشیر کا گھائل نہیں
مُرغ و ماہی، سب شکارِ حسنِ دوست

آدم و جنّ و پری، حور و ملک
بندۂ طاعت شعارِ حسنِ دوست
مختصر یہ ہے، سما سے تا سمک
چاکرِ خدمت گزارِ حسنِ دوست

سر بلندانِ جہاں سے سر بلند
اے زہے تقدیر یارِ حسنِ دوست
ارجمندانِ زماں سے ارجمند
واہ بخت دوستدارِ حسنِ دوست

شاملِ عشّاق ہو کر دیکھ لو
عزّتِ عشّاق۔ کارِ حسنِ دوست
اہلِ دل بن کر دل و جاں نذر دو
قدرِ اہلِ دل شعارِ حسنِ دوست

آؤ، اب آزاد! ہم تم بھی بنیں
عاشقانِ دل فگارِ حسنِ دوست
آؤ، اب آزاد! ہم تم بھی کریں
جان و مال و دل نثارِ حسنِ دوست

شاید ایسا ہو، ہماری بھی سنے
لطفِ بے حدّ و شمارِ حسنِ دوست
شاید ایسا ہو، ہمیں بھی کھینچ لے
جذبۂ بے اختیارِ حسنِ دوست

متفرق اشعار

اپریل ۱۸۹۶ء - سہارن پور

اِن پشیمانیوں سے کیا حاصل ۔۔۔ جلد کر کچھ تلافیٔ مافات

اکتوبر ۱۸۹۶ء - سہارنپور

کیا کہوں، آزاد! کیوں چُپ لگ گئی ۔۔۔ ایسے ہی کچھ پیش آئے واقعات

ٹ

اواخر دسمبر ۱۹۲۳ء - حیدر آباد دکن - طرحِ طبع زاد

مے پی۔ دل کو غم سے نہ پاٹ ۔۔۔ خوش جی اور خوش جی کر کاٹ

آہ! خیالِ فُرقتِ دوست ۔۔۔ جی بھی بیکل، دل بھی اُچاٹ

قالبِ جوزا تک دو نیم[۱] ۔۔۔ واہ! تمھاری تیغ کے کاٹ

پھر رہِ دفعِ ہجر نکال ۔۔۔ پھر یہ خلیج حائل پاٹ

جور و جفا کی خو تو نہ ڈال ۔۔۔ مہر و وفا کی جڑ تو نہ کاٹ

رہرو حیرت! دیکھ کے چل ۔۔۔ غافل! آگے راہ نہ گھاٹ

ارض و فلک سب سرگرداں ۔۔۔ جس کو دیکھو، بارہ باٹ

آزاد! آپ اور اتنی دوں ۔۔۔ "بلبے ندی تیرا پاٹ"

[۱] میں لفظ "دو" بہ اشباع کو فارسی ترکیب میں بھی جائز و فصیح سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری

ث

اوائل ڈسمبر ۱۹۲۳ء۔ حیدرآباد دکن طرح طبع زاد

نیم مُسلسل

بختِ بد یار کیوں ہے، کیا باعث[1]	زندگی بار کیوں ہے، کیا باعث
سینہ کیوں خار خار رہتا ہوں	حالِ دل زار کیوں ہے، کیا باعث
دل، جگر کیوں فگار رہتا ہوں	آنکھ خُونبار کیوں ہے، کیا باعث
یاس گھر دل میں کیوں بنا بیٹھی	آس بیزار کیوں ہے، کیا باعث
آہ تاثیر کیوں گنوا بیٹھی	نالہ بیکار کیوں ہے، کیا باعث
جستجو اس کی کیوں نہیں آتی	آرزو خوار کیوں ہے، کیا باعث
خُوش دلی پاس کیوں نہیں آتی	غم کی بھرمار کیوں ہے، کیا باعث
بخت کی آنکھ کیوں نہیں کُھلتی	فتنہ بیدار کیوں ہے، کیا باعث
مشکل آسان کیوں نہیں ہوتی	زیست دُشوار کیوں ہے، کیا باعث
او لگاتار جبر کے خُوگر!	صبر بیکار کیوں ہے، کیا باعث
کون واقف، کہ دوست کے نزدیک	دوستی عار کیوں ہے، کیا باعث
کیا خبر، کوئی حرفِ حق کہہ کر	قابلِ دار کیوں ہے، کیا باعث
کیا پتا، یا دیار کے ہوتے	بیکسی یار کیوں ہے، کیا باعث

[1] یہ غزل "آغازِ حیرت" کے عنوان سے رسالہ "ہمایوں" لاہور میں شائع ہوچکی ہے۔ آزاد

کون سمجھا سکے کہ عادتِ دوست | دوست آزار کیوں ہے، کیا باعث
اے رہِ آرزو کے راہ نورد | سُست رفتار کیوں ہے، کیا باعث
کاش! ظاہر ہو، آج کل آزاد | جی سے بیزار کیوں ہے، کیا باعث

ج

وسطِ جنوری ۱۹۲۵ء۔ حیدرآباد دکن۔ طرح طبع زاد

دستِ گستاخِ طلب کا کیا علاج | کیا علاج، اس بے ادب کا کیا علاج
حرمتِ بنتُ العنب برحق، مگر | حسرتِ بنتُ العنب کا کیا علاج
جرأتِ ترکِ ادب بے جا سہی | عادتِ ترکِ ادب کا کیا علاج
اور کچھ دُکھ ہو تو درماں سیکڑوں | لیکن آزارِ طلب کا کیا علاج
دردِ فرقت قابلِ درماں سہی | آرزوئے جاں طلب کا کیا علاج
حضرتِ آزاد! شکوے رائگاں | رنج ہائے بے سبب کا کیا علاج

وسطِ جنوری ۱۹۲۵ء۔ حیدرآباد دکن۔ طرح طبع زاد

اب غمِ شوقِ لقا کا کیا علاج | ایک دردِ لادوا کا کیا علاج
جور جائز رکھ کے حکمِ شکرِ جور | اس ستم کا، اس جفا کا کیا علاج

حُکمِ تسلیم و رضا بر حق، مگر — عادتِ چُون و چرا کا کیا علاج
دستِ بُردِ حسن کے شکوے عبث — اِک بلائے دِل رُبا کا کیا علاج
ایک خواہش ہو تو پوری ہو سکے — حسرتِ ہر دو سرا[1] کا کیا علاج
دونوں عالم مِل رہے ہیں، لیکن آہ — اِس دلِ بے مُدعا کا کیا علاج
شکوۂ تعزیر بے جا تو صحیح — لیکن اِقبالِ خطا کا کیا علاج
ہمّتِ اہلِ وفا بالا سہی — قسمتِ اہلِ وفا کا کیا علاج
حضرتِ آزادؔ، نالے رائیگاں — ہجرِ یارِ بے وفا کا کیا علاج

ح

اوائل نومبر ۱۹۲۲ء - حیدر آباد دکن - طرح طبع زاد

مُسلسل بطرزِ ترصیع جدید*

ہر[2] دلِ اُمّیدوارِ جلوۂ رُوح — ہر لحظ خواستگارِ جلوۂ رُوح
دام و دد بادہ خوارِ جلوۂ رُوح — اِنس و جاں میگسارِ جلوۂ رُوح

رفعِ کثرت شعارِ جلوۂ رُوح — حُسنِ وحدت دثارِ جلوۂ رُوح
زندگی محنت کارِ جلوۂ رُوح — نورِ جاں مستعارِ جلوۂ رُوح

---

* دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱) [1] میں لفظ "دو" بہ اشباع کو فارسی ترکیب میں بھی جائز و فصیح سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری

زخمہ ہے اور دستِ مطربِ قدس / نغمہ ہے اور تارِ جلوۂ روح
لاکھ نغمے فدائے نغمۂ جاں / لاکھ جلوے نثارِ جلوۂ روح

جس طرف دیکھیے، چمن آرا / شاہدِ گل عذارِ جلوۂ روح
جس طرف جائیے، ضیا پیرا / چہرۂ تابدارِ جلوۂ روح

چار سو ضو فشان و ظلمت سوز / طلعتِ برق بارِ جلوۂ روح
چار سو نور بخش و چشم افروز / سرمۂ حسن کارِ جلوۂ روح

ہر طرف روشنیٔ مشعلِ نور / ہر طرف انتشارِ جلوۂ روح
ہر طرف عالمِ تجلیٔ طور / ہر طرف اشتہارِ جلوۂ روح

روشنیٔ حیات پھیلانا / مقصدِ کاروبارِ جلوۂ روح
اخترِ بختِ زیست چمکانا / مطلبِ آشکارِ جلوۂ روح

بحر و بر سب مع زمین و زماں / چاکرِ خاکسارِ جلوۂ روح
خشک و تر سب مع چہار ارکاں / خادمِ جاں نثارِ جلوۂ روح

مادّہ۔ جسم و جاں، جسے دیکھو / بندۂ حق گزارِ جلوۂ روح
نیک و بد۔ ایں و آں، جسے پوچھو / عبدِ طاعت شعارِ جلوۂ روح

حدّ ادراک و فہم سے باہر | وسعتِ اختیارِ جلوۂ رُوح
حیطۂ فکر و وہم سے باہر | طاقتِ اقتدارِ جلوۂ رُوح

آرزوئے بہارِ جنّت ہے | آرزوئے بہارِ جلوۂ رُوح
جستجوئے دیارِ وحدت ہے | جستجوئے دیارِ جلوۂ رُوح

جلوۂ رُوح خلق فرمایا | حمدِ خلّاقِ کارِ جلوۂ رُوح
جلوۂ رُوح ہم کو دِکھلایا | شکرِ پروردگارِ جلوۂ رُوح

کاش آزاد! بعدِ مُردن بھی
ہم ہوں۔ اور جلوہ زارِ جلوۂ رُوح

خ

اواخر اگست سنہ ۱۹۲۶ء حیدرآباد دکن۔ طرحِ طبع زادؔ

مسلسل بہ طرزِ ترصیع جدید

کچھ عجیب و غریب فطرتِ شیخ | بارک اللہ! ذاتِ حضرتِ شیخ
ہر طرف ذکرِ خرقِ عادتِ شیخ | ہر طرف شہرۂ کرامتِ شیخ

۵ یہ غزل حضرت شیخ کی سرخی سے رسالۂ ہمایوں لاہور میں شائع ہو چکی ہے۔ آزاد انصاری

۵ دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

جس کو دیکھو، وہ سادہ لوحی سے　　داخلِ حلقۂ ارادتِ شیخ
جس کو پوچھو، وہ بدنصیبی سے　　قائلِ منصبِ امامتِ شیخ

جو ہے وہ شیخ کی طرف مائل　　ایک دُنیا نثارِ دعوتِ شیخ
جو ہے وہ تیغِ شیخ کا گھائل　　ایک عالم شکارِ بیعتِ شیخ

حکمِ ترکِ ریا سے ظاہر ہے　　مائلِ مکر و زور نیتِ شیخ
غرّۂ اتّقا سے ظاہر ہے　　عُجب و کبر و غرور طینتِ شیخ

رات دن لُقمہ ہائے تر کا خیال　　محض تن پروری طریقتِ شیخ
رات دن فکرِ جمعِ دولت و مال　　محض حرص و ہوا شریعتِ شیخ

فکرِ تہذیبِ نفس سے کیا کام　　کسبِ زر منتہائے ہمتِ شیخ
کج روی دین، کج روی اسلام　　راست بازی خلافِ ملتِ شیخ

مائلِ اعتقادِ شیخ نہ ہو　　گمرہی حاصلِ عقیدتِ شیخ
حالِ خُدّامِ شیخ دیکھ نہ لو　　بدنصیبی مآلِ خدمتِ شیخ

حیف آزادِ! بے ادب صد حیف
یہ خیالات اور نسبتِ شیخ؟

اوائل نومبر ۱۹۲۵ء حیدر آباد دکن. طرح طبع زاد

ہیں وہ بیکس کہ واجب الامداد — تو وہ کافر کہ خوگرِ بیداد

دل بھی ناشاد، جان بھی ناشاد — ہر طرح جی پر آبنی فریاد!

ایک دل اور سینکڑوں دلبر — ایک صید اور لاتعد صیّاد

ہائے! وہ لطفِ اُلفتِ باہم — یاد ہے آج تک وہ عالم یاد

منزلِ عشق پُرخطر ہے تو ہو — شوق کہتا ہے "ہرچہ بادا باد"

او ستم دوست! منصفی فرما — داد خواہوں پر اور یہ بیداد؟

کون تابِ مقاومت لاتا — ہم تھے اور تیرے عشق کی اُفتاد

اب وہ ظالم ہے اور فکرِ جفا — لے! اُمیدِ وفا! مبارک باد

نہ وہ صبر و سکونِ دل باقی — نہ وہ صبر و سکوں کی اِستعداد

میرے غم سے نمودِ شادی و غم — میرے دم سے وجودِ کون و فساد

کہیں آباد ہی نہ ہونے دیا — بارک اللہ! قسمتِ برباد

حالِ آزاد کیا گزارش ہو
کہ وہ آزادیاں نہ وہ آزاد

اوائل ستمبر ۱۹۲۶ء۔ حیدر آباد دکن۔ طرحِ طبع زاد

ہشیار! کہ سکھ چین کی ساعت ہے مگر شاذ ۔۔۔ راحت ہے مگر شاذ، فراغت ہے مگر شاذ

دنیا میں حقیقی بھی محبت ہے مگر شاذ ۔۔۔ اِس سمت بھی میلانِ طبیعت ہے مگر شاذ

ہر ایک تو حقدارِ عنایت نہیں ہوتا ۔۔۔ ایسا بھی نصیب، ایسی بھی قسمت ہے مگر شاذ

ہر وقت تو وہ مائلِ رحمت نہیں ہوتا ۔۔۔ ایسی بھی گھڑی، ایسی بھی ساعت ہے مگر شاذ

وہ عام نگاہوں کو نظر آئے تو کیا آئے ۔۔۔ آنکھوں میں بصر، دل میں بصیرت ہے مگر شاذ

ہاں اب بھی تجھے شوقِ نوازش ہے مگر کم ۔۔۔ ہاں اب بھی تری چشمِ عنایت ہے مگر شاذ

افسوس! کہ ہر دل میں ترا درد نہ دیکھا ۔۔۔ افسوس! کہ دنیا میں یہ دولت ہے مگر شاذ

آزادؔ! دلوں میں نہ وہ الفت نہ محبت ۔۔۔ الفت ہے مگر شاذ، محبت ہے مگر شاذ

س

۱۰؍ دسمبر ۱۸۹۹ء۔ پٹیالہ خاص۔ طرحِ طبع زاد

نیم مسلسل

اِک مرا دل کہ مصائب کا نشکا ۔۔۔ اِک مری جان کہ صرفِ انکا

تو اور اِک چشمِ عنایت سے دریغ | میں اور اُمیدِ وفا کا آزار
نامُرادانہ بسر ہوتی ہے | نہ وہ دُنیا ہے نہ وہ لیل و نہار
نہ وہ تسکین کے پہلو باقی | نہ وہ اُمید، نہ وہ صبر و قرار
نہ کوئی درد و مصیبت کا شریک | نہ کوئی یار، نہ کوئی غمخوار
نہ وہ خوش وقتیٔ بزمِ عشرت | نہ وہ دل چسپیٔ سیرِ گلزار
نہ وہ محفل، نہ وہ غوغائے نشاط | نہ وہ گلشن نہ وہ دنیائے بہار
نہ وہ آنکھیں، نہ وہ رنگیں جلوے | نہ وہ نظریں، نہ وہ لطفِ دیدار
جس جگہ جائیے، دل کو وحشت | جس طرف دیکھیے، کُلفت دو[1] چار
کامرانی کا زمانہ نہ رہا | کوئی حسرت ہو، نکلنی دشوار
کیا پڑی ہے کہ کوئی رہبر ہو | میں ہوں اور منزلِ دشوار گزار
اے ترے لُطف کی دُنیا بھوکی | اِس طرف بھی نگہِ لُطف شعار
کوئی انجام کا کھٹکا نہ رہا | اے زہے شغلِ ہجومِ افکار
وضعِ آزاد نرالی دیکھی | ہاتھ میں سبحہ، گلے میں زنّار

یکم مارچ سنہ ۱۹۰۰ء - سہارن پور - طرح طبع زاد

اے ہجومِ درد ! ظالم درگزر | میں اور اِحسانِ دوا و چارہ گر؟
دوست بن کر دشمنی اچھی نہیں | اِلتفاتِ بے کراں سے درگزر

---

[1] لفظ "دو" باشباع کو میں فارسی ترکیب میں بھی جائز سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری۔

لاکھ اُمیدِ نگاہِ لطف ہو — تو ہے اور نامہربانی کی نظر

بچ نکلنے کی توقع ہی غلط — مجھ سے بدقسمت کا بیڑا اور بھنور؟

کیا مری بوسیدہ کشتی کی بساط — موجِ دریا! کچھ خدا کا خوف کر

حضرتِ آزاد! غیرت چاہیئے — بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر

---

۲۰ مرجون ۱۹۰۴ء - کانپور - برطرح مشاعرہ منعقدہ چھبرامئو ضلع فرخ آباد

وہی احسانِ وحشت ہے مرے حالِ پریشاں پر — وہی دستِ جنوں کی مہربانی ہے گریباں پر

تری حسرت چلی جاتی ہے کلفتہائے ہجراں پر — تری اُمید باقی ہے ہجومِ یاس و حرماں پر

کبھی طولِ مرض بیمار کا دل توڑ دیتا ہے — کبھی خبطِ شفا مجبور کر دیتا ہے درماں پر

ابھی تھوڑی سی بہت اُمید باقی ہے، ترحم کر — ابھی ارمان کا اطلاق ہو سکتا ہے ارماں پر

مجھے کنجِ قفس کی سختیاں کیا راس آئیں گی — مری دل بستگی موقوف تھی سیرِ گلستاں پر

تم آزادِ حزیں! غربت میں کیوں گھبرائے جاتے ہو — جہاں تک ہو، نظر رکھو خدا کے فضل و احساں پر

اواخر مارچ ۱۹۱۱ء - انبالہ چھاؤنی - طرح مرغوب

نہ یہ سامان پیدا کر، نہ وہ سامان پیدا کر — بہ استقلال یکسو ہو کے اطمینان پیدا کر

نرالی آن پیدا کر، انوکھی شان پیدا کر — جگر زخمی، دل آشفتہ، نظر حیران پیدا کر

محبت تجھ کو آداب محبت خود سکھا دے گی — ذرا آہستہ آہستہ اُدھر رجحان پیدا کر

جو اُلفت ہے تو اُلفت کی نظر سے مطمئن فرما — جو دعوے ہے تو دعوے پر کوئی برہان پیدا کر

تغافل پر تغافل کوششِ تحصیلِ حاصل ہے — جفا میں بات پیدا کر، ستم میں شان پیدا کر

مآلِ کارِ اظہارِ تمنّا کیا گزارش ہو ۔۔۔ طبیعت طنز کرتی ہے کہ "او ارمان پیدا کر"
اگر آزادؔ سا درویش نظروں میں نہیں جچتا ۔۔۔ تو جا، اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

اوائل دسمبر ۱۹۲۶ء ۔ حیدر آباد دکن ۔ برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان حضرت مولانا ضامن کنتوری[1]

جہاں تک ہو، مذاقِ آرزوئے یار پیدا کر ۔۔۔ جہاں تک ہو، خیالِ ماسوا سے عار پیدا کر
نظر کیفی، طبیعت مست، دل سرشار پیدا کر ۔۔۔ جو پیدا کر سکے، یہ حالِ صہبا بار پیدا کر
یہ مانا، الفتِ دلدار کے جذبات صادق ۔۔۔ مگر پہلو میں دل تو قابلِ دلدار پیدا کر
نگاہِ لطف کی جائے گی، اس کی فکر لاحاصل ۔۔۔ مگر حالت نگاہِ لطف کی حقدار پیدا کر
زباں تک شکوۂ محرومیٔ دیدار آنا تھا ۔۔۔ خطاب آیا کہ "جا اور طاقتِ دیدار پیدا کر"
ابھی سے غایتِ فدویّت و ایثار کے دعوے؟ ۔۔۔ ابھی تو عادتِ فدویّت و ایثار پیدا کر
اگر دیر و حرم کی خاک چھانی بھی تو کیا حاصل ۔۔۔ جہاں تک ہو، خراباتِ مغاں میں بار پیدا کر
تجھے اے آزادؔ! یوں درویشِ کامل کون مانے گا ۔۔۔ جہاں سے ہو، جریب و جبّہ و دستار پیدا کر

ناتمام غزلیات کے اشعار

یکم جنوری ۱۹۰۸ء ۔ سہارنپور

شاد کر، ہم غمزدوں کو شاد کر ۔۔۔ یاد کر، حق ہائے خدمت یاد کر

[1] دیکھو صفحہ (۳۳) حاشیہ (۱)

۱۵ مئی سنہ ۱۹۳۰ء حیدرآباد دکن

آ، ثبوتِ مہر و اُلفت پیش کر | لا، کوئی دعوے پہ حجت پیش کر

ڑ

اواخر نومبر سنہ ۱۹۲۵ء - حیدرآباد دکن - طرحِ طبع زاد

پھر اُمید ہے اور نئی چھیڑ چھاڑ | پھر ارمان ہیں اور وہی بھیڑ بھاڑ
اُدھر تو کہ ہر لحظہ مصروفِ عیش | اِدھر میں کہ ہر لمحہ مجھ کو پہاڑ
جو ممکن ہو، ہر نیک و بد سے نباہ | نہ اس سے بگاڑ اور نہ اُس سے بگاڑ
جو قُربِ خدا کا طلبگار ہے | تو نخلِ خودی بیخ و بُن سے اُکھاڑ
اگر جلوۂ حق کے ارمان ہیں | تو گردِ ریا دامنِ دل سے جھاڑ
جہاں تک بنے، نفس کو زیر کر | جہاں تک بنے، اِس لعین کو پچھاڑ
کسی دوست دشمن کا دعوٰی نہ کھا | نگاہوں کو بھانپ اور ارادوں کو تاڑ
وہی نوعِ انساں ہے اور وحشتیں | وہی قتل و غارت، وہی مار دھاڑ
پھر آزاد ! کُل خلق گرویدہ ہو | پھر ایسا کوئی خاص کا جل لُگا پاڑ

وسطِ دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء - حیدرآباد دکن - طرحِ طبع زاد

آرزوئے کرمِ یار نہ چھوڑ | دامنِ دولتِ سرکار نہ چھوڑ

تشنۂ لذتِ آزار نہ چھوڑ
اپنے بیمار کو بیمار نہ چھوڑ

خبطِ تسبیح میں کیا رکھا ہے
رشتۂ اُلفتِ زُنّار نہ چھوڑ

چشمِ ساقی! تجھے ساغر کی قسم
ایک کو بزم میں ہُشیار نہ چھوڑ

دادِ ارمانِ نظر دیتا جا
آنکھ کو تشنۂ دیدار نہ چھوڑ

دوست کی چشمِ کرم کے طالب!
دوست کے نام کی تکرار نہ چھوڑ

اگر ارمانِ مئے کوثر ہے
خدمتِ خانۂ خُمّار نہ چھوڑ

خاک تک رشکِ طلا کر دکھلا
کوئی شے دہر میں بیکار نہ چھوڑ

آ، اور آزاد کو آزادی دے
رنجِ فرقت میں گرفتار نہ چھوڑ

ز

اوائل اپریل سنہ ۱۹۲۰ء - دہلی - بر طرح میرزا غالب علیہ الرحمتہ

تو کہ ہر وقت غرقِ جلوۂ ناز
میں کہ دِن رات سجدہ ہائے نیاز

بارک اللہ! دِلربا انداز
آنکھ میں سِحر، بات میں اعجاز

میری اُمید، یاس کی تمہید
میری تسکین، درد کا پرداز

میرے حِصّے کا اِضطرابِ ازل
میرے قصّے کا دردِ نے آغاز

تیرے گھر کے طواف، میرا حج
تیرے در کے سُجود، میری نماز

تیری منزل، بلند تر منزل — میری پرواز، پست تر پرواز
وہ کمالِ کرم، وہ غایتِ قرب — وہ وصالِ بہم، وہ رازونیاز
طاقتِ ضبطِ راز سلب نہ کر — جو مرا راز خود وہ تیرا راز
تم ہمارے ہو، ہم تمھارے ہیں — دل کی آواز غیب کی آواز
شکرِ احسان دوست، دل بخشا — اور وہ دل کہ درد سے ممتاز
سرمدی زندگی عطا کر دی — اے غمِ دوست! تیری عمر دراز
بندہ پرور! اب آپ کا آزاد — خود ہی بندہ ہے، خود ہی بندہ نواز

س

اوائلِ جولائی ۱۹۲۵ء ۔ حیدرآباد دکن ۔ طرحِ طبع زاد

وہ شیدائے اصنام ہے اور بس — یہہ عہدِ درو بام ہے اور بس
گل آفاق اب تک بایں عقل ورائے — گرفتارِ اوہام ہے اور بس
وجودِ خدا کی تلاشیں عبث — فقط نام ہی نام ہے اور بس
نہ اذکارِ دنیا، نہ افکارِ دیں — حدیثِ مے و جام ہے اور بس
وہی ہم ہیں اور شغلِ بیکارِ عشق — وہی فرصتِ نام ہے اور بس

زمانہ ہے اور کوشش و جِدّ و جہد — مگر ہم ہیں، آرام ہے اور بس
نہ آزاد میکش، نہ شاہد پرست — وہ کمبخت بدنام ہے اور بس

اواخر اگست ۱۹۲۵ء حیدرآباد دکن۔ طرحِ طبع زاد

تُو ہے اور فکرِ جفا ہے اور بس — میں ہوں اور شکرِ خدا ہے اور بس
بندہ پرور! اِس طرف بھی اِک نظر — اِک نظر کی اِلتجا ہے اور بس
یا تو دل تھا اور لاکھوں مدّعا — یا دلِ بے مدّعا ہے اور بس
کوئی بارِ عشق اُٹھا سکتا بھی ہو — اِدّعا ہی اِدّعا ہے اور بس
عادتِ چُون و چرا کے دن گئے — اب سرِ صبر و رضا ہے اور بس
کل تک اِصرارِ خطا تھا، لیکن آج — میں ہوں، اِقبالِ خطا ہے اور بس
ہو چکے دُنیا کے شکوے ہو چکے — اب فقط تجھ سے گلا ہے اور بس
ناخدا بھی ناخُدائی کر چکے — اب خُدا کا آسرا ہے اور بس
دوستو! ناصح مرا دشمن نہیں — اِک ذرا سر پھر گیا ہے اور بس

ش

وسط اکتوبر ۱۹۲۵ء حیدرآباد دکن۔ طرحِ طبع زاد
مُسلسل بہ طرزِ ترصیعِ جدید

نہ اب[۲] وہ زمانِ طرب زائے عیش — نہ اب وہ جہانِ تماشائے عیش

(۱) دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

نہ اب وہ بہارِ گُل و مل سے ربط — نہ اب وہ دلِ مستِ صہبائے عیش
نہ اب وہ تسکارِ بطِ مے کا خبط — نہ اب وہ سرِ صرفِ سودائے عیش

نہ اب وہ ضیا باریٔ اِنبساط — نہ اب وہ فروغِ تجلّائے عیش
نہ اب وہ تماشائے کیفِ نشاط — نہ اب وہ بہارِ دل آرائے عیش

نہ وہ دورِ ہیجانِ شوقِ طرب — نہ وہ شوقِ اُمید افزائے عیش
نہ وہ عہدِ ارمانِ ذوقِ طرب — نہ وہ ذوقِ آمادہ فرمائے عیش

نہ وہ عالمِ جلوہ زارِ خوشی — نہ وہ جلوۂ عیشِ بالائے عیش
نہ وہ موسمِ نوبہارِ خوشی — نہ وہ رونقِ بزمِ زیبائے عیش

نہ وہ نظمِ عشرت، نہ وہ اہتمام — نہ وہ ہر طرف سے تقاضائے عیش
نہ وہ بزمِ صہبا، نہ وہ دورِ جام — نہ وہ صحبتِ غرقِ دریائے عیش

نہ وہ ساقیانِ سراپا جمال — نہ وہ بادہ ہائے گوارائے عیش
نہ وہ مطربانِ عدیم المثال — نہ وہ نغمہ ہائے طرب زائے عیش

نہ وہ مجمعِ شاہدانِ شکیل — نہ وہ محفلِ جلوہ آرائے عیش
نہ وہ اجتماعِ حسین و جمیل — نہ وہ جلسۂ رنگ پیرائے عیش

نہ اگلی سی تائیدِ بختِ رسا | نہ پہلی سی توفیقِ اجرائے عیش
نہ قسمت سے تسکینِ دل کا پتا | نہ شامت سے اُمّیدِ احیائے عیش

تم آزادؔ اور آہ یہہ حالِ زار
کبھی ہائے عشرت، کبھی ہائے عیش

ص

وسطِ ستمبر ۱۹۲۵ء حیدرآباد دکن۔ طرحِ طبع زاد[1]
مسلسل بہ طرزِ ترصیع جدید

[2] وہ سُرورآفریں حیاتِ خاص | وہ طرب خیز واقعاتِ خاص

وہ ترا شوقِ بزم آرائی | وہ تری شرکتیں بہ ذاتِ خاص
وہ ترا ذوقِ عیش پیرائی | اور وہ اخذِ تلذّذاتِ خاص

وہ محل، وہ قصور، وہ ایواں | اور وہ ہر سُو تکلّفاتِ خاص
وہ نئے ساز، وہ نئے ساماں | اور وہ دلکش تنوّعاتِ خاص

---

[1] دیکھو صفحہ (۱) حاشیہ (۱)
[2] یہ غزل "عیشِ رفتہ کی یاد" کی سُرخی سے رسالہ "نگار" میں شائع ہو چکی ہے۔ آزادؔ انصاری۔

وہ وفا دوست مجمعِ احباب | اور وہ باہم تعلّقاتِ خاص
وہ ہم آہنگ صحبتِ نایاب | اور وہ دل چسپ تذکراتِ خاص

وہ ندیمانِ دُور بین و عقیل | اور وہ حلِّ صد نکاتِ خاص
وہ جلیسانِ نازنین و جمیل | اور وہ آن کا التفاتِ خاص

وہ کبھی دعوتِ غزل خوانی | اور وہ رنگیں مباحثاتِ خاص
وہ کبھی رخصتِ سخن رانی | اور وہ علمی مُناظراتِ خاص

وہ گھٹائیں، وہ میکشی لبِ آب | اور وہ لُطفِ ترشّحاتِ خاص
وہ بہاریں، وہ دور ہائے شراب | اور وہ نُقل و تفکّہاتِ خاص

وہ بلا خوف اشتراکِ طرب | وہ سرور و تکیّفاتِ خاص
وہ بلا خطرہ انہماکِ طرب | وہ نذرِ شغلِ مُسکراتِ خاص

وہ ہجومِ مُغنّیانِ حسیں | وہ سرود و ترنّماتِ خاص
وہ ادا ہائے دلکش و رنگیں | وہ صدا ہائے نغمہ جاتِ خاص

وہ نگارِ بارشِ انوار | وہ نزولِ تجلّیاتِ خاص
وہ نقطِ نور سے کے در و دیوار | وہ ضیا بارِ کائناتِ خاص

وہ تماشائے منظرِ صد عیش　　اور وہ ہر عیش کو ثباتِ خاص
وہ بہارِ طرب کے جیش کے جیش　　اور وہ اک عالمِ حیاتِ خاص

وہ زمانِ تحیّراتِ عجیب　　وہ جہانِ تعجّباتِ خاص
وہ ہزاروں مکاشفاتِ عجیب　　وہ ہزاروں مشاہداتِ خاص

وہ نگاہِ عنایتِ ہردم　　وہ خیالِ توجّہاتِ خاص
وہ وفورِ کرامتِ پیہم　　وہ کمالِ تلطّفاتِ خاص

وہ وفا کے تصرّفاتِ مزید　　وہ قبولِ مطالباتِ خاص
وہ محبّت کے معجزاتِ نقید　　وہ حصولِ تقرّباتِ خاص

وہ مسلسل معانقے باہم　　وہ خوشی کے تصادماتِ خاص
وہ دمادم وصالہائے اتم　　وہ طرب کے تراکماتِ خاص

ہائے! وہ دورِ گلفشانِ طرب　　ہائے! وہ عہدِ خوش صفاتِ خاص
ہائے! وہ فرصتِ زمانِ طرب　　ہائے! وہ عالمِ حیاتِ خاص

بس اب آزاد! بس کہ پیشِ عوام
نامناسب ہیں تذکراتِ خاص

ناتمام غزل کا ایک شعر

۵ ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء حیدرآباد دکن

جان قربانِ التفاتِ خاص   تم یہ تکلیف اور بہ ذاتِ خاص؟

ض

وسط مارچ سنہ ۱۸۹۹ء - بنگلہ فاضلکا ضلع فیروزپور (پنجاب) طرح طبع زاد

شکوۂ جور و جفا سے کیا غرض   کیا غرض اِک لیے وفا سے کیا غرض

اب کوئی اُمید ہی دل میں نہیں   زحمتِ بیم و رجا سے کیا غرض

دل جہاں بہلے وہی گلزار ہے   باغ و گلشن کی فضا سے کیا غرض

مجھ کو اپنی زندگی دوبھر نہیں   التفاتِ جاں فزا سے کیا غرض

آپ کے ارمان بھی تھوڑے نہیں   جستجوئے ماسوا سے کیا غرض

آپ کی حسرت بھی ناکافی نہیں   خواہشِ ہر دو سرا[1] سے کیا غرض

اب سراپا مدعا ہوں، اب مجھے   عرضِ حالِ مدعا سے کیا غرض

آپ تکمیلِ ستم فرمائیے   آپ کو خوفِ خدا سے کیا غرض

جن کو توفیقِ مے و معشوق ہے   اُن کو خبطِ اتقا سے کیا غرض

[1] میں لفظِ "دو" بہ اشباع کو فارسی ترکیب میں بھی جائز و فصیح سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری۔

حضرتِ آزادؔ ہم اک رند ہیں پارسا یا نہ ریا سے کیا غرض

ط

اوا خر جنوری ۱۹۲۶ء - حیدرآباد دکن - طرحِ طبع زاد
مسلسل بطرزِ ترصیعِ جدید

نہ وہ عالمِ جلوہ زارِ نشاط[۲] نہ وہ جلوہ ہائے بہارِ نشاط

نہ وہ طاقتِ انتظاماتِ عیش نہ وہ قدرتِ اختیارِ نشاط
نہ وہ فرصتِ انصراماتِ عیش نہ وہ رخصتِ کاروبارِ نشاط

نہ وہ صورتِ ہستیٔ انبساط نہ وہ جانِ امیدوارِ نشاط
نہ وہ شکلِ بدمستیٔ انبساط نہ وہ خاطرِ دوستدارِ نشاط

نہ وہ سوز و سازِ نوائے طرب نہ وہ مطربِ نغمہ کارِ نشاط
نہ وہ مستیٔ جانفزائے طرب نہ وہ ساقیٔ بادہ بارِ نشاط

نہ وہ محفلِ مستِ صہبائے کیف نہ وہ جلسۂ بادہ خوارِ نشاط
نہ وہ صحبتِ غرقِ دریائے کیف نہ وہ بادۂ خوشگوارِ نشاط

[۵۲] یہ غزل "سوگوارِ نشاط" کی سرخی سے رسالہ "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہو چکی ہے۔ آزاد انصاری۔

[۵] دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

نہ وہ مجمعِ گل رخانِ صبیح
نہ وہ حسنِ صبحِ بہارِ نشاط

نہ وہ اجتماعِ بتانِ ملیح
نہ وہ لطفِ شبہائے تارِ نشاط

نہ وہ دورِ ایامِ لطف و خوشی
نہ وہ قسمتِ سازگارِ نشاط

نہ وہ عہدِ ایامِ لطف و خوشی
نہ وہ طالعِ حق گزارِ نشاط

نہ وہ ہر طرف جلسہ ہائے طرب
نہ وہ ہر طرف انتشارِ نشاط

نہ وہ ہر طرف جلوہ ہائے عجب
نہ وہ ہر طرف اشتہارِ نشاط

نہ وہ بزمِ عشرت، نہ وہ دورِ جام
نہ وہ گردشِ روزگارِ نشاط

نہ وہ عیش کے نو بہ نو اہتمام
نہ وہ رنگِ لیل و نہارِ نشاط

نہ وہ آرزو کامیابِ خوشی
نہ وہ شوق دل ہمکنارِ نشاط

نہ وہ خوش نصیبی، نہ وہ خوش دلی
نہ وہ زندگی سختِ کارِ نشاط

ادھر حالِ دل، فرطِ غم سے نزار
اُدھر جان حسرت شعارِ نشاط

جسے دیکھیے، مضطرب، بیقرار
جسے پوچھیے، سوگوارِ نشاط

بس آزاد! کب تک یہ اظہارِ غم
کہاں ہم، کہاں وہ بہارِ نشاط

اوائل فروری سنہ ۱۹۲۶ء ۔ حیدر آباد دکن ۔ طرح طبع زاد

اب نہ وہ اربابِ اُلفت کا لحاظ　　اب نہ وہ مہر و محبت کا لحاظ
اب نہ وہ باہم دگر ملت کی شرم　　اب نہ وہ صاحب سلامت کا لحاظ
کچھ مرے جذباتِ اُلفت پر نظر　　کچھ مری دیرینہ خدمت کا لحاظ
اب بترکِ قصدِ گنہ آساں نہیں　　دل ہے اور اُس کی معیت کا لحاظ

اب نہ وہ دن رات شغلِ نائے و نوش　　اب نہ وہ اوقاتِ فرصت کا لحاظ
اب نہ وہ شوقِ طرب کا احترام　　اب نہ وہ ذوقِ طبیعت کا لحاظ
اب نہ وہ ارمانِ بہجت کا ادب　　اب نہ وہ سودائے عشرت کا لحاظ
اب نہ ظاہر پر نہ باطن پر نظر　　اب نہ صورت کا نہ سیرت کا لحاظ
اب نہ تنگی کا نہ وسعت کا خیال　　اب نہ کثرت کا نہ قلت کا لحاظ

قطعہ

جائیے، بس شیخ صاحب جائیے　۱　ہو چکا حضرت سلامت کا لحاظ
تم کو اپنے حلقۂ بیعت کی شرم　۲　ہم کو اپنے اہلِ صحبت کا لحاظ

حضرتِ آزاد! آخر تا کجا　　ایک یارِ بے مروت کا لحاظ

ع

وسطِ دسمبر ۱۹۲۵ء - حیدرآباد دکن - طرح طبع زاد

[1] دل اور یاس و حسرت کا یہ اجتماع
بس اب اے اُمید! الوداع، الوداع

زہے! تیری دلچسپ طرزِ کلام
جسے دیکھیے، محو ذوقِ سماع

ترا سنگِ در خلق کی سجدہ گاہ
ترا آستاں دو[2] جہاں کا مطاع

جو تارے ترے جلوے کی اک کرن
تو سورج ترے نور کی اک شعاع

اُس انوارِ سرتا بہ پا کا وجود
کُل انوار کا نقطۂ اجتماع

ہزاروں ستم حوصلے سے سہے
مگر آہ! اُمید کا انقطاع

شکست، اب مقدر سمجھیے شکست
کہ ذکرِ تحفظ نہ فکرِ دفاع

ہم آزاد! حسّاد سے کیوں ڈریں
نہ صاحب وجاہت، نہ اہلِ متاع

---

[1] میں نے یہ غزل عجیب یاس و انتشار - اور بے اطمینانی کے عالم میں لکھی تھی - بعض ناگوار حالات ایسے رُونما ہو گئے تھے کہ دل حیدرآباد کی سکونت سے بیزار ہو گیا تھا - اور عزم بالجزم کر لیا تھا کہ جلد راہیِ وطن ہو جاؤں گا - مگر ایسی حالت میں بعض احباب نے عموماً - اور حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے (جن کے احسانات عظیم کے بارے میں کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا) خصوصاً ہر قسم کی امداد کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائی - جس سے اک بڑی حد تک مجھے سکونِ قلب نصیب ہوا - آزاد انصاری

[2] دیکھو صفحہ (۱۷) حاشیہ (۱)

غ

اواخرِ دسمبر ۱۹۲۵ء۔ حیدرآباد دکن۔ طرحِ طبع زاد

مسلسل بہ طرزِ ترصیع جدید[1]

زمیں کو فروغ، آسماں کو فروغ ترے حسن سے* دو جہاں کو فروغ[2]

ترے عکسِ روئے پُر انوار سے تجلائے حسنِ بتاں کو فروغ
ترے جلوۂ مہر آثار سے جمالِ رخِ مہوشاں کو فروغ

ترے عالمِ رنگ گلریز سے گل و گلبن و گلستاں کو فروغ
ترے حسنِ رخسارِ ضو خیز سے مہ و اختر و کہکشاں کو فروغ

ترے لطفِ ہر دم کے احسان سے محبت کی روحِ رواں[3] کو فروغ
تری موجِ پیہم کے فیضان سے دل و دیدہ و دوستاں کو فروغ

---

[1] دیکھو ضمیمہ (۲) حاشیہ (۱)

[2] یہ غزل "فروغِ حسن" کی سرخی سے رسالۂ "نگار" بھوپال میں شائع ہو چکی ہے۔

[3] میں واقف ہوں کہ روح و رواں بہ عطف رائج اور صحیح ہے۔ مگر میں نے اکثر اس کو بہ اضافت استعمال کیا ہے۔ اور دانستہ استعمال کیا ہے۔ اس صورت میں "روح" موصوف ہے۔ اور "رواں" اس کی صفت۔ میرا ذوق اس ترکیب کو اضافی سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ آزاد انصاری۔

* دیکھو ضمیمہ (۱) حاشیہ (۱)

ترے پرتوِ حُسنِ گفتار سے | اَدیبوں کے حُسنِ بیاں کو فروغ
ترے فیضِ نُطقِ گہربار سے | اَدب کو ترقی، زباں کو فروغ

ترے شوقِ عرفاں فزا کے طفیل | کمالاتِ شیخِ زماں کو فروغ
ترے عشقِ میخانہ زا کے طفیل | کراماتِ پیرِ مغاں کو فروغ

تری خوئے داد و دہش کے سبب | زمانے کے سُود و زیاں کو فروغ
تری عدل گُستر روِش کے سبب | جہاں کی بہار و خزاں کو فروغ

فقط تجھ سے باغِ جہاں میں بہار | فقط تجھ سے کارِ جہاں کو فروغ
فقط تجھ سے اِس گلستاں میں بہار | فقط تجھ سے اِس خاکداں کو فروغ

مگر شُہرتِ عشقِ آزاد سے | ترے جلوۂ دلستاں کو فروغ

ف

اوائل اگست ۱۹۲۱ع - دہلی - برطرح مشاعرۂ منعقدۂ محلہ تلیاراں - دہلی

میں ہوں اور میلانِ دل اک دل کے دشمن کی طرف | جُستجوئے رہنما لائی تو رہزن کی طرف
خیر، یارب! آشیانِ بلبلِ بیکس کی خیر | برق منڈلاتی نظر آتی ہے گلشن کی طرف

راہِ اُلفت لاتعد خطرات سے پُر ہے تو ہو
لوٹنا مخدوش تر پاتا ہوں دامن کی طرف*

کون پوچھے، میری کُلفت، میری بیتابی کی بات
کون دیکھے، میری وحشت، میری اُلجھن کی طرف

وہ ترا نفرت سے چتون پھیر کر لے جا عتاب
وہ میرا حیرت سے تکنا تیری چتون کی طرف

پھر تجھے اے دشمنِ زادِ سفر قسمت! نوید
پھر مجھے لُٹنے کی حسرت لائی رہزن کی طرف

مُجھ کو بھی حسرت ہے، میں بھی ہم کلامِ دوستاں ہوں
لے چل، اے ارمان! لے چل دشت ایمن کی طرف

اب کسے معلوم، وحشت میں کہاں کا قصد ہے
اب نہ منزل کی طرف رُخ ہے نہ مسکن کی طرف

کس طرح آزاد! تنہا فوجِ قسمت سے لڑوں؟
اپنے بیگانوں کی جانب، دوست دُشمن کی طرف

ق

اوائل مئی سنہ ۱۹۲۴ء۔ حیدرآباد دکن بطرح طبع زاد

مسلسل بہ طرز ترصیعِ جدید[1]

اے[2] جوانی! اے حرارت! الفراق
اے شباب! اے تاب و طاقت! الفراق

اے متاعِ بے بہائے زندگی!
اے عزیز از جاں امانت! الفراق

اے بہارِ جاں فزائے زندگی!
اے گراں قیمت بضاعت! الفراق

---

[1] دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

[2] یہ غزل "رخصتِ شباب" کی سُرخی سے رسالہ "پیمانہ" آگرہ میں شائع ہو چکی ہے۔

* دیکھو صفحہ (۸۱) حاشیہ (۱)

اے کمالِ بخشش پروردگار! اے خداوندی ودیعت! الفراق
اے مکمل تر عطائے کردگار! اے الٰہی ظلِ رحمت! الفراق

اے طلوعِ صبحِ کلفت! السّلام اے شبِ قدرِ مسرت! الفراق
اے شروعِ شغلِ وحشت! السّلام اے سکونِ دل کی قدرت! الفراق

روزگارِ عزم و ہمت ہو چکا اے وفورِ عزم و ہمت! الفراق
اعتبارِ بخت و قسمت ہو چکا اے غرورِ بخت و قسمت! الفراق

سب نشانِ تاب و طاقت مٹ گیا اے زمانِ تاب و طاقت! الفراق
سب گمانِ استقامت مٹ گیا اے جہانِ استقامت! الفراق

ہر خیالِ عیش سے جی ہٹ گیا اے خیالِ عیش و عشرت! الفراق
ہر ہجومِ لطفِ صحبت چھٹ گیا اے ہجومِ لطفِ صحبت! الفراق

عاشقانہ حوصلوں کے دن گئے اے تعشق۔ اے محبت! الفراق
والہانہ مشغلوں کے دن گئے اے تعلق، اے طبیعت! الفراق

الوداع، اے شوق و حسرت! الوداع الفراق، اے وصل و فرقت! الفراق
الوداع، اے دورِ الفت! الوداع الفراق، اے عہدِ فرصت! الفراق

اے جوانی، اے حبیبِ دلستاں! | اے رفیقِ ہر مصیبت! الفراق
اے شباب! اب تو کہاں اور ہم کہاں | فی امانِ اللہ رخصت - الفراق

حضرتِ آزاد! بس اب کوچ ہے
یعنی اے حضرت سلامت! الفراق

ل

وسط مارچ ۱۹۲۵ء حیدرآباد دکن۔ طرح طبع زاد

ستم دوست! فکرِ عداوت کہاں تک | کہاں تک، وفا سے بغاوت کہاں تک
خلافِ سلوکِ محبّت کے خوگر! | خلافِ سلوکِ محبّت کہاں تک
مسلسل ستم کی حکومت کے بانی! | مسلسل ستم کی حکومت کہاں تک
سماعت نہ پرسش، توجّہ نہ پروا | تمنّائے اظہارِ حالت کہاں تک
نہ ذکرِ تلطّف، نہ فکرِ مدارا | تقاضائے چشمِ عنایت کہاں تک
خیالِ نگاہِ عنایت تو برحق | مگر بے محل، بے ضرورت کہاں تک
اٹھو، درد کی جستجو کر کے دیکھیں | تلاشِ سکونِ طبیعت کہاں تک
کبھی حکمِ پیرِ مغاں بھی بجا لا | فقط اتباعِ شریعت کہاں تک
کبھی شاہدِ مے کا بھی حق ادا کر | لگاتار کفرانِ نعمت کہاں تک

بس اب وقتِ فرصت نہیں لوٹ سکتا[1] ‏ ‏ ‏ ‏ بس اب ماتمِ وقتِ فرصت کہاں تک
کبھی کچھ نتیجہ نکلا تو جانیں ‏ ‏ ‏ ‏ فقط خبطِ معلول و علت کہاں تک
اب آزاد! اُٹھو، رُوح کا کھوج ڈھونڈیں ‏ ‏ ‏ ‏ سوئے مادّیات رغبت کہاں تک

گ

اوائل جنوری ۱۹۲۴ء - حیدر آباد دکن - طرح طبع زاد

کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ ‏ ‏ ‏ ‏ بھاگ، بلائے عشق سے بھاگ
زلفوں والو! یہ اندھیر؟ ‏ ‏ ‏ ‏ دُہرے دُہرے کالے ناگ
مَاشَاءَاللہ! طرزِ کلام ‏ ‏ ‏ ‏ جیسے کوئی دلکش راگ
فقرے ہیں یا قند و نبات ‏ ‏ ‏ ‏ باتیں ہیں یا موتی پاگ
قتلِ جہاں اور پھر یہ ستم ‏ ‏ ‏ ‏ ہُولی ہے ہولی، پھاگ ہے پھاگ
میرا سَر اور تیرا دَر ‏ ‏ ‏ ‏ دَھن مری قسمت، دَھن مرے بھاگ
خوابِ غفلت ٹھیک نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ جاگ، اے غافل! وقت ہے جاگ
حیف - آزادِ دانا! حیف ‏ ‏ ‏ ‏ تم اور اُلفت کا کھڑ اگ

---

[1] سُنا ہے کہ اہلِ لکھنؤ "لوٹنا" کو بجائے "پلٹنا" کے خلاف فصاحت سمجھتے ہیں مگر میں کیا کروں کہ مجھے "لوٹنا" زیادہ فصیح معلوم ہوتا ہے۔ ۔ ۔
آزاد انصاری

۱۰ اپریل فروری ۱۹۳۴ء حیدرآباد دکن۔ طرحِ طبع زاد

شانِ شکوہ مانگ نہ اعزاز و جاہ مانگ — عشاقِ دلفگار کا حالِ تباہ مانگ
تخت و کلاہ مانگ نہ فوجِ سپاہ مانگ — صرف اک گدائی درِ خدامِ شاہ مانگ
دیدار کی طلب کے طریقوں سے بے خبر! — دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ
بارائے زہد و تابِ ورع کچھ طلب نہ کر — توفیق ہو تو صرف مجالِ گناہ مانگ
مقسومِ دائرہ کون میں مانگنا فضول — جب مانگنا ہے، طالعِ خورشید و ماہ مانگ
جو چاہنا ہے چاہ، مگر قاعدے کے ساتھ — جو مانگنا ہے، مانگ مگر راہ راہ مانگ
آزاد! سوئے عشقِ بتاں میل تا کجا — تو اور یہ وبال؟ خدا سے پناہ مانگ

ل

۱۴ جون ۱۸۹۸ء۔ قصبۂ نانوتہ ضلع سہارنپور۔ طرحِ طبع زاد

فغاں بے سبب، آہ و زاری فضول — تمہارے لئے بے قراری فضول
وہ اُمیدوارانہ حالت کہاں — یہ اندازِ غفلت شعاری فضول
وہ صبر و تحمل کی طاقت کہاں — دلاسے عبث، غمگساری فضول
وہ بگڑی نہیں ہے کہ بن جائے گی — مقدر کی ناسازگاری فضول
ترا درد پھرتا بہ لب آ چلا — کوئی کوششِ پردہ داری فضول

کوئی بات پوچھے، وہ قسمت کہاں — تقاضائے بے اختیاری فضول

نہ وہ دل، نہ وہ شوقِ سیرِ چمن — یہ نیرنگِ فصلِ بہاری فضول

وہ رنگینیٔ طبع ہی مٹ گئی — گلستاں کی سب لالہ کاری فضول

ہمارے چمن میں بہار آ چکی — ترے لطف کی آبیاری فضول

نصیحت مجھے ناسزاوار ہے — یہ احباب کی غمگساری فضول

قطعہ[1]

بطرز ترصیع جدید

وہاں آپ اور بے نیازی سے ربط ۱ شکایاتِ غفلت شعاری فضول

وہاں آپ اور کج ادائی کا خبط ۲ حکایاتِ بے اختیاری فضول

وہاں آپ اور قحطِ مہر و وفا ۳ مرا خبطِ امیدواری فضول

وہاں آپ اور میلِ جور و جفا ۴ مری حسرتِ کامگاری فضول

وہاں آپ اور دشمنی پر نظر ۵ مری کوششِ دوستداری فضول

وہاں آپ اور دوستوں سے حذر ۶ مری دوستی، میری یاری فضول

وہاں آپ اور قدردانی سے عار ۷ مرا شوقِ خدمت گزاری فضول

وہاں آپ اور دل دکھانا شعار ۸ مرا جذبۂ جاں نثاری فضول

وہاں آپ اور جوشِ دریائے عیش ۹ مری شدتِ اشکباری فضول

وہاں آپ اور شور و غوغائے عیش ۱۰ مری آہ و فریاد و زاری فضول

[1] دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

جہاں رات شغلِ طرب میں کٹے ۱۱ مری رات بھر بے قراری فضول

جہاں دن کے بارہ بجے صُبح ہو ۱۲ مری شب بھر اختر شماری فضول

تم آزاد! کس دام میں آ پھنسے ۱۳ بس اب کوششِ رستگاری فضول

یکم فروری ۱۹۱۰ء - سہارنپور - طرحِ طبع زاد

ستم پرور! محبت پر ستم ڈھانے سے کیا حاصل — سرِ اُمید بے دردانہ ٹھکرانے سے کیا حاصل

مسلسل واقعاتِ درد دُہرانے سے کیا حاصل — کہاں تک؟ معرضِ اظہار میں لانے سے کیا حاصل

اگر دل لے کے دلداری میں کسرِ شاں سمجھتے ہو — تو اتنے دلبری کے جال پھیلانے سے کیا حاصل

یہاں تک میں بھی قائل ہوں کہ سمجھانا ضروری ہے — مگر یہ بھی تو سمجھا دو کہ سمجھانے سے کیا حاصل

اگر ارشادِ عالی ہو تو میں مایوس ہو جاؤں — بہت اغماض کی تکلیف فرمانے سے کیا حاصل

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء - لاہور

کام اور وہ بھی دیر طلب — فرصت عُنقا، وقت قلیل

م

اوائل جنوری ۱۹۱۰ء - پٹیالہ (ریاست) طرحِ طبع زاد

وہاں اب تک وہی تُو اور وہی اغماض کا عالم — یہاں اب تک وہی بیتابیاں اور کُلفتِ پیہم

تری چشمِ کرم میں سحر ہو، اعجاز ہو، کچھ ہو — نہ میرے درد کا درماں، نہ میرے زخم کا مرہم

مرا بوسیدہ بیڑا اور یہ حالت تلاطم کی — مری ٹوٹی سی کشتی اور یہ طوفان کا موسم
نہ وہ یارانِ زندہ دل نہ وہ زندہ دلی باقی — قیامت ہے کہ ہم ہیں اور دلِ مرحوم کا ماتم
طبیعت ہے، کہ خود رفتہ، مقدر ہے کہ برگشتہ — نہ وہ سامانِ خوش وقتی، نہ دل وہ دل، نہ ہم وہ ہم
زمانہ بھر ہمارے واسطے وحشت سرا ٹھیرا — نہ وہ اسبابِ دلچسپی، نہ وہ دنیا، نہ وہ عالم
مجھے آزاد! اگر کوئی کسی قابل سمجھتا ہے — تو اُس کا حُسنِ ظن ہے ورنہ "من آنم کہ من دانم"

وسطِ جولائی ۱۹۰۹ء سہارنپور۔ طرحِ طبع زاد

اُمید[1] سو وہ مفقود، ارمان سو وہ معدوم — اے وائے دلِ مرحوم! صد وائے دلِ مرحوم!!
طالب ہوں مگر ناکام، سائل ہوں مگر محروم — تقدیر مری تقدیر، مقسوم مرا مقسوم
اب دل کی نہ کچھ پوچھو، اب دل کا خدا حافظ — مانوس نہ کچھ مایوس، مسرور نہ کچھ مغموم
قربانِ خصوصیت، کیا رسم ہے کیا ملت — اُلفت ہے سو وہ مشکوک، نسبت ہے سو وہ موہوم
بس عذرِ خطا کب تک، بس شکرِ جفا کب تک — ظاہر ہے کہ تو ظالم، ثابت ہے کہ ہم مظلوم
قسمت ہے وہ ملزوم ہوں، شامت ہے وہ مجرم ہوں — جو داد سے بھی محروم، بیداد سے بھی محروم
غمخوار یہ کہتے ہیں "درمانِ غم آساں ہے" — آثار یہ کہتے ہیں "خیریتِ جاں معلوم"

آزاد کی مے خواری آزاد کا حصہ تھی
جب پی تو یہ کہہ کر پی۔ "النادرُ کالمعدوم"

---

[1] میں لفظ "سو" کو قابلِ ترک نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اردو میں اسکا کوئی بدل موجود نہیں ہے۔ آزاد انصاری

وسطِ ستمبر سنہ ۱۹۱۹ء۔ علی گڈھ۔ برطرحِ مشاعرۂ منعقدۂ مکان سید محمد[۱] ہادی صاحب ہادی وکیل مچھلی شہری واقع احاطۂ چھتاری۔ علی گڈھ

جانتے ہیں، قادرِ ہر کار تم، بے کار ہم
مانتے ہیں، فاعلِ مختار تم، ناچار ہم

حسن کی اقلیم کے مغرور شاہنشاہ تم
عشق کی سرکار کے بدبخت خدمتگار ہم

اب ہمیں جب دیکھیے، ہم شاغلِ تسبیحِ دوست
اب ہمیں جب پوچھیے، محوِ خیالِ یار ہم

چھوڑ بیٹھے، عشق میں قیدِ مذاہب کا خیال
توڑ بیٹھے، رشتہ ہائے سبحہ و زنار ہم

یہ بھی الفت کوئی الفت ہے کہ یکرنگی نہیں
یہ بھی نسبت کوئی نسبت ہے، کہ گل تم، خار ہم

آج فرصت مل چکی ہے، آمد و شدِ زیست سے
آج رخصت چاہتے ہیں، اے غمِ دلدار! ہم

کاش! ہمدردوں کے دل تابِ سماعت لاسکیں
آج کرنا چاہتے ہیں، درد کا اظہار ہم

المدد، اے رہنمائے راہِ الفت! المدد
پہلی منزل ہے اور اس پہ موت[۲] سے دوچار ہم

جب صدا آئی کہ "بارِ عشق اٹھا سکتا ہے کون"
ہم بڑھے اور بے دھڑک بولے کہ "ہم سرکار ہم"

کاش! مرکز کی کشش مرکز کی جانب کھینچ لے
گردِ مرکز گھومتے ہیں صورتِ پرکار ہم

---

[۱] مولانا سید محمد ہادی صاحب ہادی بی۔اے۔ال۔ال۔بی علیگ مچھلی شہری عمر قریباً ۵۰ سال حال مقیم الہ آباد دورِ جدید کے نامور اور بلند فکر شعرا میں سے ہیں۔ آپ نے بہت پرگو اور رسا طبیعت پائی ہے آپ ایک ایک نشست میں کئی کئی غزلیں بے تکلف لکھ جاتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ آپ کا کوئی شعر معیارِ شاعری سے گرا ہوا نہیں ہوتا۔ آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور جو کچھ کہتے ہیں ایک خاص انداز میں بہت خوب کہتے ہیں۔ مجھ کو ایک عرصے سے آپ کی خدمت میں ایک نیاز خصوصی ہی حاصل نہیں بلکہ میں ہنوز آپ کے احسانات گوناگوں کے بار میں بھی دبا ہوا ہوں۔ دعا ہے کہ خداوندِ عالم آپ کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے۔ آزاد انصاری

[۲] دیکھو صفحہ (۷) حاشیہ (۱)

دوستوں کو وحشتیں ہیں دشمنوں کو نفرتیں — یار پر بھی بار ہم تھے، اغیار پر بھی بار تھے
اب ہمیں آزاد! تم آزاد کہنا چھوڑ دو — قید ہی میں یار ہم بے [illegible] زندگی کی قید کا

ناتمام غزل کے اشعار

۱۸ ستمبر ۱۹۱۹ء علی گڑھ

اُس طرف تکلیفِ چشمِ لطف سے معذور تم — اِس طرف تعمیلِ حکمِ ضبط سے ناچار ہم
کاش! رو سکتے کسی دن اپنے دل کا درد دُکھ — کاش! یا ہو سکتے کسی دن حاضرِ دربار ہم
اور بھر سکتے ہیں، چندے سرخرو ہوتے تم — اور کر سکتے ہیں، اک دو نالۂ خونبار ہم

وسط فروری ۱۸۹۸ء۔ سہارنپور۔ بر طرح مشاعرہ تحصیلی اسکول سہارنپور

آزاد! ناؤ کا جو کوئی ناخدا نہیں — اچھا، خدا پہ چھوڑ بھی دو، کیا خدا نہیں؟
اے ابرِ نوبہار! تری کچھ خطا نہیں — اپنا چمن ہی قابلِ نشو و نما نہیں
تیرا خیال دل سے بھلا کر خجل ہوں — رنجش ہو، التفات ہو، کچھ مدعا نہیں
اس طرزِ التفات سے للہ درگزر — ظالم! مجھے ضرورتِ پاسِ وفا نہیں
اے کاش! کوئی لطف سے پرسانِ حال ہو — ہونے کو اپنے جی میں سبھی کچھ ہے، کیا نہیں

میں اِک نیاز مند ہوں، تُو بے نیاز ہے — آخر مجھے تو ہے، جو تجھے واسطا نہیں

اب تو ملا تو اس ترے ملنے کی کیا خوشی — اب اپنی جستجو ہے کہ اپنا پتا نہیں

بے چارگی نے صبر کا خوگر بنا دیا — سو کلفتیں ہیں۔ اور زباں پر گلا نہیں

آزاد! ایک جرعۂ مے سے یہ اجتناب؟ — تم کچھ ولی نہیں ہو، کوئی پارسا نہیں

اوائل فروری سنہ ۱۸۹۹ء۔ ٹونک (ریاست) طرحِ طبع زاد

وہ نا فکرمندانہ صورت کہاں — وہ نا دردمندانہ حالت کہاں

وہ دل جمعیٔ رنج و راحت کہاں — وہ بے فکریٔ عیش و کلفت کہاں

وہ سر یا وہ سودائے عشرت کہاں — وہ دل یا وہ ارمانِ راحت کہاں

وہ یکسوئیٔ طبع ہی مٹ گئی — وہ حسنِ نظامِ طبیعت کہاں

ہر اِک بات کلفت کا پیغام ہے — وہ خوش وقتیٔ لطفِ صحبت کہاں

ہر اِک چیز وحشت کا سامان ہے — وہ دلچسپیٔ بزمِ عشرت کہاں

کمالِ مصیبت سلامت رہے — کہ پروائے تکلیف و راحت کہاں

ہجومِ تفکر ترقی کرے — کہ تشویشِ تنگیٔ و وسعت کہاں

اُمنگوں، ترنگوں کے دن ہو چکے — وہ جذبات، وہ جوشِ ہمت کہاں

طبیعت پر افسردگی چھا گئی — وہ بے باکیٔ دل، وہ جرأت کہاں

اب اِک دل ہے اور سو غمِ روزگار — کسی کی تمنا کی فرصت کہاں

غمِ فکرِ فردا سے دل تنگ ہوں — کہ انجام بینی کی عادت کہاں

مرا حال گو عبرت انگیز ہے — مگر اہلِ دُنیا کو عبرت کہاں
بس اے گردشِ آسماں! رحم کر — کہ میں خو گرِ رنجِ غربت کہاں
اب آزاد! ہر شکوۂ غم فضول — کہ مشکل حصولِ مسرت کہاں

اوائلِ فروری ۱۸۹۹ء۔ ٹونک (ریاست) طرحِ طبع زاد

وہاں بے نیازی سے فرصت کہاں — یہاں عرضِ حالت کی جرأت کہاں
خیالِ نگاہِ محبت عبث — کہ تابِ نگاہِ محبت کہاں
اُسے کون سے مُنہ سے الزام دوں — وہ کیوں مہرباں ہو کہ قسمت کہاں؟
شکایات بے جا سے کیا فائدہ — وہ کیوں رحم کھائے کہ عادت کہاں؟
اب اِس بے نیازی کو جائز نہ رکھ — کہ صبر و تحمل کی طاقت کہاں
کوئی اِک توجہ کا محتاج تھا — یہہ کیا کج ادائی؟ "کہ فرصت کہاں"
ہوائے وطن ناسزاوار ہے — خیالِ وطن سے وہ راحت کہاں

قطعہ

تری بے نیازی کا ممنون ہوں ۱ — کہ وہ عبرت انگیز حالت کہاں
تری نا اُمیدی کا مرہون ہوں ۲ — کہ وہ نا اُمیدانہ صورت کہاں
ترے جھوٹے وعدوں کو دونا فروغ ۳ — کہ وہ ناشکیبیٔ فرقت کہاں
تری کج ادائی بہت دیکھ لی ۴ — وہ بے چارگیٔ طبیعت کہاں
محبت کے مُنہ سے بہت شرم کی ۵ — وہ دیوانگیٔ محبت کہاں

اُسی طرح بے چین کب تک رہوں ۶ وہ کلفت، وہ سامانِ کلفت کہاں
اُسی طرح مجنوں کب تک پھروں ۷ وہ وحشت، وہ اسبابِ وحشت کہاں
خلافِ طبیعت گوارا بھی ہو ۸ وہ یارائے ضبطِ شکایت کہاں
تلافیٔ مافات بے فائدہ ۹ کہ وہ ہم، وہ دل، وہ طبیعت کہاں

ہم آزاد! کلفت نصیبوں میں ہیں ہمارے مقدر میں راحت کہاں

۳۰ دسمبر ۱۹۰۵ء ۔ کانپور ۔ برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان لالہ پتن لال صاحب رئیسِ کان پور

میں بھی ہوں چشمِ عنایت کے طلبگاروں میں
میں بھی ہوں تیری محبت کے خطاواروں میں

جتنے احباب تھے سب ناصح مشفق نکلے
ایک غمخوار حقیقی نہیں غمخواروں میں

دیکھئے! وحشتِ خاطر کا نتیجہ کیا ہو
جی بہلتا ہے، نہ صحرا میں نہ گلزاروں میں

اے زہے لطف! کہ تو اور خیالِ احباب
اے زہے بخت! کہ ہوں کس کے طلبگاروں میں

کاش! آنکھوں سے کبھی پردۂ دوری اُٹھے
کاش! دن رات بسر ہو ترے نظاروں میں

چشم پوشی تجھے منظور، ترحم مقصود
اُن کو مژدہ ہو، جو ہیں تیرے گنہگاروں میں

بندہ پرور! کبھی اتنا بھی خیال آتا ہے
کہ اک آزاد بھی ہے، میرے گرفتاروں میں

وسطِ جون ۱۹۰۶ء ۔ کان پور ۔ طرح مرغوب

وہ یارِ دلربا ہے اور میں ہوں
زمانِ دل کشا ہے اور میں ہوں

وہ سرمستِ ادا ہے اور میں ہوں
گُل و مل ہے، مزا ہے اور میں ہوں

---

۵ دیکھو صفحہ (۱۲) حاشیہ (۱)

یہ ثابت ہے کہ بے جرم و خطا ہوں
مگر عذرِ خطا ہے اور میں ہوں

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

شریکِ حالِ بے کس کون ہوتا
خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں

تم اپنے درد کی لذت نہ پوچھو
قیامت کا مزا ہے اور میں ہوں

وہ بگڑی ہے کہ بننی غیر ممکن
مرا بختِ رسا ہے اور میں ہوں

جزاک اللہ! کیا طرزِ وفا ہے
کہ ظلمِ ناروا ہے اور میں ہوں

دلِ مضطر سے پالا پڑ گیا ہے
یہ کافر ماجرا ہے اور میں ہوں

خوشا وہ دن! کہ تجھ سے مل کے خوش ہوں
ترا شوقِ لقا ہے اور میں ہوں

کبھی جن حسرتوں کی ابتدا تھی
اب اُن کی انتہا ہے اور میں ہوں

مآلِ کار ناکامی نہ پوچھو
مقدر کا گلا ہے اور میں ہوں

وہ سائل ہوں کہ کچھ لے کر ٹلوں گا
"درِ دولت سرا ہے اور میں ہوں"

دلِ مرحوم کا ماتم کہاں تک
"رضینا بالقضا ہے" اور میں ہوں

رہِ مقصود سے بھٹکا رہا ہے
فریبِ رہنما ہے اور میں ہوں

ڈبو دینے کی کوشش ہو رہی ہے
جفائے ناخدا ہے اور میں ہوں

جدھر دیکھو، تلاطم خیز طوفاں
تباہی رونما ہے اور میں ہوں

تمہیں آزادی مبارک
کہ اک دامِ بلا ہے اور میں ہوں

اوائلِ جنوری ۱۹۰۸ء سہارنپور۔ طرحِ طبع زاد

نیم مُسلسل

تغیّر ہائے دُنیا دیکھتا ہوں
تماشے پر تماشا دیکھتا ہوں

سلُوکِ جبا وُ بے جا دیکھتا ہوں
تحیّر خیز نقشا دیکھتا ہوں

ابھی اُلفت، ابھی یک لخت نفرت
ابھی کیا تھا، ابھی کیا دیکھتا ہوں

کبھی غفلت، کبھی عُذراتِ غفلت
کھڑا حیرت زدہ سا دیکھتا ہوں

وہ منظر، جن سے آنکھوں کو ضیا تھی
ستم ہے، اُن کو دُھندلا دیکھتا ہوں

وہ شمعیں، جن کی ضو ظلمت رُبا تھی
غضب ہے، اُن کو ٹھنڈا دیکھتا ہوں

جن اُمیدوں کی دل جیب ابتدا تھی
اب اُن کو کُلفت افزا دیکھتا ہوں

جن ارمانوں کی راحت جاں فزا تھی
اب اُن کو رُوح فرسا دیکھتا ہوں

وہ دل، جس میں تمنّا کی خوشی تھی
اُسے صرفِ تمنّا دیکھتا ہوں

وہ خوشیاں، جن سے شُکلِ زندگی تھی
اُنھیں دُنیا سے عُنقا دیکھتا ہوں

وہ چشمِ لطف، جس کا آسرا تھا
اب اِک دھوکا ہی دھوکا دیکھتا ہوں

وہ عرضِ شوق، جس کا حوصلہ تھا
اب اِک سودا ہی سودا دیکھتا ہوں

انھیں آنکھوں سے لاکھوں لطف دیکھے
اِنھیں آنکھوں سے ٹرکا دیکھتا ہوں

کمالِ عالمِ بے چارگی ہے
ستم ہائے تمنّا دیکھتا ہوں

مروت رسمِ دنیا ہے تو باشد — تمہیں اُس سے معرّا دیکھتا ہوں
کہاں تو اور کہاں فکرِ تلافی — کسے تکلیف فرما دیکھتا ہوں؟
وفا کر، وعدہ فردا وفا کر — خبر ہے؟ کب سے رستا دیکھتا ہوں
بس آزادؔ اب سکوں باقی نہ وہ جوش — وہ مد و جزرِ دھیما دیکھتا ہوں

۸ ۱۳ اپریل ۱۹۱۲ء - انبالہ چھاؤنی طرحِ مرغوب

یہ اک شانِ جدا ہے، میں نہیں ہوں — وہی جلوہ نما ہے، میں نہیں ہوں
زمانہ پہلے مجھ کو ڈھونڈتا ہے — مگر تیرا پتا ہے، میں نہیں ہوں
ترے ہوتے مری ہستی کا کیا ذکر — یہی کہنا بجا ہے، میں نہیں ہوں
ترے جلووں میں کھو جاتا، مگر آہ! — جہاں تو جلوہ زا ہے، میں نہیں ہوں
تری بزمِ طرب ہے، اور کُل احباب — مقدر کا گلا ہے، میں نہیں ہوں
صدائے "نحن اقرب" کہہ رہی ہے — "کہ تو مجھ سے جدا ہے، میں نہیں ہوں"
وہ خود تشریف فرمائے جہاں ہیں — "تمہیں دھوکا ہوا ہے، میں نہیں ہوں"
کہاں میں اور کہاں خبطِ "انا الحق" — کوئی میرے سوا ہے، میں نہیں ہوں
دل و جاں، فہم و دانش دینے والے! — فقط تیری عطا ہے، میں نہیں ہوں
مجھے آزادؔ دنیا کیوں نہ پوچھے — کسی کا نقشِ پا ہے، میں نہیں ہوں

۱۰ اواخر مارچ ۱۹۰۹ء - کانپور - برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان حکیم فخر الدین صاحب فاخر

المدد، اے طاقتِ ضبطِ محبت المدد — شکلِ رسوائی نہاں ہے درد کے اظہار میں

اب وہ اگلی سی مجالِ ضبطِ غم باقی کہاں — اب وہ پہلی سی سکت دل میں نہ جانِ زار میں

ہو سکے تو فکرِ اصلاحِ طبیعت کیجئے — ظلم راسخ ہو نہ جائے عادتِ سرکار میں

آہ! وہ دل ہوں کہ پامالِ تمنا ہی رہا — آہ! وہ گُل ہوں کہ گلشن میں نہ تیرے ہار میں

اِک سوا اس کے کہ سچا خادمِ احباب ہے — کون سی خوبی ہے آزادِ خدائی خوار میں

وسطِ اگست ۱۹۱۶ء چھاؤنی انبالہ۔ برطرحِ مشاعرہ منعقدہ مکانِ حکیم مُراد علی صاحب مرحوم

جب اُس کی انجمن سے بادلِ ناکام پھرتا ہوں — ہرے ارمان مجھ پر سیکڑوں آوازے کستے ہیں

ترے الطاف بے حد میرے حصے میں نہیں آئے — یہ بادل جب برستے ہیں، الگ ہٹ کر برستے ہیں

سمجھتا ہوں، فریبِ وعدۂ فردا سمجھتا ہوں — وہ میرا مُنہ فقط جھوٹی تسلّی سے جُھلستے ہیں

ترا گلشن وہ گلشن جس پہ جنّت کی فضا صدقے — مرا خرمن وہ خرمن جس پہ انگارے برستے ہیں

خدا معلوم، کب تا منزلِ مقصود فائز ہوں — کہ منزل سیکڑوں منزل ہے۔ اور مخدوش رستے ہیں

بھلا آزاد! اتنی دُون کی لینے سے کیا حاصل — گرجنے والے بادل شاذ و نادر ہی برستے ہیں

اوائل اگست ۱۹۱۷ء۔ انبالہ چھاؤنی۔ برطرحِ مشاعرہ کرنال

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں — تلاشِ چارہ سُو ہے اور میں ہوں

خوشا قسمت! کہ تو ہے اور میں ہوں — بہارِ رنگ و بُو ہے اور میں ہوں

تمہارے آرزو مندوں میں ہو کر — عذابِ آرزو ہے اور میں ہوں

جنونِ چارہ جوئی بڑھ چلا ہے — خیالِ چارہ جُو ہے اور میں ہوں

محبت نے کہاں پہنچا دیا ہے
مقامِ رشک ہو ہے اور میں ہوں

تری محفل میں پرسش تک نہیں ہے
یہ میری آبرو ہے اور میں ہوں

محبت میں تجھ سودا نہ ہو جائے
طبیعت ہے غلو ہے اور میں ہوں

کبھی وہ ان آنکھوں سے رنگیں صحبتیں تھیں
اب آنکھیں ہیں لہو ہے اور میں ہوں

اوائل جنوری ۱۹۱۸ء۔ انبالہ چھاؤنی۔ طرح مشاعرہ منعقدہ مکان منشی محمد اکبر خاں صاحب اکبر حیدری۔ ساکن انبالہ چھاؤنی

نہ پوچھو، کون ہیں، کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں، سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

اُدھر پہلو سے تم اٹھے، اِدھر دنیا سے ہم اٹھے
چلو، ہم بھی تمہارے ساتھ ہی تیار بیٹھے ہیں

کسے فرصت؟ کہ فرضِ خدمتِ الفت بجا لائے
نہ تم بے کار بیٹھے ہو، نہ ہم بے کار بیٹھے ہیں

خبر ہے؟ دردمندوں کی شبِ غم کس طرح گزری
ہزاروں بار اٹھے ہیں، ہزاروں بار بیٹھے ہیں

عجب کچھ رنگ محفل ہے کہ دیکھا ہی نہیں جاتا
تری محفل میں بیٹھے ہیں، مگر بیزار بیٹھے ہیں

جو اٹھے ہیں تو گرمِ جستجوئے دوست اٹھے ہیں
جو بیٹھے ہیں تو محوِ آرزوئے یار بیٹھے ہیں

مقامِ دستگیری ہے کہ تیرے رہروِ الفت
ہزاروں جستجوئیں کر کے ہمت ہار بیٹھے ہیں

نہ پوچھو، کون ہیں، کیا مدعا ہے، کچھ نہیں بابا!
گدا ہیں اور زیرِ سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

یہ ہو سکتا نہیں، آزاد سے میخانہ خالی ہو
وہ دیکھو، کون بیٹھا ہے، وہی سرکار بیٹھے ہیں

---

[۱] دیکھو صفحہ (۳۰) حاشیہ (۱)

اوائلِ نومبر ۱۹۱۹ء۔ علی گڑھ۔ بطرح مشاعرہ منعقدہ مکان محمد یوسف صاحب یوسف[1]

اُدھر دل طولِ حسرت سے بہ حالِ زار شیون میں
اِدھر میں دل کی اِس گت سے پریشانی میں اُلجھن میں

جلادے خرمنِ حسرت، دکھا کر جلوۂ تاباں
بجھادے آتشِ فرقت، لگا کر آگ تن من میں

تمہارا رنجِ فرقت ہے کہ طاری ہے مرے دل پر
تمہارا دردِ اُلفت ہے کہ ساری ہے مرے تن میں

یہ کیا آفت ہے، اب تقدیر کروٹ تک نہیں لیتی
یہ کیا شامت ہے۔ اب تاثیر آہوں میں نہ شیون میں

نشانِ راہ ہاتھ آیا تو کس سے، صرفِ اُلفت سے
کمالِ رہبری پایا تو کس میں۔ صرفِ رہزن میں

نزاکت ہے کہ قرباں ہے، تری ترکیبِ اعضا پر
قیامت ہے کہ پنہاں ہے ترے بےساختہ پن میں

طبیعت شاد پاتا ہوں۔ جلا کر حاصلِ حسرت
خوشی کے راگ گاتا ہوں، لگا کر آگ خرمن میں

ترا اے نوبہارِ باغِ عالم! واہ۔ کیا کہنا
نہ ایسا رنگ پھولوں میں، نہ ایسے پھول گلشن میں

کبھی ہم کو بھی سمجھانا۔ یہ آنا ہے تو کیا آنا
کہ آنا اور چھپ جانا، شعاعِ رخ کی چلمن میں

ستم ہے ہم تری محفل سے نکلیں اور یوں نکلیں
وفا کی لاش کاندھے پر، جفا کا ہاتھ گردن میں

جو زر لوٹا نڈر لوٹا، جو گھر لوٹا نڈر لوٹا
ترے انداز ڈاکا مارتے ہیں روزِ روشن میں

خوشا وہ دن! کہ ہم منزل کو پہنچیں اور یوں پلٹیں
دُرِ مطلوب مٹھی میں، گلِ مقصود دامن میں

اگر بجلی کو حسرت ہے۔ گرے اور شوق سے پھونکے
ہمیں کیا دکھ ہے۔ ہم کیوں آگ دیں اپنے نشیمن میں

---

[1] منشی محمد یوسف صاحب یوسف عمر ۵۵ سال علی گڑھ کے کہنہ مشق شعرا میں سے ہیں۔ اوسط درجہ کا شعر کہتے ہیں۔ مگر خدمتِ ادب و شعر کے بے حد دلدادہ و شائق ہیں۔ اور آپ کو بزمِ مشاعرہ ترتیب دینے اور اس کو دلکش بنانے میں اک خاص ملکہ حاصل ہے۔ آزاد انصاری

ہماری بدنصیبی دیکھئے۔ ہم اپنے خرمن کو
بذاتِ خاص لے کر جھونکنے بیٹھے ہیں گلخن میں

نجانے کس کے قبضے کی، تری قدرت کے قبضے کی
پناہیں کس کے دامن میں، تری رحمت کے دامن میں

مجھے اپنی طبیعت کی رواداری مبارک ہو
جنونِ دشمنی جھلکا کرے عاداتِ دشمن میں

بس اب آزاد نعشِ دل لئے پھرنے سے کیا حاصل
چلو، اس کو بھی گاڑ آئیں تمناؤں کے مدفن میں

اواخر مئی ۱۹۲۲ء۔ دہلی۔ بر طرح مشاعرہ ماہانہ منعقدہ مکان پنڈت[1] امرناتھ صاحب۔

ساحر دہلوی

جب سے آنکھیں فائزِ انوارِ جاناں ہو گئیں
سرمدی جلووں کی شمعیں دل میں تاباں ہو گئیں

اب کسی کی جستجو میں فرض ہیں، تا زیست فرض
اب کسی کی آرزوئیں دین و ایماں ہو گئیں

کیا کہوں، کیوں وحشتیں اک دم ترقی کر گئیں
کیا کہوں، کیوں حسرتیں یک لخت عریاں ہو گئیں

کیا خبر، کیونکر وہ آنکھیں دل کو گھائل کر سکیں
کیا خبر، کیونکر وہ نظریں تیر و پیکاں ہو گئیں

ظلمتیں سی ظلمتیں حدِ نظر تک چھٹ پڑیں
طلعتیں سی طلعتیں آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں

حیف! تدبیراتِ رفعِ درد یوں بیکار جائیں
حیف! تاثیراتِ گرم و سرد یکساں ہو گئیں

---

[1] جناب پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی دورِ حاضر کے مشہور و معروف صوفی مشرب شاعر ہیں۔ آپ کے اشعار بالعموم رموزِ معرفت کے حامل ہوتے ہیں۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں پر آپ کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ آپ خدمتِ فنِ شعر کے نہایت حریص واقع ہوئے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دہلی میں رونقِ بزمِ سخن آپ ہی کے دم سے قائم ہے۔ خوش قسمتی سے خاکسار کو بھی آپ کی خدمت میں شرفِ نیاز حاصل ہے۔ اور جب کبھی دہلی جانا ہوتا ہے مخصوص توجہات ارزانی فرماتے ہیں۔
آزاد انصاری

لو وہ اُس مہ رُو نے قصدِ جلوہ آرائی کیا — لو وہ غیبی طلعتیں انوار افشاں ہو گئیں
لو وہ اُس گل رُو نے عزمِ رنگ پیرائی کیا — لو وہ فطری زینتیں الوان در الواں ہو گئیں
پھر کوئی خورشید رُو بالائے مہتابی چلا — پھر مہ و اختر کی قندیلیں فروزاں ہو گئیں
پھر کوئی رشکِ چمن سیرِ گلستاں کو اُٹھا — پھر گلستاں کی بہاریں گل بہ داماں ہو گئیں
اے خدا کی شان! آخر تیری کافر کیشیاں — اصلِ ہر دیں بن گئیں، عینِ ہر ایماں ہو گئیں
اے ترے قربان! تیری ناصواب اندیشیاں — جانِ ہر دل بن گئیں، جانانِ ہر جاں ہو گئیں
تھیں، کبھی صبر و سکوں کی قدر تیں ہم کو بھی تھیں — لیکن اب نذرِ نگاہِ نازِ جاناں ہو گئیں
تھیں، کبھی عیش و طرب کی فرصتیں ہم کو بھی تھیں — لیکن اب اسبابِ رنج و یاس و حرماں ہو گئیں
ایک میں کیا، ساری دنیا اُن اداؤں کے نثار — جو مجھے دنیا سے کھو کر اور نازاں ہو گئیں
چارہ سازِ زخمِ دل! درمانِ زخم اچھا کیا — زخم کی سب لذتیں مجروحِ درماں ہو گئیں
آہ! کیا کیا جستجوئیں رائگاں ثابت ہوئیں — آہ! کیا کیا آرزوئیں صرفِ حرماں ہو گئیں
حضرتِ آزاد صرف اُس کے کرم کی دیر تھی — عمر بھر کی مشکلیں دم بھر میں آساں ہو گئیں

اوائل مئی ۱۹۲۵ء حیدرآباد دکن طرحِ طبع زاد۔ مسلسل بہ طرزِ ترصیعِ جدید[1]

دو عالم[2] پرتوِ نقش و نگارِ جلوۂ جاناں — بہارِ دو[3] جہاں عکسِ بہارِ جلوۂ جاناں

---

[1] دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)
[2] یہ غزل "جلوۂ جاناں" کی سرخی سے رسالہ "نگار" بھوپال میں شائع ہو چکی ہے۔ آزاد انصاری
[3] میں لفظ "دو" بہ اشباع کو فارسی ترکیب میں بھی جائز و فصیح سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری۔

جدھر دیکھو، ہجومِ جلوہ ہائے نور کا عالم — زمیں سے آسماں تک انتشارِ جلوۂ جاناں
اِدھر بھی نور کا عالم، اُدھر بھی نور کا عالم — مکاں سے لامکاں تک اشتہارِ جلوۂ جاناں

چمن بھی غیرتِ جنّت، دمن بھی غیرتِ جنّت — زہے فیضانِ عالم آشکارِ جلوۂ جاناں
اِدھر بھی بارشِ رحمت، اُدھر بھی بارشِ رحمت — زہے لطف و عطائے بے شمارِ جلوۂ جاناں

بہارِ جلوۂ جاناں کا عالم کیا گذارش ہو — بہارِ گلشنِ جنّت، بہارِ جلوۂ جاناں
جو آنکھیں ذی بصیرت ہیں تو آنکھیں کھول کر دیکھو — نثارِ جلوۂ وحدت، نثارِ جلوۂ جاناں

فروغِ بزمِ عالم کی نرالی شان کہتی ہے — فروغِ بزمِ عالم تحت کارِ جلوۂ جاناں
بہارِ باغِ ہستی خود علی الاعلان کہتی ہے — بہارِ باغِ ہستی مستعارِ جلوۂ جاناں

زمین و آسماں کے حیرت افزا رنگ شاہد ہیں — بلند و پست تحتِ اختیارِ جلوۂ جاناں
نظامِ دو[۱] جہاں کے کارفرما ڈھنگ شاہد ہیں — کشاد و بست زیرِ اقتدارِ جلوۂ جاناں

موالید اور اُن کی خوش گزاری سے یہ ثابت ہے — کُل اجسامِ زمیں طاعت شعارِ جلوۂ جاناں
مہ و مہر اور اُن کی ذمہ داری سے یہ ثابت ہے — کُل اجرامِ بریں خدمت گزارِ جلوۂ جاناں

---

۱ میں لفظِ "دو" بہ اشباع کو فارسی ترکیب میں بھی جائز و فصیح سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری۔

جدھر جاؤ بہارِ گُل یہ کہہ کہہ کر لُبھاتی ہے
"بہارِ جلوۂ جاناں، بہارِ جلوۂ جاناں"

جدھر پہنچو، دَر و دیوار سے آواز آتی ہے
"فدائے جلوۂ جاناں، نثارِ جلوۂ جاناں"

دلِ آزاد ہے اور ہر طرف سے نرغۂ ظلمت
مدد، اے طلعتِ انوار بارِ جلوۂ جاناں!

اوائل اگست ۱۹۲۹ء حیدر آباد دکن۔ طرحِ مرغوب

تبسّم نہیں ہے، گُل افشانیاں ہیں
تکلّم نہیں ہے، غزل خوانیاں ہیں

زہے! آپ کا دَورِ صاحبقرانی
جدھر دیکھتا ہوں ستم رانیاں ہیں

ترے گھر کی جانب نمازوں میں رُخ ہے
ترے در پہ سجدوں میں پیشانیاں ہیں

خوشا! اِک تری نسبتِ غم کہ جس سے
خوشی پر خوشی کی فراوانیاں ہیں

تقاضے کرم کے۔ نہ شکوے ستم کے
اَدا دانیاں سی اَدا دانیاں ہیں

مہ و مہر مشاطہ بن کر چلے ہیں
نئی سے نئی جلوہ سامانیاں ہیں

کوئی پردہ داری کرے بھی تو کب تک
ترا دَرد ہے اور عُریانیاں ہیں

سزائیں تو ہر حال میں لازمی تھیں
خطائیں نہ کرکے پشیمانیاں ہیں

اگر کارِ اُلفت کو مشکل سمجھ لُوں
تو کیا ترکِ اُلفت میں آسانیاں ہیں؟

اِدھر فکرِ دُنیا، اُدھر خوفِ عُقبےٰ
پریشانیوں پر پریشانیاں ہیں

اگر اذن ہو، ہر دو عالم سے کہہ دوں
تمھارے مقدر میں ویرانیاں ہیں

اب آزاد ہے اور سکوتِ مسلسل
وہ لفّاظیاں ہیں نہ لسّانیاں ہیں

اوائلِ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء حیدرآباد دکن۔ طرحِ مرغوب

چمن ہے، بہاریں ہیں، گل باریاں ہیں
گھٹا ہے، پھواریں ہیں، مے خواریاں ہیں

ستم کوشیاں ہیں، جفا کاریاں ہیں
یہ کس کے مٹانے کی تیاریاں ہیں؟

وہ آنکھیں نہیں ہیں، خاص سرشاریاں ہیں
وہ نظریں نہیں، عام مے باریاں ہیں

بتو! تم خدا جانے کیسے خدا ہو؟
کہ ستاریاں ہیں نہ غفاریاں ہیں

جواب کوئی پرساں نہیں ہے تو کیا غم
غمِ دوست ہے اور غمخواریاں ہیں

بس اب حالِ اہلِ وفا کچھ نہ پوچھو
کہ ذکرِ وفا ہی سے بیزاریاں ہیں

حیاتِ جہاں منقطع ہو نہ جائے
تری تیغ ہے۔ اور خوں باریاں ہیں

کرم ہائے بے انتہا کہہ رہے ہیں
ستم ہائے بے حد کی تیاریاں ہیں

ہزاروں خداؤں کو پوجا، مگر اب
فقط اِک تمھاری پرستاریاں ہیں

اب آنکھیں نہیں جاگتی تو نہ جاگیں
کہ اب روح ہے اور بیداریاں ہیں

محبت کے پیرو! محبت کے شکوے
محبت کے مذہب سے غداریاں ہیں

جو آزاد قطعِ ہر امید کردو
تو پھر صبر میں کون دشواریاں ہیں

اوائلِ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء۔ حیدرآباد دکن۔ طرحِ مرغوب

مسلسل بہ طرزِ ترصیعِ جدید[لہ]

آؤ، پھر موقع ہے، کچھ اسرار کی باتیں کریں
صورتِ منصور نہ کہیں، دار کی باتیں کریں

لہ دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

آؤ، پھر عہدِ وصالِ یار کی باتیں کریں   داستانِ لطف چھیڑیں، پیار کی باتیں کریں
آؤ، پھر اُس جلوۂ گل بار کی باتیں کریں   پھول برسائیں، گل و گلزار کی باتیں کریں

آؤ، پھر اُس ساقیٔ دلبر کا چھیڑیں تذکرہ   آؤ، پھر اُس شاہدِ میخوار کی باتیں کریں
آؤ، پھر اُس ہمدمِ کافر کا چھیڑیں تذکرہ   آؤ، پھر اُس یارِ نا دیندار کی باتیں کریں

آؤ، پھر ارمانِ محرابِ عبادت بھول جائیں   آؤ، پھر اُس ابروئے خمدار کی باتیں کریں
آؤ، پھر ایقانِ اعجاز و کرامت بھول جائیں   آؤ، پھر اُس لعلِ افسونکار کی باتیں کریں

آؤ، پھر کون[۱] و مکاں[۲] کو قیدِ ظلمت[۳] سے چھڑائیں[۴]   آؤ، پھر اُس روئے مہر آثار کی باتیں کریں
آؤ، پھر دونوں[۱] جہاں[۲] کو عطرِ جنت[۳] میں بسائیں[۴]   آؤ، پھر اُس زلفِ عنبر بار کی باتیں کریں

آؤ، پھر موسیقیٔ فردوس کانوں کو سنائیں   آؤ، پھر اُس نغمہ زا گفتار کی باتیں کریں
آؤ، پھر نظارۂ صد حشر آنکھوں کو دکھائیں   آؤ، پھر اُس فتنہ زا رفتار کی باتیں کریں

آؤ، پھر کونین کی دولت سے مالا مال ہوں   آؤ، پھر اُس ذی کرم سرکار کی باتیں کریں
آؤ، پھر خوش قسمت و خوش بخت و خوش اقبال ہوں   آؤ، پھر اُس ذی حشم دربار کی باتیں کریں

آؤ، پھر اک عکسِ شوخ آنکھوں کے ہر پردے پہ لیں   آؤ، پھر اُس دلبرِ طرّار کی باتیں کریں

آؤ، پھر تکلیفِ تسکیں اضطرابِ دل کو دیں
آؤ، پھر اُس شوخِ آفت کار کی باتیں کریں

آؤ، پھر یادِ رُخِ جاناں میں پی کر مست ہوں
آؤ، پھر کیفِ مئے دیدار کی باتیں کریں
آؤ، پھر اُس کیف کے ارماں میں پی کر مست ہوں
آؤ، پھر اُس ساعتِ سرشار کی باتیں کریں

آؤ، پھر ذکرِ جمیلِ دوست سے مسرور ہوں
آؤ، پھر حُسن و جمالِ یار کی باتیں کریں
آؤ، پھر سارے جہاں کو لے کے غرقِ نور ہوں
آؤ، پھر اُس قُلزمِ انوار کی باتیں کریں

آؤ، پھر اُس دل شکن انکار کا قصہ سُنائیں
آؤ، پھر اُس جاں فزا اقرار کی باتیں کریں
آؤ، پھر اُس با مزہ تکرار کا قصہ سُنائیں
آؤ، پھر اُس صُلحِ زا پیکار کی باتیں کریں

آؤ، پھر اُس بزم کی رنگینیوں میں ڈوب جائیں
آؤ، پھر اُس غیرتِ گلزار[1] کی باتیں کریں
آؤ، پھر اُس باغ کی گُل چینیوں میں ڈوب جائیں
آؤ، پھر اُس گلشنِ بے خار[2] کی باتیں کریں

آؤ، پھر زُنّار پہنیں، آؤ، پھر قشقہ لگائیں
آؤ، پھر بے خوفِ ننگ و عار کی باتیں کریں
آؤ، پھر اُس بُت کے آگے بہرِ سجدہ سر جُھکائیں
آؤ، پھر کافر بنیں، کُفّار کی باتیں کریں

حضرتِ آزاد! سب نا محرمِ اسرار ہیں
کس سے بے خوفِ فسادِ اسرار کی باتیں کریں

---

[1] غیرتِ گلزار سے بزمِ یار مُراد ہے۔ [2] گلشنِ بے خار سے بزمِ یار مراد ہے۔

۱۴ اپریل ۱۹۳۳ء۔ درمیانِ سفرِ بمبئی از حیدرآباد تا بمبئی۔ بر طرحِ مشاعرہ
"بزمِ خیال بمبئی"

اب ہم کو خوفِ قیدِ زمان و مکاں کہاں — اب جس جہاں میں ہم ہیں، وہاں یہ جہاں کہاں
اب قلب میں وہ برقِ محبت تپاں کہاں — اب جسم میں وہ رُوح رواں و دواں کہاں
اب جورِ گاہ گاہ کا احساں بھی کم نہیں — اب وہ توقعِ کرمِ بے کراں کہاں
جورِ فلک سے تو مفر آساں ہے۔ مگر — تیری نگاہِ لُطف سے شکلِ اماں کہاں
وہ بدنصیب ہوں کہ تری آرزو مجھے — ناشادماں بھی رکھ نہ سکی، شادماں کہاں
جس باغ میں تمہارے قدم سے بہار آئے — اُس باغ کی بہار کو خوفِ خزاں کہاں
اب دل ہے اور شوق کا اک عالمِ عجیب — اب دل کا حال قابلِ شرح و بیاں کہاں
وہ میکدے میں شیخ کی تشریف آوری — وہ میری التماس کہ حضرت یہاں کہاں!
شیخِ حرم بھی مرجعِ اہلِ جہاں سہی — لیکن بشانِ حضرتِ پیرِ مغاں کہاں
ارمانِ التفاتِ دلِ دوستاں درست — شایانِ التفاتِ دلِ دوستاں کہاں
آزادؔ! اب قفس سے رہا بھی ہوئے تو کیا — گو آشیاں کی دُھن ہے، مگر آشیاں کہاں

اواخر اپریل ۱۹۳۳ء۔ بر طرحِ مشاعرہ منعقدہ خاص باغ مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر صدرِ اعظم دولتِ آصفیہ[۵]

اور پھر کیا ہے جو خبطِ شوقِ لاطائل نہیں — داد کے لائق نہیں، بیداد کے قابل نہیں
اب سر و برگِ سکونِ دل سے کچھ حاصل نہیں — اب سکونِ دل بھی کچھ وجہِ سکونِ دل نہیں

[۵] دیکھو صفحہ (۳۶) حاشیہ (۱)

آرزوئے مہر و اُلفت پر جفا سے درگزر
آرزوئے مہر و اُلفت جُرم میں داخل نہیں

حُسن کو ہر جَور کا حق دینے والے! یہ تو سوچ
عشق کی مستی بھی تو کچھ زائد و فاضل نہیں

اے جفا جو! ہر جفا برحق، مگر یہ تو بتا
کیا وفا کو زندہ رہنے کا بھی حق حاصل نہیں

شکرِ بیدارئ قسمت۔ مجھ کو دل بخشا گیا
اور دل وہ دل جو تیری یاد سے غافل نہیں

سَر تو ہے لیکن جنونِ سرفروشی سے تہی
دِل تو ہے لیکن ترے ارمان کے قابل نہیں

مژدہ۔ اے آوارگی مژدہ۔ کہ پھر وحشت مجھے
اُس طرف لے کر چلی ہے جس طرف منزل نہیں

حضرتِ آزاد! آپ اک فردِ کامل ہیں تو ہوں
دہر کو تو امتیازِ ناقص و کامل نہیں

اوائلِ ستمبر ۱۹۳۴ء۔ حیدر آباد دکن۔ طرحِ طبع زاد

سخت مشکل[1] ہے کہ اُس کا جاننا ممکن نہیں
اور بے جانے ہمارا ماننا ممکن نہیں

زندگی بھر جاننے کی کوششیں کرنے کے بعد
صِرف یہ جانا یہاں کچھ جاننا ممکن نہیں

وہ یہ کہتے ہیں، ہمیں پہچاننے کی سعی کر
اور یہاں اپنے کو بھی پہچاننا ممکن نہیں

وحدتِ بے لوث ہاتھ آئے تو کیوں کر ہاتھ آئے
کثرتیں اِتنی ہیں جِن کا چھاننا ممکن نہیں

مادّے کی ساری تعریفات برحق۔ لیکن اب
رُوح کو آلودگی میں سانا ممکن نہیں

رازِ عالم تا زباں لانا تو ممکن ہے۔ مگر
سارے عالم سے لڑائی ٹھاننا ممکن نہیں

کُچھ ہو، اب ناقص کو کامل جاننا امرِ محال
کُچھ ہو، اب ممکن کو واجب ماننا ممکن نہیں

---

[1] یہ غزل "فیلسوفانہ تغزل" کے عنوان سے رسالۂ ادبی دنیا لاہور میں شایع ہو چکی ہے۔

منکرِ عرفانِ حق! جا۔ شبہ و شک رائیگاں — ظرفِ قابل لے کے آ، عرفان ناممکن نہیں
عقل والو! عقل پر غرّہ تو اک حد تک درست — لیکن اُس کو عقل سے پہچاننا ممکن نہیں

حضرتِ آزاد! اب ہم ہیں اور اک ایسا جہاں
جس جہاں کو منقلب گردانا ممکن نہیں

۱۵ ستمبر ۱۹۳۴ء ۔ حیدرآباد دکن

یہ نہیں کہتا کہ اُس کا ماننا ممکن نہیں — ماننا ممکن ہے لیکن جاننا ممکن نہیں
میں اگر چاہوں توفی الوقع ترا ملنا محال — تُو اگر چاہے تو میری جان ناممکن نہیں
آج کل آزاد ہے اور ایسی اک اُمّید گاہ — جس سے اُس کو منحرف گردانا ممکن نہیں

اواخر مارچ ۱۹۳۵ء حیدرآباد دکن ۔ طرح مرغوب

کچھ آثارِ رُخ سے عیاں اور بھی ہیں — کچھ اسرارِ دل میں نہاں اور بھی ہیں
فقط وجہِ قُربِ خُدا ہی نہ سمجھو — مفاداتِ عشقِ بُتاں اور بھی ہیں
حرم میں پناہیں نہ پاسکنے والو! — مقاماتِ امن و اماں اور بھی ہیں
ابھی ظرفِ قابل ہی جانچا گیا ہے — ابھی سینکڑوں امتحاں اور بھی ہیں
وہ اپنی وفا کو وفا ہی نہ سمجھیں — کہ اُنکی وفا پر گماں اور بھی ہیں
زباں گرمِ اظہارِ اُلفت ہے لیکن — نظر سے ارادے عیاں اور بھی ہیں
سُن اے یارِ اندازہ دانِ وفا سُن — وفا کے کچھ اندازہ داں اور بھی ہیں

بتوں ہی سے اُن بن کا خطرہ نہیں ہے　　سُجودِ خدا میں زیاں اور بھی ہیں

جو اہلِ حرم درپئے دشمنی ہیں　　تو پروا نہیں آستاں اور بھی ہیں

کبھی مے، کبھی دُردِ مے کے علاوہ　　مراعاتِ پیرِ مغاں اور بھی ہیں

بُدرِ قتلِ عالم روا رکھنے والو!　　تدابیرِ فتحِ جہاں اور بھی ہیں

غُلامانہ خو اِتّفاقی ہے۔ ورنہ　　رِوایاتِ ہندوستاں اور بھی ہیں

ناتمام غزلیات[1] کے اشعار

حسبِ سابق بہ ترتیبِ زمانہ تصنیف

آخرِ جنوری ۱۸۹۵ء۔ سہارنپور۔ برطرح گلدستہ زبانِ دہلی[2]

نہ کوئی حرفِ باطل ہوں، نہ کوئی مدِّ فاضل ہوں　　مِٹاتے ہو مُجھے کیوں، کیا مٹا دینے کے قابل ہوں

اوائلِ مارچ ۱۸۹۵ء۔ سہارنپور

اے کاش! کوئی لُطف سے اِتنا تو پُوچھ لے　　جی ہی میں کچھ نہیں کہ مجالِ سخن نہیں

وسطِ نومبر ۱۸۹۵ء۔ موضع کیلاس پور ضلع سہارنپور

انجمن کی انجمن افسُردہ ہے　　تو نہیں تو لُطفِ صحبت ہی نہیں

---

[1] ان میں وہ اشعار بھی شامل ہیں کہ اِتّفاقیہ کوئی مضمون ذہن میں آیا۔ اور شعر موزوں ہو گیا۔ اور وہ اشعار بھی جو کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر لئے گئے ہیں۔ آزاد انصاری۔

[2] "زبانِ دہلی" اِک ماہانہ گلدستہ تھا جو ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۶ء تک مولانا عبدالرحمٰن صاحب راسخ دہلوی مرحوم کی اِدارت میں شایع ہوتا رہا اور بعد میں بند ہو گیا۔ آزاد انصاری

آج صحرا سے بھی جی اُکتا گیا   آہ! سودا ابھی ہے، وحشت ہی نہیں

اوائل مئی ۱۸۹۹ء - سہارنپور

وہ دَرد ہے کہ جس کی حقیقت عجیب ہے   وہ حال ہے کہ قابلِ شرح و بیاں نہیں

اواخر فروری ۱۹۱۰ء - کانپور

کہیں ایسا نہ ہو، مایوس ہو کر صبر کر بیٹھیں   دلِ عُشّاق ناکامی کے خوگر ہوتے جاتے ہیں

۳ مارچ ۱۹۱۱ء - انبالہ چھاؤنی

جِدھر آزاد گیا، خلقِ خدا بول اُٹھی   لو، وہ اللہ کے مستان چلے آتے ہیں

۱۳ جنوری ۱۹۱۸ء - انبالہ چھاؤنی

جنونِ عشق تھا، جامہ دری تھی، دشت گردی تھی   کبھی سو مشغلے تھے، لیکن اب بیکار بیٹھے ہیں

اوائل جنوری ۱۹۲۰ء - علی گڈھ

فصلِ بہار آئی ہے، نذر کو پھول لائی ہے   لو تمھیں پھول نذر ہیں، بہرِ قبول نذر ہیں

اوائلِ مارچ ۱۹۲۱ء - علی گڈھ - برطرحِ مشاعرہ منعقدہ بازار سیتارام دہلی

منجانب پنڈت[۱] امرناتھ صاحب ساحرِ دہلوی

تمنائی بھی دل دادہ، تماشائی بھی دل دادہ   تماشا سا تماشا ہو، نمایش گاہِ دوراں میں

بہت مشکل، اب امیدِ سکونِ جاں بہت مشکل   تراماں نشترِ غم کے ڈبوئے رگِ جاں میں

مٹا ڈالا، سکونِ ظاہر و باطن مٹا ڈالا   کمالِ جور پنہاں تھا ترے لطفِ نمایاں میں

ستم پرور! فقط فکرِ ستم کب تک، کہ ظاہر ہے   ستم بھی تیرے امکاں میں، کرم بھی تیرے امکاں میں

[۱] - دیکھو صفحہ (۱۰) حاشیہ (۱)

اگر اب شاکیِ قسمت نظر آؤں تو کیا شکوہ　　کبھی میرا بھی حصّہ تھا کسی کے لطف و احساں میں

۲۰ر جنوری ۱۹۲۲ء۔ دہلی

اُٹھا ہوں اور بہ شکلِ دردِ اُٹھا ہوں　　کسی مُہلک خبر کا مبتدا ہوں

۳۰ر مئی ۱۹۲۲ء۔ دہلی

دل لگی کی عادتیں مفلوج حرماں ہو گئیں　　زندگی کی راحتیں کلفت کا ساماں ہو گئیں

اوائلِ مئی ۱۹۲۳ء۔ حیدر آباد دکن۔ طرح مشاعرہ منعقدہ مکان حضرت باغؔ[1] صاحب

پھر وہی تم ہو اور جفا جس پہ تمھیں نظر نہیں　　پھر وہی ہم ہیں اور وفا جس سے ہمیں مفر نہیں

جلوۂ دوست عام ہے اور کوئی خبر نہیں　　آنکھ ہے اور نظر نہیں قلب ہے اور بصر نہیں

سچ تو یہ ہے، تری جفا از رہِ منصفی بجا　　حق تو یہ ہے مری خطا قابلِ درگزر نہیں

اوائلِ جون ۱۹۲۵ء حیدر آباد دکن

شغلِ مے اختیار کیوں نہ کریں　　احترامِ بہار کیوں نہ کریں

۵ر اپریل ۱۹۲۸ء۔ حیدر آباد دکن

بہ روزِ ازل قول ہارا ہوں میں　　یقیناً ابد تک تمھارا ہوں میں

۶ر اپریل ۱۹۲۸ء۔ حیدر آباد دکن

اگر تم درحقیقت بے وفا ہو　　بہت صاحب وفا میں بھی نہیں ہوں

---

[1] یعنی جناب مولوی سید کاظم علی صاحب باغؔ سبزواری علیگڈھی تلمیذ حضرت فصیح الملک داغؔ دہلوی مرحوم۔ دیکھو صفحہ (۳۰) حاشیہ (۱)

۱۰ر دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء حیدرآباد دکن

ستم ہے، یوں سکونِ دل کے مٹنے کا ستم دیکھیں
تمھارے درد کا ردِّ عمل ہو اور ہم دیکھیں

۲۲ر دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء حیدرآباد دکن

بیانِ[1] رازِ دل کی خواہشیں اور وہ بھی ممبر پر
خبر بھی ہے؟ یہ باتیں دار پر کہنے کی باتیں ہیں

۲۵ر جولائی سنہ ۱۹۳۰ء حیدرآباد دکن

ایک[2] بھی طالب ترے لائق دہر میں اے مطلوب نہیں
سچ تو یہ ہے، حد سے زیادہ خوبی بھی کچھ خوب نہیں

یکم اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء حیدرآباد دکن

خوشا! اُس کا مقدر، جس کی گزرے
ترے جلووں کے ماحولِ حسیں میں

۹

نومبر سنہ ۱۸۹۸ء۔ موضع کیلاس[3] پور۔ ضلع سہارنپور

میرے غمخوارو! تمھارا کیا قصور
کوئی دردِ دل بٹا سکتا بھی ہو

اب یہ مسلک ہے کہ یا تو سر نہ ہو
اور اگر سر ہو، ترا سودا بھی ہو

میری بیتابی کی حالت الاماں!
کاش! کوئی دیکھنے والا بھی ہو

---

[1] یہ شعر مرزا غالب مرحوم کے حسبِ ذیل مشہور فارسی شعر کا ترجمہ ہے:۔
آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است * بر دار تواں گفت بہ ممبر نتواں گفت *

[2] یہ شعر نعمت خان عالی کے حسبِ ذیل مشہور شعر کا ترجمہ ہے:۔
ہیچ طالب لایق عشق تو اے مطلوب نیست * صاحب من! خوبی از حد بردن ہم خوب نیست *

[3] کیلاس پور ضلع سہارنپور میں ایک موضع ہے۔ جو سہارنپور سے ۶ میل کے فاصلے پر بجانب شمال واقع ہے۔ آزاد انصاری۔

کیا بتا دیتے کہ کیوں چُپ لگ گئی — مہربانی سے کبھی پوچھا بھی ہو

کوششِ ترکِ تمنا ہی کروں — پر[1] یہ کافر دِل کہیں یکجا بھی ہو

کاش! مجھ کو چین یا صبر آسکے — کاش! تیرا داغ مِٹ سکتا بھی ہو

فکرِ عقبےٰ گو ضروری چیز ہے — پر[1] غمِ دُنیا سے چھٹکارا بھی ہو

تم اور اے آزاد! دُنیا سے نفور؟ — کیوں نہ ہو، دُنیا سے مستثنےٰ بھی ہو

وسطِ جنوری ۱۹۰۰ء۔ پٹیالہ (ریاست) برطرحِ مشاعرہ

منعقدہ مکان قاضی عبدالرؤف صاحب[3] جامی دہلوی

مری ناکامیٔ جاوید تیرا مُدّعا کیوں ہو — تری اُمّید کا آزار دردِ لا دوا کیوں ہو

وہ دِل جس سے ابھی دونوں جہاں کے کام لینے ہیں — اِک اُمیدِ وفا پر پائمالِ صد جفا کیوں ہو

اُدھر اغیار شاکی ہیں، اُدھر احباب نالاں ہیں — خدا جانے ضرورت سے زیادہ بے وفا کیوں ہو

مری تقدیر بھی تیری طرح کیوں مجھ سے پھر جائے — مری قسمت سے ہر اک ساز تیرا ہم نوا کیوں ہو

---

[1] میں "پر" بہ معنی "مگر" کو قابلِ ترک نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اُردو زبان میں یہی ایک ایسا لفظ ہے جو ہندی کے لفظ "پرنتو" سے اخذ کیا گیا ہے۔ باقی اس کے تمام ہم معنی الفاظ "مگر"۔ "لیکن" "ولے" سب فارسی یا عربی ہیں۔ اس معنی میں اُردو زبان کا صرف ایک یہی لفظ ہے جو باقی سب ہم معنی الفاظ سے مختصر بھی۔ اور دل چسپ بھی۔ مگر اربابِ اُردو ہیں کہ اسی کے گلے پر چھری پھیر دینے کو تیار ہیں۔ البتہ "پہ" کو جو "پر" بہ معنی "مگر" کا مخفف ہے ترک کر دینا چاہیئے۔ آزاد انصاری

[2] میں نے "یکجا" کو بہ معنی یکسو استعمال کیا ہے اور یہ میرا اجتہاد ہے۔ آزاد انصاری۔

[3] قاضی عبدالرؤف صاحب جامی۔ عمر ۶۰ سال۔ ساکن محلہ بلبلی خانہ دہلی۔ میرے لڑکپن کے نہایت عزیز و صادق دوست ہیں جو اُس زمانے میں پٹیالہ (ریاست) میں مقیم تھے۔ اب عرصہ سے

کسی کلفت زدہ کا دل دکھا کر کیا بھلا تو ہو — تری پاکیزہ عادت کا یہی اک مقتضا کیوں ہو

ہمیں دنیا سے کیا لینا، ہمیں عقبےٰ سے کیا مطلب — تری امید ہوتے آرزوئے ماسوا کیوں ہو

اگر کوئی ہمارا دل بہل جانے کی صورت ہو — تو دنیا بھر ہمارے واسطے وحشت سرا کیوں ہو

مجھے یہ ضد کہ تجھ سے خستگی کی داد لینی ہے — اسے یہ ہٹ کہ اک برگشتہ قسمت کا بھلا کیوں ہو

تجھے مجھ پر خدا ناخواستہ کیوں رحم آ جاتا — ترے دل میں نصیب دشمناں خوف خدا کیوں ہو

مری تقدیر بھی میرے ڈبو دینے کو کافی ہے — مری ٹوٹی سی کشتی کے لئے طوفاں بپا کیوں ہو

ترا آزاد پابند علائق ہو نہیں سکتا — وہ آزادی کا عاشق ہے، گرفتار بلا کیوں ہو

۶ر جون ۱۹۰۱ء ۔ سہارنپور ۔ طرح طبع زاد

احباب کی خاطر سے پھر انجمن آرا ہو — پھر محو تماشا کر۔ پھر گرم تماشا ہو

اف شوق بھرے دل سے تنگ آ کے مرا کہنا — ظالم! کہیں جینے دے۔ کافر! کبھی یکجا ہو[۱]

تو اور وہی غفلت، ہم اور وہی عالم — کیا صبر کی طاقت ہو، کیا ضبط کا یارا ہو

اے ذوق ستم! باز آ، اے شرم وفا! بس کر — دنیا کی نگاہوں میں کب تک کوئی ہلکا ہو

جس کو تری حسرت ہو۔ امید نہ کچھ رکھے — جس سے تجھے نسبت ہو۔ دنیا سے نرالا ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱ نمبر ۳) بمبئی میں تشریف فرما ہیں۔ جہاں آپ اردو زبان اور اس کے شعر و ادب کی نہایت قیمتی خدمات بجا لا رہے ہیں۔ آزاد انصاری۔

[۱] میں نے یہاں "یکجا" بہ معنی "یکسو" استعمال کیا ہے۔ اور یہ میرا اجتہاد ہے۔

آزاد انصاری

تم رحم نہیں کھاتے، غم راس نہیں آتا — اک دل ہے[1] سو وہ کب تک پامالِ تمنا ہو

اے وائے بحالِ ما! موت آئے نہ صبر آئے — قسمت ہو تو سیدھی ہو، دل ہو تو شکیبا ہو

ارمان نکلنے کی امید غلط نکلی — اے آس! کنارہ کر، اے یاس! گوارا ہو

آزادِ سخن پیرا! کیا واقعہ پیش آیا
تو اور یہ خاموشی؟ جیسے کوئی گونگا ہو

اوائلِ اگست ۱۹۱۲ء۔ چھاؤنی انبالہ۔ برطرح مشاعرہ منعقدہ مکانِ جج دہری حسب تقاضا

نویدِ راحتِ جاں ہو، مرادِ شوقِ پنہاں ہو — وہ دل تقدیر والا دل ہے، تم جس دل کے خواہاں ہو

گلِ گلزارِ امکاں ہو، مہِ ضو بارِ دوراں ہو — بہارِ گل بہ داماں ہو، نگارِ جلوہ ساماں ہو

ادھر دوری کا وہ عالم کہ حدِ وہم سے باہر — ادھر قرب اور اس درجہ کہ نزدیک از رگِ جاں ہو

جو الفت ہو تو ایسی ہو کہ مشکل سے یقیں آئے — جو وعدہ ہو تو ایسا ہو کہ زیبِ طاقِ نسیاں ہو

غلط نکلا، تمھیں جانِ جہاں کہنا غلط نکلا — خدا شاہد۔ خدائی بھر کی بربادی کے ساماں ہو

سمجھتا ہوں، نگاہِ لطف کا منشا سمجھتا ہوں — بظاہر دل کے خواہاں ہو۔ بباطن دشمنِ جاں ہو

کہیں ایسا نہ ہو انجامِ بے رحمی برا نکلے — جو ممکن ہو، تلافی کر۔ نہ ممکن ہو، پشیماں ہو

مناسب ہو تو اب ترکِ تعلق کیوں نہ کر دیکھیں — ادھر میں ہوں کہ شاکی ہوں، ادھر تم ہو کہ نالاں ہو

جسے دیکھو، وہ دیوانہ۔ جسے پوچھو، وہ پریشاں — بہارِ باغِ ہستی ہو، فروغِ بزمِ امکاں ہو

یہ کیا رنگِ تماشا ہے۔ ابھی پیدا، ابھی پنہاں — جو پیدا ہو تو پیدا ہو، جو پنہاں ہو تو پنہاں ہو

نہ اب راحت سے مس باقی، نہ راحت کی ہوس باقی — فقط اس درد کے ارماں ہیں، تم جس کے درماں ہو

[1] دیکھو صفحہ (۸۵) حاشیہ (۱)

کوئی دونوں جہاں سے ہاتھ اُٹھا بیٹھا تو کیا ہوا — تم اِن ہولوں بھی سستے ہو، تم اِن اموں بھی زیاں ہو

کبھی آزاد! ہم کو بھی دعا سے یاد فرمانا — کہ مقبولِ خدا ہو، خاصۂ خاصانِ یزداں ہو

اواخر جنوری ۱۹۱۴ء - انبالہ چھاؤنی - بطرح مشاعرہ منعقدہ مکان منشی محمد اکبر خاں صاحب اکبر

اے کاش! ذوقِ دردِ محبت فنا نہ ہو — اے کاش! اِس ابتدا کی کبھی اِنتہا نہ ہو

ہم اور یہ طلب کہ تمھاری خوشی کریں — تم اور یہ غضب کہ ہمارا بھلا نہ ہو

بے رحم! جور داخلِ انداز ہی سہی — پھر بھی جو بے قصور ستانا روا نہ ہو

ترکِ تعلقات کی تجویز برمحل — لیکن جو اِس علاج سے بھی فائدا نہ ہو

انصاف کر، تجھے بھی ستانا روا نہیں — جب تک ہمیں مجالِ شکایت عطا نہ ہو

اٹھ اور اٹھ کے جراتِ اتمامِ جور کر — جب لاگ ہے تو مائلِ خوفِ خدا نہ ہو

اندھیر ہے، مقدمۂ جرمِ شوق کا — اِجلاسِ لطفِ دوست میں بھی فیصلہ نہ ہو

ہاں ہاں قبول، ترکِ شکایت مجھے قبول — لیکن اِعادۂ ستمِ ناروا نہ ہو

تو اور چشمِ لطف؟ نئی واردات ہے — میری نگاہ نے مجھے دھوکا دیا نہ ہو

جی بھر کے ظلم کر، مگر اِس شرطِ خاص پر — جب لطف ہو تو لطف کی بھی اِنتہا نہ ہو

مجھ سے جدا سہی، مگر اُلفت کا واسطہ — دِل کا قرار چھین کے دِل سے جدا نہ ہو

حسن، بربنائے تجربہ میرا خیالِ حسن — آفت کا سامنا ہو۔ ترا سامنا نہ ہو

اب ٹھان لی ہے، سر ترے در پر جھکا رہے — جس وقت تک فریضۂ اُلفت ادا نہ ہو

آزادؔ! اب اُٹھ اور اُٹھ کے پیا پے صدا لگا — افسوس ہے کہ پُرسشِ حالِ گدا نہ ہو

اوائلِ جنوری ۱۹۲۰ء۔ علی گڈھ۔ طرحِ طبع زاد

کچھ تو بتا دو، کس لئے جان کے خواستگار ہو — اِس لئے، شاید اس لئے، مقصدِ جان زار ہو

مطربِ نغمہ کار ہو، ساقیٔ بادہ بار ہو — زہرہ نوا نگار ہو، میکدہ زا بہار ہو

نامِ خُدا جدھر گئے، دِل میں اُتر اُتر گئے — خنجرِ آبدار ہو، دشنۂ تاب دار ہو

کون جگر بہ کف رہے، کون ترا ہدف رہے — کون اُمیدوار ہو، کون ترا شکار ہو

رفعِ ملال چاہیئے، کچھ تو خیال چاہیئے — رُوحِ تنِ فگار ہو، راحتِ جانِ زار ہو

ہم تمھیں سہل چھوڑ دیں، ہوش میں آؤ ہوش میں — حاصلِ سعیٔ کار ہو، ثمرۂ انتظار ہو

پھول نثار کیوں نہ ہوں۔ لوٹ کے ہار کیوں نہ ہوں — شاہدِ گُل عذار ہو، غیرتِ صد بہار ہو

قتلِ جہاں مُباح ہے۔ ہاں تمھیں ہاں مُباح ہے — صاحبِ اقتدار ہو، فائزِ اختیار ہو

دونوں جہاں تباہ ہیں، کون و مکاں گواہ ہیں — دلبرِ فتنہ کار ہو۔ آفتِ روزگار ہو

تم سے نظامِ دو جہاں تم سے قیامِ دو جہاں — ضامنِ ہر دیار ہو، مرکزِ ہر مدار ہو

ہم تمھیں جانتے بھی ہیں۔ ہم تمھیں مانتے بھی ہیں — خالقِ نور و نار ہو۔ رازقِ مور و مار ہو

اواخر اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء۔ دہلی۔ بر طرحِ مشاعرۂ منعقدہ مکان منشی وحید الدین صاحب[1] بیخود۔ واقع محلّہ مٹیا محل۔ دہلی

موقّر سے موقّر ہو۔ مفتخر سے مفتخر ہو — اُدھر سب سے مقدم تھے، اِدھر سب سے مؤخر ہو

[1] (نوٹ: صفحہ ۲۰ کے حاشیہ پر تحریر ہے)

غلط شکووں سے کیا حاصل کہ ظالم ہو، ستمگر ہو — اگر ہو، کچھ مناسب جان کر، بہتر سمجھ کر ہو

خوشا وہ دن! کہ حسبِ مدّعا عزّت میسر ہو — خوشا وہ دن! کہ قسمت سے مرا سر ہو، ترا در ہو

گُل و سرو و صنوبر ہو، مہ و خورشید و اختر ہو — ادھر بھی جلوہ گستر ہو، اُدھر بھی جلوہ گستر ہو

نگارانِ من صدقے، بہارانِ چمن صدقے — نگارِ حور پیکر ہو، بہارِ نور پیکر ہو

اب اِس پردے سے کیا حاصل، اُٹھا بھی دو کہ لا حاصل — تمھیں پردے کے باہر ہو، تمھیں پردے کے اندر ہو

ترا در دِ طلب پایا تو میں ایمان لے آیا — وہی جی ہے جو بیکل ہو، وہی دل ہے جو مضطر ہو

محبّت سے جلا پائیں تو دل آئینے بن جائیں — نہ میں تجھ سے مکدّر ہوں، نہ تو مجھ سے مکدّر ہو

درِ دولت سے جاتے ہیں، مگر اتنا جتاتے ہیں — ہم آخر بندہ در ہیں، تم آخر بندہ پرور ہو

مرض ہے اور یہ دعوے کہ درماں بن کے دم لوں گا — غرض ہے اور یہ سودا کہ ہم افعال جوہر ہو

خدا شاہد۔ ہم از خود بزمِ صہبا میں نہیں آئے — کوئی دامن پکڑ لایا کہ چل حق دارِ کوثر ہو

خدا معلوم! اب آزادؔ ہم سے کیوں نہیں کھلتا — بہت ممکن ہے، اِس میں کوئی رازِ خاص مضمر ہو

اواخرِ اکتوبر ۱۹۲۱ء - دہلی - بر طرح ماسبق

تمھیں عذرِ جفا کی کیا ضرورت، تم ستمگر ہو — تمھیں خوفِ خدا سے کیا تعلّق، دِل کے پتھر ہو

(حاشیہ سلہ صفحہ ۱۱۵) حضرت سید وحید الدین صاحب بیخودؔ کا خاندان موجودہ دہلی میں منجملہ اُن چند معزز قدیم اور مشہور خاندانوں کے ہے جن کی اُردو۔ اُردوئے معلّٰے مانی جاتی ہے۔ اور جہاں سے ٹکسالی اردو کی سند لی جاتی ہے۔ آپ دہلی کے مشہور و معروف۔ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ بالعموم آپ کے اشعار میں گہری شعریت پائی جاتی ہے۔ آپ کا پایۂ شاعری اس قدر بلند ہے جس کی نظیر کسی دوسری جگہ تلاش کرنی فضول ہے۔ اور چونکہ آپ نے ایک عرصے تک شمس العلماء حضرت حالیؔ علیہ الرحمۃ سے بھی اِصلاح لی ہے۔ اِس لئے خاکسار کو آپ کے استاد بھائی ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ آزادؔ انصاری

تمنّائے ترحّم کیا کہوں، ہمّت نہیں پڑتی — تقاضائے توجّہ کیا کروں، غفلت کیسے خوگر ہو
ستم جائز، جفا جائز، مگر انصاف نا جائز — نزلے عدل پرور ہو، انو کھے داد گستر ہو
معاذ اللہ تلوّن سا تلوّن ہے معاذ اللہ — ابھی فرشِ زمین پر تھے، ابھی عرش بریں پر ہو
خوشا وہ دن! کہ دل تشویشِ مرگ و زیست سے چھوٹے — خوشا وہ دن! کہ اطمینان سے جینا میسّر ہو
جسے آزاد! قیدِ زیست بھی دو بھر نظر آئے — اُسے قیدِ غمِ دُنیا گوارا ہو تو کیو نکر ہو

وسطِ مارچ ۱۹۲۳ء۔ دہلی۔ بہ طرح مشاعرۂ سالانہ نو چندی میرٹھ منعقدہ
۱۷ و ۱۸ مارچ ۱۹۲۳ء مسلسل بطرزِ ترجیع جدید[۱]

ہمارے[۲] دِل کو صرفِ یاس کامل دیکھتے جاؤ — ہمارے خبطِ بے حاصل کا حاصل دیکھتے جاؤ
ہمیں بھی کارِ رہبری ہیں شاغل دیکھتے جاؤ — ہماری زندگی کے بھی مشاغل دیکھتے جاؤ

وہ دِل، جو آج تک ناکامیابِ حلِ مشکل تھا — اب اُس کو کامیابِ حلِ مشکل دیکھتے جاؤ
وہ رہرو، جو کبھی ناواقفِ خطراتِ منزل تھا — اب اُس کو واقفِ خطراتِ منزل دیکھتے جاؤ

وہ مردِ عشق، جو راہِ طلب میں سب کا رہبر تھا — اُسے کارِ طلب میں آپ کاہل دیکھتے جاؤ
وہ فردِ عشق، جو بحرِ محبّت کا شناور تھا — اُسے آسودۂ دُنیائے ساحل دیکھتے جاؤ

---

[۱] دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)
[۲] یہ غزل "بیزارِ محبّت" کے عنوان سے رسالۂ "ہمایوں لاہور" میں شائع ہو چکی ہے۔

وہ طالب، جس کا دل اُمیدِ باطل کا فدائی تھا — اُسے آزردۂ اُمیدِ باطل دیکھتے جاؤ
وہ عاشق، جس کا مسلک ہی محبت میں رجائی تھا — اُسے سو بیدلوں کا ایک بیدل دیکھتے جاؤ

وہ بےکس، جو کبھی قصدِ خطا کرتے بھی ڈرتا تھا — اُسے قصداً خطا کرنے میں عاجل دیکھتے جاؤ
وہ بےبس، جو کبھی مجبورِ شکرِ جورِ بےجا تھا — اُسے چون و چرا کرنے کے قابل دیکھتے جاؤ

وہ ربطِ عشق، جس کو ضبطِ عرضِ حالتِ دل تھا — اُسے بیزارِ عرضِ حالتِ دل دیکھتے جاؤ
وہ ضبطِ شوق، جو کل تک دلِ شیدا کو مشکل تھا — اُسے خوئے دلِ شیدا میں داخل دیکھتے جاؤ

وہ اُمیدِ فنا، جو باعثِ تسکینِ پنہاں تھی — اُسے شکلِ بلائے یاس نازل دیکھتے جاؤ
وہ ارمانِ لقا، جس کی بدولت زیست آساں تھی — اُسے مہلک بسانِ سمِ قاتل دیکھتے جاؤ

وہ شوقِ وصل، جو اک دن علاجِ غم میں کوشاں تھا — اُسے فکرِ علاجِ غم سے غافل دیکھتے جاؤ
وہ دردِ ہجر، جو اک دن ضرورتمندِ درماں تھا — اُسے سوئے سکونِ تام مائل دیکھتے جاؤ

وہ نظریں، جو کبھی اک لب وفا سے لڑکے نازاں تھیں — اب اُن کو اپنی بدبختی کا قائل دیکھتے جاؤ
وہ آنکھیں، جو کبھی پروانۂ رخسارِ تاباں تھیں — اب اُن کو گریۂ حسرت میں شاغل دیکھتے جاؤ

وہ اُلفت، جس کے استحکام پر دُنیا کو حیرت تھی — اب اُس کو مثلِ رنگِ خام زائل دیکھتے جاؤ

وہ بدبختِ محبت، جس کی فطرت ہی محبت تھی ‏ ‏ اب اُس کو صبر کر لینے کے قابل دیکھتے جاؤ

وہ آزادِ حزیں، جو آج تک آزادِ ناقص تھا ‏ ‏ اُسے نازانِ آزادیٔ کامل دیکھتے جاؤ

اوائل اپریل سنہ ۲۴ء حیدرآباد دکن - برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان

حضرت[1] ضامن کنتوری

رشکِ گُل ہو، غیرتِ شمشاد ہو ‏ ‏ نوبہارِ گلشنِ ایجاد ہو

متصلِ بیداد پر اُمیدِ داد؟ ‏ ‏ حق تو یہ ہے، مستحقِ داد ہو

کوششِ جور و ستم بر حق - مگر ‏ ‏ ماحصلِ جور و ستم ارشاد ہو

یا دلِ انساں ہوا اور اُلفت کا غم ‏ ‏ یا غمِ اُلفت کی استعداد ہو

خوفِ نا اُمیدیٔ دائم غلط ‏ ‏ عادی[2] "لا یخلف المیعاد" ہو

کیا اجازت ہے؟ کہ اک محرومِ داد ‏ ‏ باریابِ بارگاہِ داد ہو

قطعہ

حضرتِ آزاد! یہ نیرنگیاں؟ ‏ ‏ واقعہ یہ ہے کہ تم استاد ہو

کل تلک[3] اک رندِ شاہد باز تھے ‏ ‏ آج زیبِ مسندِ ارشاد ہو

---

[1] دیکھو صفحہ (۳۴) حاشیہ (۱)

[2] میں لفظ "عادی" کو بمعنی خوگر استعمال کرنا جائز و صحیح سمجھتا ہوں - آزاد انصاری -

[3] میں "تلک" کو قابلِ ترک نہیں سمجھتا - آزاد انصاری

ناتمام غزلیات کے اشعار

دسمبر سنہ ۱۸۹۲ء ۔ سہارنپور

جو اُلفت کا مزا چکھنا ہے، تم بھی عشق کر دیکھو نصیبِ دشمناں مرنا ہے گر منظور، مر دیکھو

عجب حالت ہے دِل کی کوئی غم ہو، کوئی آفت ہو جہاں دیکھو، اِسی کمبخت کو سینہ سپر دیکھو

اواخر فروری سنہ ۱۹۰۸ء سہارنپور

اے جُنونِ عشق! ادب ملحُوظ رکھ دیکھ! وہ میری طرح رُسوا نہ ہو

ہائے ہوّز

اَواخرِ مئی سنہ ۱۹۲۱ء ۔ دھلی۔ طرحِ طبع زاد

تلوّن دکھلانے سے کیا فائدہ تحیّر بڑھانے سے کیا فائدہ

لُبھا کر ستانے سے کیا فائدہ لگا کر بجھانے سے کیا فائدہ

ﻟﮧ یہ غزل حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب بیدل علیہ الرحمۃ خلف حضرت مولانا احمد علی صاحب مُحدّث سہارنپوری کی (جو فنِ شعر میں خاکسار آزاد کے اوستادِ اوّل تھے) اصلاح سے شرف یافتہ تھی۔ پُوری غزل تھی۔ ضائع ہوگئی۔ صرف دو شعر یاد رہ گئے تھے جو بطور نمونہ کلام اِبتدائی یہاں درج کر دیے گئے ہیں۔ مطلع میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔ البتہ شعر کے مصرعہ اوّل میں اِصلاح عمل میں آئی تھی۔ میرا مصرعہ تھا "عجب کچھ حالتِ دل ہے، کوئی غم کچھ مصیبت ہو" ظاہر ہے کہ میرا مصرعہ سُست تھا۔ اور بہت سُست۔ حضرت اُستاذی مولانا بیدل علیہ الرحمۃ کی اِصلاح نے چند*

* الفاظ کے تبدّل و تغیّر سے سُست مصرعے کو چُست کر کے پورے شعر کا مرتبہ بلند تر کر دیا۔ آزاد انصاری۔

اَدائیں دِکھانے سے کیا فائدہ ستم ڈھائے جانے سے کیا فائدہ
محبّت جتانے سے کیا فائدہ پتنگے لگانے سے کیا فائدہ
جو آنا ہے، دُکھ کی دوا بن کے آ قضا بن کے آنے سے کیا فائدہ
ستانا روا ہے تو بے شک ستا مگر بھول جانے سے کیا فائدہ
جو خوف خدا ہے تو غافل نہ ہو غلط رحم کھانے سے کیا فائدہ
دغا دے کے عذرِ دغا رائگاں بڑھا کر بھلانے سے کیا فائدہ
اب آنکھوں کے آگے وہ جلوے کہاں اب آنکھیں اٹھانے سے کیا فائدہ
کسی دن کھلا روئے زیبا دکھا چھپا کر دکھانے سے کیا فائدہ
اٹھا، پردۂ شرمِ بے جا اٹھا حقیقت چھپانے سے کیا فائدہ
بس۔ اے فتنۂ قامتِ یار! بس بہت سر اٹھانے سے کیا فائدہ
بس۔ اے جلوۂ محشر آثار! بس بہت قہر ڈھانے سے کیا فائدہ
تھم۔ اے گردشِ چشمِ مخمور! تھم پیاپے پلانے سے کیا فائدہ
تھم۔ اے بارشِ بادۂ نور! تھم دما دم چھکانے سے کیا فائدہ
اوائل میں، یعنی دمِ جوشِ عشق عواقب سجھانے سے کیا فائدہ
جنونِ تجسس! کہاں لے چلا پریشاں پھرانے سے کیا فائدہ
کمالِ طلب! سوئے منزل بڑھا تھکا کر بٹھانے سے کیا فائدہ
سزا کے مزے لوٹنے دیجیے خطا بخشوانے سے کیا فائدہ

کہیں اہلِ طاعت کی پُرسش نہیں ‏ ‏ جبینیں گھسانے سے کیا فائدہ
گدائے درِ دوست ! چپ سا دھ جا ‏ ‏ صدائیں لگانے سے کیا فائدہ
مقاصد کے در زورِ بازو سے کھول ‏ ‏ فقط کھٹکھٹانے سے کیا فائدہ
اب آزاد! اُٹھو اور سوئے راہِ دوست ‏ ‏ بڑھو، ہچکچانے سے کیا فائدہ

ی

اوائلِ مارچ ۱۸۹۶ء - سہارنپور - برطرح مشاعرہ منعقدہ تحصیلی اسکول سہارنپور

جو حال دیکھتے ہو وہ خود عرضِ حال ہے ‏ ‏ درویش ہوں، فقیر ہوں، صورت سوال ہے
اب دل ہے اور دل میں تمھارا خیال ہے ‏ ‏ اور وہ خیال جس کا بُھلانا محال ہے
ایسا نہ ہو کہ ضبطِ شکایت نہ ہو سکے ‏ ‏ لِلّٰہ یہ نہ پُوچھ کہ "جی کیوں نڈھال ہے"
اچھا - اِک آرزو نہ رہی، دل کا کیا علاج ‏ ‏ دل بھی تو آرزو کی طرح پائمال ہے
مقدور ہو تو زخمِ جگر سے یہ پُوچھیے ‏ ‏ ظالم! ترے نصیب میں بھی اندمال ہے
اے طاقتِ جواب! یہہ بے اعتنائیاں؟ ‏ ‏ کمبخت! دیکھ تو، کوئی پُرسانِ حال ہے
یہہ کون چاہتا ہے؟ کہ افشائے راز ہو" ‏ ‏ یہہ عرض تھی کہ "ضبطِ تمنّا محال ہے"
اب دل ہے اور دل میں ہزاروں تفکرات ‏ ‏ اور وہ تفکرات کہ جینا وبال ہے

قاضی ہو، شیخِ وقت ہو، زاہد ہو، رند ہو — ہم دیکھتے ہیں، مُفت کی سب کو حلال ہے
آزادؔ! دل کا درد چھپانے سے فائدہ؟ — صورت ہی کہہ رہی ہے، طبیعت نڈھال ہے

وسطِ جون ۱۸۹۸ء - سہارنپور - بر طرحِ رسالہ خورشیدِ سخن[1] دیو بند

تجھ کو میرے دل سے پُوچھا چاہیئے — تجھ کو ان آنکھوں سے دیکھا چاہیئے
دیکھ لی، تیری تجلّی دیکھ لی — دیکھنے کو بھی کلیجا چاہیئے
تیری وہ غفلت کہ پروا ہی نہیں — میری وہ حالت کہ دیکھا چاہیئے
یاس کہتی ہے کہ "تُو ملنا محال" — شوق کو یہ لت کہ "ڈھونڈا چاہیئے"
تُو ہے اور وارستہ بے پروائیاں — کیا مجھے بھی صبر کرنا چاہیئے؟
کیا نئی ضد ہے کہ "ناداں! صبر کر" — صبر آ جائے تو پھر کیا چاہیئے
ڈوبتوں کا بچ نکلنا سہل ہے — ایک تنکے کا سہارا چاہیئے
میری کھیتی کا پنپنا کیا محال — اک ترشّح، ایک چھینٹا چاہیئے
میری بگڑی کا بنانا کیا محال — لطف کی آنکھوں سے دیکھا چاہیئے
چارۂ بیمار کچھ مشکل نہیں — التفاتِ چارہ فرما چاہیئے
آہ! اے آرامِ جانِ بے قرار — درد بن کر دل میں رہنا چاہیئے؟

---

[1] "خورشیدِ سخن" اِک ماہانہ گلدستہ تھا جو ۱۸۹۹ء تک دیوبند ضلع سہارنپور سے میرے دلی مرحوم دوست حکیم نظیر حسین مسیحا کی ادارت میں بہ حُسن و خوبی شائع ہوتا رہا۔ اور بعد میں بند ہو گیا۔ - آزادؔ انصاری۔

حادثاتِ دہر کے شکوے فضول — کڑوی میٹھی سب گوارا چاہیئے
اب فلک مثلِ زمیں گردش میں ہے — مقتضائے وقت سمجھا چاہیئے
حضرتِ آزاد! یوں بیدل نہ ہو — اُس کی رحمت پر بھروسا چاہیئے

اوائلِ ستمبر ۱۸۹۵ء ۔ سہارنپور ۔ بطرحِ گلدستۂ خورشیدِ سخن۔ دیوبند[۱]

کیا تیرے دیکھنے کی تمنا کرے کوئی — تو ایسی چیز ہے؟ کہ تماشا کرے کوئی
وہ دن گئے کہ رخصتِ اظہارِ شوق تھی — اب کر سکے تو ضبطِ تمنا کرے کوئی
پھر دل ہے۔ اور پھر وہی غمہائے انتظار — اور اعتبارِ وعدۂ فردا کرے کوئی
اک میرے اضطراب کی حالت کہ الاماں! — اک آپ کا مزاج کہ ڈھونڈا کرے کوئی
تم آئے اور شوق نے اوسان کھو دئیے — فرصت کہاں؟ کہ عرض تمنا کرے کوئی
ہاں۔ اس طرف بھی کوئی ترشح۔ کہ العطش! — تا چند قطرے قطرے کو ترسا کرے کوئی
آزاد! گزری بات کے ارمان ہی فضول — کب تک اسی لکیر کو پیٹا کرے کوئی

اواخرِ دسمبر ۱۸۹۵ء ۔ سہارنپور ۔ بطرحِ گلدستۂ خورشیدِ سخن۔ دیوبند[۲]

کوئی ہر سو بھٹکتا پھر رہا ہے — نہ رہبر ہے نہ کوئی رہنما ہے
کسی بیکس کا بیڑا ڈوبتا ہے — کوئی اِس ناؤ کا بھی ناخدا ہے؟

ف ۱-۲ دیکھو صفحہ (۱۲۳) حاشیہ نمبر (۱)

زہے! طرزِ نوازش ہائے مخصوص — کہ لب پر شکر ہے، دل میں گلا ہے
بس اب تم کو تغافل ہی مبارک — ہمیں تھوڑا بہت صبر آ چلا ہے
کبھی جس دل میں تیری آرزو تھی — وہ اب صرفِ غمِ بیم و رجا ہے
کبھی جس دل میں تیری حسرتیں تھیں — وہ اب اک کشمکش میں مبتلا ہے
کبھی جس دل میں صرف اک تو ہی تو تھا — جہانِ یاس و حسرت بن گیا ہے
کسی دن رحم فرمانا پڑے گا — کوئی بے وجہ پامالِ جفا ہے
کسی دن سخت پچھتانا پڑے گا — مآلِ بیکس آزاری برا ہے
ہماری حسرتیں بھی مٹ سکیں گی؟ — ہمارے درد کی بھی کچھ دوا ہے؟
یہاں ہم اور تابِ صبر عنقا — وہاں جو بات ہے صبر آزما ہے
کسی کی حسرتوں کی لاج رکھ لے — کسی کو تجھ سے امیدِ وفا ہے
کہاں تیری توجہ اور کہاں ہم — بجا ہے، بے نیازی ہی بجا ہے
خوشا وہ دن! کہ جب تو مہرباں تھا — وہ سین[1] آنکھوں میں اب تک پھر رہا ہے
الٰہی! کامیابی رہ نما ہو — کوئی امید وارانہ چلا ہے
جسے آزاد کہتا ہے زمانہ — حقیقت میں گرفتارِ بلا ہے

---

[1] "سین" بہ معنی "منظر" انگریزی لفظ ہے۔ مگر بہت مختصر اور دلچسپ لفظ ہے۔ اور چونکہ بول چال۔ اور تحریر و تقریر میں مستعمل ہو چکا ہے۔ اِس لئے میں غزل میں اِس کا استعمال جائز رکھتا ہوں۔ آزاد انصاری۔

اوائل نومبر ۱۸۹۹ء - بسی علاقۂ ریاست پٹیالہ - طرح طبع زاد

میں اور تری شکایت؟ تہمت ہے، افترا ہے
جو دل میں وہ زباں پر، "اللہ جانتا ہے"

تو اور چشم پوشی، قسمت کی خوبیاں ہیں
ہم اور کس مپرسی، تقدیر کی خطا ہے

ان بے نیازیوں کا انجام کچھ نہ ہو گا
ان ناشکیبیوں پر کیا جرأت آزما ہے

حسرت نصیب آنکھیں تیری ہی منتظر ہیں
کلفت نصیب دل کا اک تو ہی مدعا ہے

اب ہم تمہیں بتائیں، دامِ کرم بچھا دو
بیدادِ ناروا کا موقع گزر چکا ہے

اب رحمتِ تغافل کچھ فائدہ نہ دے گی
مایوس ہو چکا ہوں اور صبر آ چلا ہے

ظالم! وہ دُھن کہ تیری حسرت سے نامراد ہے
اک خار ہے کہ میرے دل میں کھٹک رہا ہے

کافر! وہ غم کہ تیری اُلفت کا ماحصل ہے
اک زخم ہے کہ جس کی ہر ٹیس جانگزا ہے

وہ دوستوں کے جلسے۔ وہ دل لگی کے ساماں
گزرا ہوا زمانہ آنکھوں میں پھر رہا ہے

دریا ہے اور تلاطم، کشتی ہے اور تباہی
اے ناخدائے عالم! اب تو ہی ناخدا ہے

آزاد! تا بہ امکاں منزل کی جستجو کر
اللہ راہ بر ہے، اللہ رہ نما ہے

---

۱۷ جون ۱۹۰۱ء - سہارنپور - بر طرحِ مشاعرۂ منعقدۂ غریب خانۂ اخفر

کسی کے ستم کی شکایت گناہ ہے
ہماری خموشی نہیں ہے، فغاں ہے

کبھی دوستوں کی خبر تک نہ لینی
یہیں تک خیالِ دلِ دوستاں ہے

تلافیٔ مافات کی کیا ضرورت
ترے غم میں دل ہر طرح شادماں ہے

اگر فرض کر لوں کہ تم باوفا ہو — تو مجھ کو جنوں ہے کہ دل بدگماں ہے
مگر آج کوئی نیا گل کھلے گا — یہ کیا ماجرا ہے کہ تو مہرباں ہے
ضرور آپ کے دل میں انصاف ہوگا — کہ اذنِ شکایت نہ حکمِ فغاں ہے
تری طرزِ الفت ستم ڈھا رہی ہے — خبر لے کہ چشمِ کرم رائیگاں ہے
نہ دیوار کا نام باقی نہ در کا — ہمارا مکاں ہر طرح لامکاں ہے
بہارِ چمن اس طرف بھی گزر کر — چمن کا چمن پائمالِ خزاں ہے

اواخر اکتوبر ۱۹۱۰ء ۔ سہارنپور ۔ بر طرح مشاعرۂ منعقدۂ مکانِ احقر

کم و بیش ہر حوصلہ مٹ چکا ہے — نہ کچھ آرزو ہے، نہ کچھ مدعا ہے
نہ امید ٹوٹے، نہ ارمان نکلے — ہمارا مرض ہر طرح لادوا ہے
مقدر مخالف، زمانہ مخالف — جسے دیکھتا ہوں، ترا ہمنوا ہے
ذرا دانستہ داشتہ[1] مہرباں ہو — کوئی چشمِ الفت سے ناآشنا ہے
جہاں تک ہو، اغماض جائز نہ رکھنا — کہ امیدواروں کا دل ٹوٹتا ہے
اچانک ترا یاد آنا ستم تھا — کوئی روح کھینچے لئے جا رہا ہے
خوشا وہ زمانہ! کہ تجھ پر فدا تھے — دل اب تک وہی فرصتیں ڈھونڈھتا ہے
نہ اگلا سا عالم نہ پہلی سی دنیا — خداوندِ عالم! یہ کیا ماجرا ہے

[1] "داشتہ داشتہ" بہ معنی آہستہ آہستہ ۔ بتدریج ۔ ٹھہر ٹھہر کر ۔ دہلی کے فصحا کا محاورہ ہے ۔ آزاد انصاری

بڑی سی بڑی کوششیں ختم ہو لیں
اب امدادِ غیبی! اتر آ سرا ہے

کٹھن منزلو! رحم سے کام لیجو[1]
کوئی پاپیادہ[2] سفر کر رہا ہے

موافق ہواؤ! کچھ امداد کیجو[3]
کہ بوسیدہ کشتی ہے طوفاں بپا ہے

تباہی کو بیڑے سے لاگ آ پڑی ہے
خدا ہی مری ناؤ کا ناخدا ہے

تلاطم کے صدمے ڈبو کر رہیں گے
حقیقت میں بیڑے کا وقت آ لگا ہے

اب آزاد! آزادیاں بھول جاؤ
کہ قیدِ علائق سے پالا پڑا ہے

اواخرِ دسمبر ۱۹۰۱ء ۔ سہارنپور ۔ طرح طبع زاد

بہت اغماض بھی اچھا نہیں ہے
ہمارا کوئی حق ہے یا نہیں ہے؟

ضرورت تھی کہ تو غافل نہ ہوتا
مگر تقدیر سے ایسا نہیں ہے

مٹانا ہے تو کوتاہی نہ فرما
سسکتا چھوڑنا اچھا نہیں ہے

کبھی اپنے سلوکوں پر نظر کر
شکایت ہو تو کچھ بے جا نہیں ہے

کسی کو تیری نسبت کیا بتادوں
یہ دیکھا ہے کہ کچھ دیکھا نہیں ہے

نگاہِ لطف کی تکلیف فرما
کہ ضبطِ شوق کا یارا نہیں ہے

ف۱ لیجیو، لیجو اور کیجیو، کیجو یہ اور اسی قسم کے قدیم الفاظ مجھے بہت محبوب و مرغوب ہیں۔ آزاد انصاری
ف۲ میں "پاپیادہ" اور "پیادہ پا" دونوں کو فصیح سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری۔
ف۳ دیکھو صفحۂ ہٰذا حاشیہ (۱)

تعلّق جان کو آیا ہوا ہے | ترے ہوتے بھی صبر آتا نہیں ہے
کبھی وہ سنگدل تک مہرباں تھا | اور اب قسمت سے بھی لہنا نہیں ہے
ترے احباب اور یہ کس مپرسی | تجھے کیا واقعی پروا نہیں ہے؟
ادھر بھی اک نگاہِ لطف ادھر بھی | غریب آزاد مُستثنےٰ نہیں ہے

اوائلِ جنوری ۱۹۰۲ء۔ دہرہ دون۔ برطرحِ پیامِ عاشق[۱] قنوج

اب تیری جستجو نہ ترا انتظار ہے | مایوسیاں ہیں اور دلِ امیدوار ہے
وہ دن گئے کہ دل تری اُلفت سے شاد تھا | اب پائمالِ گردشِ لیل و نہار ہے
وقتِ وداع بخل تسلّی روا نہ رکھ | یہ وقت وقتِ رخصتِ صبر و قرار ہے
اک آس ہے سو یاس کا پہلو لئے ہوئے | اک جان ہے سو بیم و رجا کا شکار ہے
آزاد! فکرِ منزلِ مقصود چاہیئے | رستا کٹھن ہے، پائے تجسّس فگار ہے

---

۱۲ فروری ۱۹۰۸ء۔ کانپور۔ برطرح مشاعرہ منعقدہ مجلسِ ناچ گھر

کیا توقع کہ توجّہ سے سنے گا کوئی | کیا نتیجہ کہ کرے[۲] عرض تمنّا کوئی
یہی غفلت ہے تو امّید تسلّی بے سود | یہی حالت ہے تو کیا صبر کرے گا کوئی
رحم فرمائیں تو کیوں شکوہ زباں تک آئے | حال سن لو تو نہ قصّہ ہے نہ جھگڑا کوئی

---

[۱] پیام عاشق اُس زمانے کا مشہور گلدستہ تھا جو عرصہ ہوا کہ بند ہو چکا ہے۔ آزاد انصاری

[۲] دیکھو صفحہ (۳۴) حاشیہ (۱)

آس کہتی ہے کہ "درماں سے شفا ممکن ہے" — یاس کہتی ہے کہ "اُمید نہ رکھنا کوئی"

کچھ یہ ارمان نہیں ہے کہ تمنا نکلے — اتنی حسرت ہے کہ دے جائے دلاسا کوئی

نگہِ لطف کی تکلیف گوارا فرما — ناشکیبا ہے ضرورت سے زیادہ کوئی

ہائے! مجھ سے مرے ارمان بھرے دل کے سلوک — وہ بھی دن ہوں گے کہ ارمان نہ ہوگا کوئی

ہاں! ضرورت ہے۔ خدا کے لئے نادم ہو جا — کر رہا ہے ترے اغماض کا شکوا کوئی

ہم نے جس روز سے دُنیا کو بہ عبرت دیکھا — دل میں باقی نہ رہی حسرتِ دُنیا کوئی

کاش! آزادؔ تری دُھن میں بھٹکتا نہ پھرے — کاش! منزل کا بتا دے اُسے رستا کوئی

اوائلِ جون ۱۹۰۵ء۔ کانپور۔ برطرحِ مشاعرہ منعقدہ مکان حکیم حسن مہدی صاحب ازلؔ[۱]

خلفِ حضرت آباد عظیم آبادی

اک ترے شوق نے خود رفتہ بنا رکھا ہے — اک تری یاد نے دُنیا کو بُھلا رکھا ہے

اب تری آرزوئے لطف میں کیا رکھا ہے — اب ترے جور نے بھی لطف دکھا رکھا ہے

دل کو بیتابیِ پیہم تو زباں پر نالے — اک مزا ہے کہ محبت نے چکھا رکھا ہے

ہو سکے تو کبھی اُلفت کی نظر سے دیکھو — اس نگاہِ غلط انداز میں کیا رکھا ہے

تیرے الطافِ فراواں کوئی مجھ سے پوچھے — اک توجہ تو یہی ہے کہ بُھلا رکھا ہے

---

[۱] حکیم سید حسن مہدی صاحب ازلؔ خلف حضرت آباد عظیم آبادی جو اُس زمانے میں بسلسلہ مطب کانپور میں مقیم تھے۔ نہایت صاحب علم اور بے حد خوش فکر شاعر تھے۔ افسوس کہ اوائل ۱۹۰۵ء میں بعارضہ طاعون عین عالمِ شباب میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ آزادؔ نعمانی

کیا ضرورت، تجھے تکلیفِ تلافی کیوں دوں
کیا یہ احسان نہیں ہے کہ ستا رکھا ہے

اب تمنائے وفا ہو تو خدا را اس غ لائے
کونسا ظلم ہے جو تم نے اٹھا رکھا ہے

نہ وطن میں ہمیں راحت ہے نہ پردیس میں چین
وحشتِ دل نے پریشان پھرا رکھا ہے

دل سے آزاد! اُس اللہ کا بندہ بن جا
جس نے پردیس میں عزت کو بنا رکھا ہے

وسطِ جون ۱۹۰۴ء۔ کانپور۔ برطرحِ مشاعرہ منعقدہ مکان حکیم حسن مہدی صاحب
ازل خلفِ حضرت آباد عظیم آبادی واقع مول گنج۔ کانپور

نہ وہ ہم ہیں، نہ وہ دل ہے، نہ حسرت ہے، نہ ارماں ہے
وفورِ نامرادی ہے، ہجومِ یاس و حرماں ہے

اُمنگیں ہیں سوا فسردہ، طبیعت ہے سو پژمردہ
نہ دلچسپی کی صورت ہے، نہ خوش وقتی کا ساماں ہے

کبھی جو دل نویدِ وصل سے مسرور رہتا تھا
وہ اب تقدیر سے پامالِ کلفت ہائے ہجراں ہے

کبھی جو دل زمانے کے ستم بے خوف سہتا تھا
وہ اب انجامِ اُلفت کے تصور سے ہراساں ہے

کبھی جس دل کو دنیا بھر کا اطمینان حاصل تھا
وہ اب تیری عنایت ہائے بے حد سے پریشاں ہے

کبھی جو دل تری چشم کرم کا تجھ سے سائل تھا
وہ اب تیری توجّہ ہائے پیہم سے پشیماں ہے
اگر کہیئے تو کس سے داستانِ دردِ دل کہیئے
ہماری کون سنتا ہے، ہمارا کون پرساں ہے
سمجھ لیجیے کہ لب تک شکوۂ بیداد آپہنچا
نہ یارائے تحمّل ہے، نہ تابِ ضبطِ پنہاں ہے
کبھی فکرِ جفا کرنی، کبھی غفلت روا رکھنی
یہ کیا چشمِ عنایت ہے، یہ کیا لطفِ فراواں ہے
سرِ تسلیم خم ہے، جو مناسب ہو وہ جائز رکھ
ستم بھی تجھ کو پھبتا ہے، کرم بھی تیرے شایاں ہے
ہجومِ شوق پر بے چارگی کے ظلم سہتا ہوں
نہ ضبطِ راز ممکن ہے، نہ عرضِ حال آساں ہے
وہ حالت ہے کہ راحت ہو، مصیبت ہو، برابر ہے
وہ وحشت ہے کہ صحنِ باغ ہو جنگل ہو یکساں ہے
ہمیں جب دیکھو، انجامِ رہائی سوچ کر رونا
نہ کچھ رنجِ اسیری ہے، نہ کچھ تکلیفِ زنداں ہے
خدا جانے، قفس کی سختیاں کب راس آئیں گی

وہی یادِ نشیمن ہے، وہی خبطِ گلستاں ہے
تباہی سے نجاتِ اہلِ کشتی ہو تو کیوں کر ہو
وہی زورِ تلاطم ہے، وہی طغیانِ طوفاں ہے
الٰہی! ناخدا کو رحم کی ہمت عطا فرما
مرے بیڑے کے بیڑے کو ڈبو دینے میں کوشاں ہے
ہنوز آزاد کی حالت بہ شرحِ صدر پاتا ہوں
وہی افکارِ دنیا ہیں، وہی حالِ پریشاں ہے

اوائلِ مئی سنہ ۱۹۰۶ء۔ کانپور۔ بر طرحِ مشاعرہ منعقدہ مکان
لالہ بیتی لال[۱] صاحب رئیس کانپور

انتہائے یاس و حسرت ہو گئی	زندگی سامانِ کلفت ہو گئی
اب فریبِ مہربانی رائگاں	زندگی بھر کو نصیحت ہو گئی
اب امیدِ چشمِ الفت بے محل	نامرادی وجہِ عبرت ہو گئی
یاس! کل تک جس سے ہم واقف نہ تھے	آج امیدوں کی غایت ہو گئی
بیکسی، جس سے کبھی بیگانہ تھے	اب شریکِ رنج و راحت ہو گئی
وہ دلی تسکیں کہ وجہِ ناز تھی	پائمالِ رنج و کلفت ہو گئی
وہ امیدِ وصل، جو دمساز تھی	خوبیِ قسمت سے حسرت ہو گئی

[۱] دیکھو صفحہ (۱۲) حاشیہ (۱)

قصۂ ناکامیابی کیا کہوں — آہ! ہر کوشش اکارت ہو گئی
اب غمِ فرقت نہ ارمانِ وصال — آس کیا ٹوٹی کہ فرصت ہو گئی
اک دلِ ہمدرد کیا غارت ہوا — ہر متاعِ ناز غارت ہو گئی
اب کسی منظر سے دلچسپی نہیں — آہ! دنیا بھر سے وحشت ہو گئی
آج تک ارمان باقی ہیں تو ہوں — شادمانی مل کے رخصت ہو گئی
عرضِ حالت کر کے خود حیران ہوں — کیا کہوں کیونکر یہ جرأت ہو گئی
کیا کریں، اہلِ نیاز اب کیا کریں — بے نیازی اُس کی عادت ہو گئی
آپ کو ہم سے عداوت ہی سہی — کچھ سہی، اک گونہ نسبت ہو گئی
کیا بتا سکتا ہوں، کچھ دیکھا بھی ہو — پردہ اٹھنا تھا کہ حیرت ہو گئی
اے زہے! ارمانِ بے پایانِ دوست — دل میں دنیا بھر کی وسعت ہو گئی
اے کمالِ عشقِ صادق! مرحبا — میری، اُن کی ایک حالت ہو گئی
کچھ تو اے آزاد! حالِ دل بتا — کچھ تو کہہ، آخر یہ کیا گت ہو گئی؟

وسطِ جولائی ۱۹۰۶ء۔ کانپور۔ طرحِ مرغوب

کہنے کو رسمِ ملاقات ہے، یہ بھی نہ سہی — نام کو چشمِ عنایات ہے، یہ بھی سہی

---

[۱] ایک ہی حرف کی تکرار یا ہم مخرج حروف کا اجتماع ایک حد تک مخلِ فصاحت سمجھا جاتا ہے۔ مگر میں اتنی سی خرابی کے لیے کسی اچھے شعر کا خون کرنے کو تیار نہیں۔ آزاد انصاری

[۲] عربی میں "عنایت" کی جمع "عنایات" نہیں آتی اس لیے یہ قاعدۂ عربی غلط ہے۔ مگر بعض اہلِ فارس نے اس کا استعمال کیا ہے اس لیے میں بھی ضرورتاً جائز سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری

کیا غرض؟ قصۂ دردِ دلِ ناشاد کہوں — جب یہ تمہیدِ شکایات ہے، یہ بھی نہ سہی

کیا ضرورت؟ گلۂ قسمتِ برباد کروں — جب یہ برعکس ہدایات ہے، یہ بھی نہ سہی

جب ہمیں بزم میں آنے کی اجازت نہ رہی — پھر یہ کیوں پرسشِ حالات ہے، یہ بھی نہ سہی

لیجئے، جان بھی قربان کئے دیتا ہوں — جب یہی فکر، یہی گھات ہے، یہ بھی نہ سہی

بس فریبِ نگہِ لطف کی تکلیف نہ کر — بس تری چشمِ عنایات[1] ہے، یہ بھی نہ سہی

اواخرِ دسمبر ۱۹۰۷ء۔ سہارنپور۔ طرحِ مشاعرہ منعقدہ ریاست مالیر کوٹلہ حسب فرمائش شفیقی منشی ظفر علی صاحب۔ پرائیوٹ سکرٹری نواب مالیر کوٹلہ

خبطِ جفا تمھیں تو جنونِ وفا مجھے — میرا گلا تمھیں نہ تمہارا گلا مجھے

اب میں بھی متفق ہوں کہ تیری خطا نہیں — اب میں بھی معترف ہوں کہ دھوکا ہوا مجھے

میں تو ترے خیال کو سو بار چھوڑ دوں — لیکن ترا خیال نہیں چھوڑتا مجھے

حالانکہ کچھ عداوتِ باہم دگر نہ تھی[2] — تاہم ترا خیال ستایا کیا مجھے

کچھ انتہائے لطف کا مطلب نہ کھل سکا — اُف! اے نگاہِ دوست بُرا کر دیا مجھے

آہ آہ! اُٹھ تو باعثِ وحشت بیان کر — کمبخت! کچھ تو حالِ حقیقت بتا مجھے

---

[1] دیکھو صفحہ (۱۳۴) حاشیہ (۲)

[2] دیکھو صفحہ (۱۳۴) حاشیہ (۱)

اواخرِ جون ۱۹۰۸ء - کانپور - برطرحِ مشاعرۂ منعقدۂ مکانِ لالہ عبدالحق[1] صاحب عروج کانپوری

حدِ ضبطِ شوق کی نہ غمِ انتظار کی
آخر خطا؟ زبانِ شکایت گزار کی

کیا ماجرائے ترکِ تمنّا سنائیے
مجبور ہو کے عادتِ صبرِ اختیار کی

تم اور فریبِ وعدۂ تشریف آوری
ہم اور مصیبتیں اَلَمِ انتظار کی

تم اور کمالِ کوششِ اَلطاف گستری
ہم اور نوازشیں ستمِ بے شمار کی

دعوائے پاسِ مہر و محبت سے درگزر
قول اعتبار کا نہ قسم اعتبار کی

اجرائے حکمِ ضبطِ شکایت سے درگزر
دل اختیار کا نہ زباں اختیار کی

اب ہجر میں سکوں ہے، اب وصل میں قرار
اللہ! اخیر۔ خاطرِ وحشت شعار کی

اب طاقتِ شکیب نہ یارائے انتظار
اللہ! شرم۔ غایتِ صبر و قرار کی

ممنونِ بیخودی ہوں، خوشا! فرصتِ تمام
آغاز کی خبر ہے نہ انجام کار کی

اچھا ہے، طولِ ہائے اَمَل مختصر نہ ہوں
بہتر ہے، جو خوشی مرے پروردگار کی

اب ہم ہیں اور ساعتِ غرقابیٔ جہاز
اب فکر وار کی ہے نہ تشویش پار کی

آزادؔ اور شکوۂ احبابِ کانپور[2]
سب جھوٹ، کیا مجال غریب الدیار کی؟

---

[1] دیکھو صفحہ (۱۹) حاشیہ (۱)
[2] بعض احبابِ کانپور کی رنجشِ بیجا کی طرف اشارہ ہے - آزادؔ انصاری۔

اوائلِ اگست ۱۹۰۸ء ۔ کانپور ۔ بر طرحِ مشاعرۂ منعقدۂ مکان لالہ تپن لال صاحب[1]
رئیس کان پور

اے زہے! جدتِ اندازِ محبت تیری
بارک اللہ! خدا داد طبیعت تیری

رخصتِ تاب و تحمل ہے کہ رخصت تیری
ساعتِ موت ہے یا ساعتِ فرقت تیری

جس کو دیکھا، ترے برتاو کا شاکی دیکھا
ایک دنیا ہے کہ ممنونِ عنایت تیری

آہ! کیا قصۂ کوتاہیٔ قسمت کہیے
کہ تری چشمِ کرم راس نہ غفلت تیری

آہ! کب تک غمِ ناکامیٔ الفت سہیے
کہ ترا وصل سزاوار نہ فرقت تیری

یہ بھی واقف ہوں کہ اب پاسِ وفا لا حاصل
یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ تو نہ وہ عادت تیری

میں ہوں اور سب سے الگ میرے مقدر کے سلوک
تو ہے اور سب سے جدا طرزِ محبت تیری

اک طرف خوگرِ آزار مرا شوقِ نہاں
اک طرف دشمنِ جاں چشمِ عنایت تیری

کاش! وہ دن ہو کہ تشویشِ وفا سے چھوٹوں
کاش! ایسا ہو کہ راس آئے عداوت تیری

مشکل ہے کہ دل پر نہ زباں پر قابو
سخت نادم ہوں کہ میں اور شکایت تیری

اے غمِ دوست! کوئی تا بہ کجا صبر کرے
کوئی حد، کوئی نہایت، کوئی غایت تیری!

کیا قیامت ہے، یہاں تک نظر انداز نہ کر
بد نصیبانِ ازل اور یہ غفلت تیری؟

از رہِ ذرہ نوازی نظرِ ثانی کر
خاکسارانِ جہاں اور یہ کدورت تیری؟

دل ہوا جانِ تپاں، داغ ہوا زخمِ نہاں
میری جس چیز کو دیکھو وہ امانت تیری

کب تک آزادؔ! یہ خاموشیٔ بے جا کب تک
حد سے گزری ہوئی پاتا ہوں متانت تیری

---

[1] دیکھو صفحہ (۱۲) حاشیہ (۱)

اواخرِ فروری سنہ ۱۹۰۹ء۔ کانپور۔ طرحِ مشاعرہ منعقدہ مکان
حکیم فخر الدین صاحب فاخر

بے نیازی تک ادائے ناز ہے — جو ستم ہے، داخلِ انداز ہے
آفتوں کی انتہا بھی ہو چکی — اور ابھی تک شوق کا آغاز ہے
مہر ہے اور سودائے عرضِ حالِ دل — دل ہے اور تشویشِ ضبطِ راز ہے
اے زہے! اس شخص کا بختِ رسا — جو ترے ارمان سے ممتاز ہے
ہوشیار، اے شوقِ غافل! ہوشیار — چشمِ الفت جور کا پرداز ہے
کھو دیا، دونوں جہاں سے کھو دیا — شکوۂ لطفِ ستم پرداز ہے
جس کو جانچو، مثلِ قسمت برخلاف — جس کو پوچھو، ہم صدائے ساز ہے
حضرتِ آزاد! آپ اور اتقا؟ — کاش! ظاہر ہو کہ یہ کیا راز ہے

وسط مئی سنہ ۱۹۰۹ء کانپور طرح مشاعرہ[1]
منعقدہ اناؤ۔ منجانب اہالی اناؤ۔

تو اور پاس خاطرِ اہلِ وفا کرے — امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے
تاکیدِ صبر [illegible] آپ بے صبر ہو — تعمیلِ حکم فرض، مگر کوئی کیا کرے
اے کاش! اضطرابِ محبت بنا رہے — اے کاش! دردِ حقِ رفاقت ادا کرے

---

[1] اس محفلِ مشاعرے کے بانی اور منتظم کا نام بالکل یاد نہیں رہا یہی وجہ ہے کہ میں یہاں درج نہیں کر سکا۔ آزاد انصاری

تکرارِ لن ترانی بہم روا نہ رکھ — ایسا نہ ہو کہ شوقِ تماشا گلا کرے

کیا فائدہ کہ شکوۂ جور و جفا کروں — کیا جانتا نہیں ہوں کہ تو اور وفا کرے؟

شاید تمھیں ہنوز یہ الفاظ یاد ہوں — "تجھ سے دغا کرے تو خدا سے دغا کرے"

میں اور انحراف؟ مگر بد نصیب دل — میرا کہا کرے نہ تمھارا کہا کرے

ہاں ہاں درست، حسرتِ اظہارِ غم درست — لیکن خدا کرے کہ وہ خوفِ خدا کرے

چل، دل سے اے شکایتِ بیدادِ دوست چل — کب تک کوئی کسی کی مروّت کیا کرے

اب میں ہوں اور کوششِ ترکِ تعلقات — شاید یہی علاج کوئی فائدا کرے

درویش کی پرکھ ہے تو درویش کی سنو — درویش کی صدا ہے کہ "داتا بھلا کرے"

آزاد اجرِ خوفِ جزا امرِ حق سہی — لیکن تری بلا غمِ روزِ جزا کرے

وسطِ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء چھاؤنی انبالہ۔ برطرحِ مشاعرۂ منجانب

یاور صاحب انبالوی

آہ! جیتے ہیں تو کیا جیتے ہیں مرنے والے — لاکھ ناسور ہیں اور سارے نہ بھرنے والے

جور کر کے گلۂ جور سے ناراض نہ ہو — منصفی شرط ہے، او جور سے گزرنے والے!

وائے اندھیر! کہ بے وجہ کدورت رکھیں — آئینہ سامنے رکھ رکھ کے نکھرنے والے

دل میں کچھ شائبۂ خوفِ خدا ہے کہ نہیں — او مرے نام [illegible] سے ڈرنے والے

تیری تقدیر میں لکھا ہے پشیماں ہونا — یاد رکھ یاد رکھ [illegible] نہ کرنے والے

شاید ایسا ہو کہ ہم سے بھی شناسائی ہو
اِس طرف دیکھ، برابر سے گزرنے والے!

آپ ازراہِ کرم قصدِ عیادت تو کریں
آج جی اُٹھنے کو تیار ہیں مرنے والے

اب نہ پرواز کی طاقت، نہ رہائی کی ہوس
رحم کر رحم، پر و بال کترنے والے

کبھی آزادؔ! ہماری بھی کوئی سن لے گا
سیکڑوں ہیں ابھی اللہ سے ڈرنے والے

اَواخرِ اگست ۱۹۱۲ء۔ انبالہ چھاؤنی۔ بر طرحِ مشاعرہ منعقدہ مکان
چودھری حسنا صاحب[۵] واقع انبالہ چھاؤنی

نہ محبت، نہ محبت کے مراسم کا لحاظ
تم کو بے شک روشِ اہلِ وفا آتی ہے

صبر مشکل سہی، امکان سے خارج تو نہیں
ہم کو خود دردِ محبت کی دوا آتی ہے

آج محفل کا وہ عالم ہے کہ محفل بھر سے
"بَارَکَ اللّٰہُ لِسَاقِیْ" کی صدا آتی ہے

لیجیے، حضرتِ ناصح کی وہ تشریف آئی
اور اِس انداز سے گویا کہ بلا آتی ہے

خدمتِ غیر مناسب ہے بھی کچھ عار نہیں
ہم کو تالیفِ قلوبِ رفقا آتی ہے

اُن کو زندان علائق سے رہائی کی نوید
جن کو پابندیٔ تسلیم و رضا آتی ہے

گو کہ اب قافلے والوں کا تجسس بے سود
لیکن اک سمت سے آوازِ درا آتی ہے

غیر ممکن ہے کہ اِس بزم میں آزادؔ نہ ہو
کہ ہمیں بوئے نفوسِ فقرا آتی ہے

---

[۵] چودھری حسنا صاحب رئیس و ساکن انبالہ چھاؤنی صاحبِ ذوق و سخن فہم افراد میں سے ہیں۔ اُس زمانہ میں کافی عرصہ تک بزمِ سخن آپ کے ہاں منعقد ہوتی رہی جس کی یادگار یہ غزل ہے۔

آزاد انصاری

وسط اگست ۱۹۱۶ء۔ انبالہ چھاونی۔ طرح مرغوب

کیا خبر تھی، پردہ ہائے لطف میں | جور کی بنیاد ڈالی جائے گی
کون واقف تھا؟ کہ شکلِ آرزو | درد کے قالب میں ڈھالی جائے گی
اب دلِ ناکام ہے اور فرطِ یاس | اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی
حسرتِ اظہارِ غم برحق، مگر | بات بھی منھ سے نکالی جائے گی؟
التماسِ شوق سے کیا فائدہ | جانتا ہوں بات خالی جائے گی
شکوۂ غم پر کہا تو یہ کہا | "لذّتِ غم بھی اٹھالی جائے گی"
نازِ خودداری غلط ثابت ہوا | عادتِ تسلیم ڈالی جائے گی
گاہ ہے ماہے پر ملامت رائیگاں | ورنہ پھر دن رات ڈھالی جائے گی
نالۂ آزاد ہے یا مضحکہ | آہِ درویش اور خالی جائے گی؟

اواخر جون ۱۹۱۷ء۔ دہلی۔ طرحِ طبع زاد

مسلسل

* بے خبر! وجہِ بنائے دوسرا بھی عشق ہے[1] | کارِ انساں ہی نہیں۔ کارِ خدا بھی عشق ہے
سمِ قاتل بھی ہے، تریاقِ شفا بھی عشق ہے | موت بھی ہے موت کے دکھ کی دوا بھی عشق ہے
رہروو! راہِ محبت میں نڈر آگے بڑھو | صرف رہزن ہی نہیں ہے، رہنما بھی عشق ہے

---

[1] میں لفظ "دو" باشباع کو فارسی ترکیب میں بھی جائز و فصیح سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری

* یہ غزل "حدیثِ عشق" کی سرخی سے رسالہ زمانہ کانپور میں شایع ہو چکی ہے۔

مشکلاتِ عشق سے گھبرا نہ جانا چاہیئے — مشکلاتِ عشق کا مشکل کشا بھی عشق ہے

اہلِ ظاہر کی شریعت ناروا سمجھا کرے — اہلِ باطن کے عقیدے سے روا بھی عشق ہے

شیخ صاحب! عشق کارِ اہلِ عصیاں ہی نہیں — پیر و مرشد! مسلکِ اہلِ صفا بھی عشق ہے

زندگی میں ترکِ شغلِ عشق کیونکر کیجیے — زندگی بھی، زندگی کا مدعا بھی عشق ہے

آؤ اب آزادؔ! آسن مار بیٹھیں اور جپیں — آتما بھی عشق ہے، پرماتما بھی عشق ہے

اوائلِ ستمبر ۱۹۱۹ء۔ علی گڈھ۔ بر طرحِ مشاعرہ منعقدہ بمکان میرزا احمد علی صاحب[1]
رئیس علی گڈھ

طلبِ عاشقِ صادق میں اثر ہوتا ہے — گو ذرا دیر میں ہوتا ہے، مگر ہوتا ہے

خون روتا ہوں، مگر کس کو ترس آتا ہے — جان کھوتا ہوں، مگر کون خبر ہوتا ہے

دار و منصور کے قصے سے سبق حاصل کر — بے خبر! طبقۂ عشاق نڈر ہوتا ہے

مجھ سے پوچھو کہ محبت میں رفیقِ رہِ دوست — کون ہوتا ہے؟ فقط شوقِ سفر ہوتا ہے

فیض اٹھانا ہے تو چل خدمتِ آزاد میں چل — کہ فقیروں کی توجہ میں اثر ہوتا ہے

---

[1] میرزا احمد علی صاحب رئیس علی گڈھ (عمر ۲۰ سال) کی ہستی علی گڈھ میں نہایت وسیع الاخلاق اور علم دوست ہستی ہے۔ آپ خود تو شاعر نہیں مگر [illegible] کے بہترین دلدادہ واقع ہوئے ہیں۔ آپ کو بزمِ مشاعرہ ترتیب دینے اور اس کو کامیاب بنانے میں ضرورت سے زیادہ معلومات و سلیقہ حاصل ہے۔ آزاد انصاری۔

وسطِ دسمبر ۱۹۱۹ء - علی گڈھ - بر طرحِ مشاعرہ منعقدہ لائبریری ہال - علی گڈھ

اِدھر ریشہ دوانی ہے - اُدھر ریشہ دوانی ہے
جدھر دیکھو وہ کافر گرمِ شغلِ دلستانی ہے

زمانے کا زمانہ پائمالِ ظلم رانی ہے
یہی صاحبقرانی ہے تو کیا صاحبقرانی ہے

ازل سے ربطِ حسن و عشق ملے ورجاودانی ہے
نہ تیرا حُسن حادث ہے، نہ میرا عشق فانی ہے

ہماری حسرتِ دیدار ہے اور بے زبانی ہے
تمھارا جلوۂ طرّارہے اور لن ترانی ہے

نہ اب کوئی گلا باقی، نہ اِتنا حوصلہ باقی
فقط اِتنی گزارش تھی کہ ناحق سرگرانی ہے

ترا بارِ گرانِ مہربانی کس سے اُٹھ سکتا
ترا نامہرباں ہونا کمالِ مہربانی ہے

"خدا بخشے" کسی جانبازِ اُلفت کا مقولہ تھا
کہ قبل از مرگ مرجانا حیاتِ جاودانی ہے

ضرورت ہے کہ میرا قصّۂ غم ہر زباں پر ہو
نصیحت کی نصیحت ہے - کہانی کی کہانی ہے

خدا وہاں بھی مری اُمّیدِ مرحومہ کو خوش رکھے
مرا سینہ ہے اور داغِ فراقِ انجہانی ہے

اِدھر بھی حلقۂ ماتم - اُدھر بھی حلقۂ ماتم
تمنّائیں ہیں اور مرحوم دل کی نوحہ خوانی ہے

خدا معلوم، انجامِ اسیرانِ قفس کیا ہو
تڑپتے ہیں، سسکتے ہیں، نہ دانہ ہے، نہ پانی ہے

ترا آزاد ممکن تھا کہ تجھ سے مل کے خوش ہوتا
مگر قسمت سے محبوسِ طلسمِ زندگانی ہے

وسطِ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء - علی گڈھ - طرحِ مشاعرہ بزمِ ادب - منعقدہ لائبریری ہال
علی گڈھ

ممنون ہوں کہ چشمِ عنایت نہیں رہی
احسان ہے کہ فکرِ عداوت نہیں رہی

آپ در گزر کہ جبر کی غایت نہیں رہی
اب رحم کر کہ صبر کی طاقت نہیں رہی

میں اور وہ اضطراب کہ اللہ کی پناہ
تو اور وہ اجتناب کہ غایت نہیں رہی

اب حالِ دل نہ پوچھ کہ تابِ بیاں کہاں
اب مہرباں نہ ہو کہ ضرورت نہیں رہی

اب وہ تعلقات نہ اب وہ توجہات
وہ تو نہیں رہا کہ وہ عادت نہیں رہی؟

وہ دن نہ اب وہ رات، وہ اُلفت نہ اب وہ بات
وہ میں نہیں رہا کہ وہ قسمت نہیں رہی؟

غفلت نہ دو ابھی، مگر اتنا خیال رکھ
وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی

پھر ابتدائے جور کی ساعت قریب ہے
کچھ انتہائے لطف و عنایت نہیں رہی

اک پائمالِ جور سے اُمیدِ شکرِ جور؟
جا، شکر کر کہ تابِ شکایت نہیں رہی

میں بدنصیب تیری نگاہوں سے کیا گرا
میری نظر میں بھی مری عزت نہیں رہی

دل اور ترے خیال سے راحت نہ پا سکے؟
شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی

اظہارِ اضطراب ہماری خطا سہی
تسکینِ قلب کس کی بدولت نہیں رہی؟

آزاد! کیا ارادۂ چون و چرا کروں
امرِ خلافِ حکم کی جرأت نہیں رہی

اواخر مارچ سنہ ۱۹۳۲ء۔ علی گڈھ۔ بر طرحِ مشاعرۂ غازی آباد۔ منجانب حضرت بزم اکبرآبادی[۱]
زیرِ صدارت سید وحید الدین صاحب بیخود۔ دہلوی[۲]

ادھر برقِ تپاں رکھ دی، اُدھر برقِ تپاں رکھ دی
محبت نے مری ہستی غضب کے درمیاں رکھ دی

---

[۱] مکرمی حضرت بزم اکبرآبادی عمر (۷۲) سال نہایت کہنہ مشق شاعر اور صاحبِ فن بزرگ ہیں آپ حضرت میر شکوہ آبادی کی یادگار ہیں آپکا کلام نہایت دلچسپ برنگ قدیم ہوتا ہے۔ اہلِ فن میں آپ کا دم غنیمت ہے۔ آزاد

[۲] دیکھو صفحہ (۱) حاشیہ (۱۱۶)

دو عالم ایسے یکتا ماہر تخلیق کے صدقے | بنائے عشق کیا رکھدی، بنائے صد جہاں رکھدی

تری نسبت نے تکمیل مراد زندگی کر دی | تری الفت نے بنیاد حیات جاوداں رکھدی

مرے دل میں ہوائے شوق کیا بھر دی، تڑپ بھر دی | مرے سینے میں دل کیا رکھدیا، برق تپاں رکھدی

تری فرقت کے صدمے جھیلنا اور خوش نظر آنا | ترے قربان! تاثیر خوشی غم میں نہاں رکھدی

خوشا! آزاد کا غم اور خوشا! انداز غمخواری | کہ جنس غم خریدی اور پیش دوستاں رکھدی

اوائل ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء علی گڑھ۔ بر طرح مشاعرہ منعقدہ میرٹھ۔ منجانب حضرت

ندرت[۱] میرٹھی

نہ چھوڑا کوئی در میں نے، نہ چھوڑا کوئی گھر میں نے | کسی کی جستجو میں چھان مارے بحر و بر میں نے

چلو، میں نے پھرایا تم کو رسوا در بدر میں نے | چلو، میں نے سنایا تم کو "قصہ مختصر" میں نے

کسی کی آرزو کر کے بڑھا لی زیست کی کلفت | کسی کی آن پر مر کے بنا لی جان پر میں نے

یہ کس نے مجھ کو الفت میں پھنسایا، خود مری مت نے | یہ کس نے دل کو روز بد دکھایا، سر بسر میں نے

مری ہمت، دکھایا مجھ کو آنکھوں نے ترا جلوہ | مری شامت بنایا تجھ کو منظور نظر میں نے

کسی کو یوں ترا مفتوں نہیں پایا، مگر دل کو | کسی نے یوں ترا دھوکا نہیں کھایا، مگر میں نے

کسی کی کیا خطا؟ اظہار حرف آرزو کر کے | بگاڑی آرزو کی بات میں نے خاص کر میں نے

۱؎ مولوی محمد شعیب صاحب ندرت میرٹھی خلف رشید مولانا احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی ملک کے نہایت خوش فکر اور نغز گو شعرا میں داخل ہیں۔ آپ کا رنگ تغزل بہت پسندیدہ و دلچسپ ہوتا ہے جس نے بہت جلد آپ کو شعرائے اردو کی صف اول میں جگہ دیدی ہے۔ آزاد انصاری۔

توجہ کر، توجہ کر کہ اَتمیسارِ توجہ پر ۔۔۔ گنوا رکھا ہے زریں نے، لُٹا رکھا ہے گھر میں نے

جو با چشمِ یقین دیکھا تو دل میں جا گزیں دیکھا ۔۔۔ تمھیں ڈھونڈا کدھر میں نے، تمھیں پایا کدھر میں نے

بہت تجھ کو ھمر کر دیکھا، بہت کچھ جبر کر دیکھا ۔۔۔ نہ دیکھا پر نہ دیکھا تجھ سے اِمکانِ مفر میں نے

اِسے بھی خوش نظر آیا، اُسے بھی خوش نظر آیا ۔۔۔ ترے غم میں بہ حالِ شادماں کر دی بسر میں نے

اب اے آزاد! دردِ دل بلا سے لب تک آ جائے ۔۔۔ کیا ضبطِ دروں تا حدِ امکانِ بشر میں نے

آخر دسمبر ۱۹۲۰ء ۔ علی گڈھ ۔ طرح مرغوب

کرے، کسی کی محبت مجھے شکار کرے ۔۔۔ کرے، ہلاک ستم ہائے بے شمار کرے

قریب ہے، کسی کافر ادا کی مست نگاہ ۔۔۔ مقربانِ خدا تک کو میگسار کرے

قرارِ تام کی ساعت قریب آ پہنچی ۔۔۔ کسی کی یاد ذرا اور بے قرار کرے

ستم شعار! ستا، لیکن اس قدر نہ ستا ۔۔۔ کہ شکر شکلِ شکایات اختیار کرے

خدا کے واسطے آ اور اس سے پہلے آ ۔۔۔ کہ یاس چارۂ تکلیف انتظار کرے

ہوا خلاف، تلاطم شدید، ساحل دور ۔۔۔ خدا ہی ڈوبنے والے کی ناؤ پار کرے

وسطِ فروری ۱۹۲۱ء ۔ علی گڈھ ۔ بر طرحِ مشاعرۂ بزمِ ادب علی گڈھ ۔ منعقدہ لائبریری ہال ۔ علی گڈھ

محبت میں بقا میری، محبت میں فنا میری ۔۔۔ محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری

جفاؤں پر جفائیں کر کہ مجرم ہے وفا میری
سزاؤں پر سزائیں دے کہ ثابت ہے خطا میری

نہ اب ربطِ دوا باقی، نہ اب ضبطِ شفا باقی
ترا غم ہی دوا میری، ترا غم ہی شفا میری

گلہ ناحق۔ جو ناخوش ہو کوئی خوش ہو تو کیا خوش ہو
ادائے غم ادا میری، صدائے غم صدا میری

تری الفت مرا مذہب، تری عظمت مرا مشرب
شریعت بھی جدا میری، طریقت بھی جدا میری

رہینِ داد فرمایا، درست ارشاد فرمایا
نہ الفت ہی بجا میری، نہ کلفت ہی بجا میری

اسی بیم و رجا میں ہوں، اسی دُہری بلا میں ہوں
وہی تو اور جفا تیری، وہی میں اور وفا میری

خوشا وہ دن! کہ میرا درد تیرے دل میں پیدا ہو
خوشا وہ دن! کہ تیرے مونہہ سے نکلے التجا میری

ستم پرور! سماعت ہو تو صرف اتنی گزارش تھی
مجھے حکمِ سزا منظور، لیکن کچھ خطا میری؟

خوشی سے شکل ہائے مختلف میں جلوہ فرما ہو
تمھیں لاکھوں میں پہچانے نگاہِ آشنا میری

محبت کے ستم، دنیا کے غم، عقبیٰ کی تشویشیں
ہجومِ صد بلا ہے اور جانِ مبتلا میری

وہی آزاد! تم ہو اور وہی دنیائے آزادی
وہی میں اور وہی جانِ گرفتارِ بلا میری

اوائلِ مئی ۱۹۲۱ء۔ دہلی۔ طرحِ طبع زاد

شکوۂ غم بجا نہیں، نہ سہی
حکمِ چون و چرا نہیں، نہ سہی

انتہائے جفا نہیں، نہ سہی
رحم کھانا روا نہیں، نہ سہی

سیکڑوں خوبیوں کے مالک ہو
ایک صاحبِ وفا نہیں، نہ سہی

آپ نے درد سن لیا ہوتا
درد کی کچھ دوا نہیں، نہ سہی

دل ازل سے ترا شناسا ہے
آنکھ شکل آشنا نہیں، نہ سہی

میں بھی سرکار ہی کا بندہ ہوں
لائق اعتنا نہیں، نہ سہی

تو ہو اور تیری زلف ہائے رسا
میری قسمت رسا نہیں، نہ سہی

الفتِ معنوی بھی کیا کم ہے
پرسشِ برملا نہیں، نہ سہی

باطنی قرب اصلِ عزت ہے
ظاہری واسطا نہیں، نہ سہی

دولتِ دردِ دل تو حاصل ہے
دولتِ دوسرا[1] نہیں، نہ سہی

آپ کا تو پتا لگا ہی لیا
اب جو میرا پتا نہیں، نہ سہی

شکرِ غم پر ملال کا کیا کام
قدرِ نعمت بجا نہیں، نہ سہی

تم کہ دردِ جہاں کے درماں ہو
میرے دکھ کی دوا نہیں، نہ سہی

آپ حکمِ سزا سنا بھی دیں
قصدِ عفوِ خطا نہیں، نہ سہی

صبر کی تاب تو عطا فرما
جبر کی انتہا نہیں، نہ سہی

میں تو اظہارِ درد کرتا ہوں
کوئی دردآشنا نہیں، نہ سہی

ترکِ حاجت بھی ممکنات سے ہے
کوئی حاجت روا نہیں، نہ سہی

رند ہوں اور رندِ پاک نہاد
متقی۔ پارسا نہیں، نہ سہی

---

[1] میں لفظ "دو" بہ اشباع کو فارسی ترکیب میں بھی جائز و فصیح سمجھتا ہوں۔ کیونکہ لفظ "دو" بہ اشباع ہی درحقیقت صحیح ہے اور بلا اشباع مجبوراً نظم کیا جاتا ہے۔ آزاد انصاری۔

وسطِ جون ۱۹۲۱ء - دہلی - بر طرحِ مشاعرۂ بزمِ خسروی منعقدہ درویش خانہ

خواجہ حسن نظامی[1] صاحب واقع نظام الدین دہلی

مسلسل

پھر حسرتِ محبتِ جاناں نکالئے [2] | پھر دولت دفینۂ پنہاں نکالئے
پھر رغبتِ مشاغلِ دنیا گھٹائیے | پھر فرصتِ نگاہِ پُر ارماں نکالئے
پھر کاہشِ الیمِ طبیعت مٹائیے | پھر خواہشِ قدیمِ دل و جاں نکالئے
پھر کوئی پرسشِ دلِ بیمار کیجئے | پھر کوئی چارہ سوچئے، درماں نکالئے
پھر کچھ علاجِ شدتِ آزار کیجئے | پھر کچھ امیدِ زیست کا امکاں نکالئے
پھر حسرتیں بہا خونِ جگر کھل کے روئیے | پھر کچھ غبارِ دیدۂ گریاں نکالئے
پھر فرصتیں ہیں اٹھ کے پھر کھل کے روئیے | پھر کچھ بخارِ طبعِ پریشاں نکالئے
پھر کچھ نمی خونِ جگر و دل میں ڈھونڈیئے | پھر کچھ سبیلِ دعوتِ مژگاں نکالئے

[1] جناب مولانا خواجہ علی حسن صاحب المعروف بہ خواجہ حسن نظامی عمر تقریباً (۵۵) سال دہلی کے مشہور صاحب نسبت بزرگ ہیں جن کا سلسلۂ ارشاد و ہدایت کل ہندوستان کو محیط ہے۔ آپ شاعر تو نہیں مگر شعر کا بجد ذوق رکھتے ہیں۔ ہر سال ایک دو مشاعرہ اپنے درویش خانہ میں خاص اہتمام سے منعقد فرماتے ہیں اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں اور ان سے حظ اٹھاتے ہیں آپ گو شاعر نہیں مگر بے عدیل ناثر ہیں۔ ملک کے چوٹی کے ادیبوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ کثیر التعداد مذہبی، اصلاحی اور ادبی کتابوں کے مصنف ہیں اور نثر میں ایک خاص انداز بیان کے بانی۔ خاکسار کو ایک عرصے سے آپ کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔
آزاد انصاری

پھر کوئی حاصلِ غمِ دوراں نہیں رہا — پھر کوئی چارۂ غمِ دوراں نکالیے

پھر طبع کو منافعِ الفت سمجھائیے — پھر قلب سے وساوسِ شیطاں نکالیے

پھر سینہ چاہتا ہے "کوئی زخم کھائیے" — پھر زخم کہہ رہا ہے "نمکداں نکالیے"

پھر رخصتِ سکوں ہے، سکوں بھول جائیے — پھر آمدِ جنوں ہے، گریباں نکالیے

پھر ایک سر میں لاکھ جنوں بھر دکھائیے — پھر ایک گھر سے لاکھ بیاباں نکالیے

پھر جشنِ آمدِ غمِ دلبر منائیے — پھر آرزوئے خدمتِ مہماں نکالیے

پھر عرضِ حالِ زار کی تمہید اٹھائیے — پھر التماسِ شوق کا عنواں نکالیے

پھر تارہائے سازِ الم توڑ پھینکئے — پھر خارہائے حسرت و حرماں نکالیے

پھر خبط ہے کہ قیدِ غمِ دوست جھیلئے — پھر فکر ہے کہ حسرتِ زنداں نکالیے

پھر قصد ہے کہ ہر ستمِ دوست جھیلئے — پھر عزم ہے کہ حوصلۂ جاں نکالیے

پھر شوق ہے کہ نشۂ وحدت جمائیے — پھر ذوق ہے کہ بادۂ عرفاں نکالیے

پھر وقت ہے کہ بتکدۂ کفر ڈھائیے — پھر فرض ہے کہ خامیِ ایماں نکالیے

پھر ایک لے میں لاکھ ترانے اڑائیے — پھر ایک نے سے لاکھ نیستاں نکالیے

پھر ایک ایک جزو کو کُل کر دکھائیے — پھر ایک ایک گل سے گلستاں نکالیے

آزاد! بازپرسِ قیامت بجا، مگر
ارمان ہے کہ حسرتِ عصیاں نکالیے

---

[1] دیکھو صفحہ (۱۳۴) حاشیہ (۱)

اواخر نومبر ۱۹۲۱ء - دہلی - طرح طبع زاد

پرستش کے قابل ہو تحقیق ہے — تصور کے ہمراہ تصدیق ہے

ہمیں علم ہے اور یہ تحقیق ہے — فقط دردِ دل وجہ تخلیق ہے

بجا ہے، مرا نازِ قسمت بجا — کہ تیری تمنا کی توفیق ہے

وہ مجھ سے قریب اور میں اُس سے دور — مری جمع بھی رشکِ تفریق ہے

محبت کے اثنا میں ہر جور دوست — محبت کے وعدے کی توثیق ہے

تعجب ہے اُس کا کرم اور یہ دیر؟ — خدا جانے کیا وجہ تعویق ہے

عطائے دو عالم تو برحق، مگر — کچھ اس کے علاوہ بھی توفیق ہے

جو تو کافرِ عشقِ جاناں نہیں — بالاجماع کافر ہے، زندیق ہے

مرا ایک دم اور دو عالم کے غم — عجب کشمکش ہے عجب ضیق ہے

حقیقت میں آزاد! اُس کی جفا — ہماری وفا کی اَنا لیق ہے

اوائل مارچ ۱۹۲۲ء - دہلی - طرح طبع زاد -

اُمیدِ مہربانی، رائگاں معلوم ہوتی ہے — نگاہِ مہرباں، نامہرباں معلوم ہوتی ہے

دلِ افگار کی چپ بالکل فغاں معلوم ہوتی ہے — خموشی دردمندوں کی زباں معلوم ہوتی ہے

وہ مرگِ عشق جس کو اہلِ ظاہر موت کہتے ہیں — ہمیں شکلِ حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

کسی کے جلوۂ رنگیں کا عالم کیا گزارش ہو — بہارِ باغِ جنت گل فشاں معلوم ہوتی ہے

اب اُسکی آرزو راحت سے جینے دے یہ ناممکن
اب اُس کی جستجو دامن کشاں معلوم ہوتی ہے

مصیبت تیری دُھن میں مژدۂ آغاز راحت ہے
طبیعت تیرے غم میں شادماں معلوم ہوتی ہے

مری ہستی تری رفعت کا مظہر بن کے دم لے گی
مری ہستی ترا رازِ نہاں معلوم ہوتی ہے

تمھاری ذات اب تک عقدۂ صد راز پاتا ہوں
تمھاری بات اب تک چیستاں معلوم ہوتی ہے

تماشا ہے کہ پھر بزمِ تماشا سرد کر بیٹھا
تمنا ہے کہ پھر آتش بہ جاں معلوم ہوتی ہے

عطائے حق، عطائے نامکمل ہو نہیں سکتی
بلائے غم، بلائے جاوداں معلوم ہوتی ہے

خدا چاہے تو اب سعیٔ طلب انجام کو پہنچی
مری گم گشتگی تیرا نشاں معلوم ہوتی ہے

خیالِ ہر خوشی پر خوفِ غم سے کانپ اُٹھتا ہوں
امید سود میں شکلِ زیاں معلوم ہوتی ہے

نہ اب وہ رغبتِ دنیا، نہ اب وہ حسرتِ عقبیٰ
طبیعت بے نیازِ دو[۱] جہاں معلوم ہوتی ہے

اب امیدِ نجاتِ کارواں مشکل، بہت مشکل
تباہی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

ضرور آزاد! دل اُس بے نشاں کا گھر ہو گا
فضائے دل فضائے لامکاں معلوم ہوتی ہے

اوائل جون ۱۹۲۲ء۔ دہلی۔ برطرح مشاعرۂ بزمِ خسروی منعقدہ ۱۴ جون ۱۹۲۲ء
مطابق ۱۸ شوال ۱۳۴۰ھ بمقام درویش خانۂ حضرت خواجہ حسن[۲] نظامی

وہی اک جلوۂ یار ہے، کہیں نور ہے، کہیں نار ہے
وہی ایک اصلِ بہار ہے، وہی پھول ہے، وہی خار ہے

۱۔ میں لفظ "دو" باشباع کو فارسی ترکیب میں بھی جائز و فصیح سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری
۲۔ دیکھو صفحہ ۱۲۹ حاشیہ (۱)

وہی حالِ نخوتِ یار ہے، وہی خوئے غفلت کار ہے
وہی رنگ ہے، وہی ڈھنگ ہے، وہی ننگ ہے، وہی عار ہے

وہی تم کہ خواہشِ جان و دل، وہی دل کہ کاہشِ جاں گسل
وہی تم ہو اور وہی جیت ہے، وہی ہم ہیں اور وہی ہار ہے

وہی ساعتِ غم دوست ہے، وہی غایتِ غم دوست ہے
وہی حالتِ دلِ زار ہے کہ شکیب ہے نہ قرار ہے

وہی شورِ شیونِ غم فزا، وہی آہ و نالۂ جاں گزا
وہی زخمۂ غمِ یار ہے، وہی نغمہ ہے وہی تار ہے

وہی دل کہ دعویٔ دوستی، وہی دوست اور وہی دشمنی
وہی دشمنِ دلِ زار ہے، وہی دوست ہے وہی یار ہے

جو ذرا سی پی کے بہک اٹھے، جو اُبل پڑے، جو چھلک اٹھے
وہ ضرور لائقِ عار ہے، وہ ضرور قابلِ دار ہے

کبھی ساغرِ مئے غم بھی پی، کبھی خوش بھی ہو، کبھی خوش بھی جی
کہ حیات اس کا سرور ہے تو نجات اس کا خمار ہے

نہ وہ ربط و ضبطِ بہم رہے، نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے
نہ وہ شوق ہے، نہ وہ ذوق ہے، نہ وہ چاہ ہے نہ وہ پیار ہے

لہ۔ دیکھو صفحہ ۱۳۲ حاشیہ (۱)

ہمیں باغ جانے سے کیا غرض، ہمیں داغ کھائیے کیا غرض
نہ وہ یار لالہ عذار ہے، نہ وہ لطفِ سیرِ بہار ہے

مری جدّ و جہدِ رہِ طلب، ابھی خوار تر ہو تو کیا عجب
کہ تری نظر میں وقار ہے نہ مری نظر میں وقار ہے

نہ ہے عہدِ فرصتِ رنج و غم، نہ ہے دورِ بے غمیٔ اُمم
کہ وہ آس سے سروکار ہے نہ وہ یاس سے سروکار ہے

ہمیں حکمِ دل ہے کہ حق کہو، تمھیں اختیار ہے، چپ رہو
ہمیں پاسِ عزّتِ کار ہے، تمھیں خوفِ ذلت دار ہے

مرے اہلِ شعرہ دوستو! مجھے طعنِ عجزِ بیان نہ دو
جو تخلّص آ نہ سکے تو کیا یہ قصور شعرِ نگار ہے

اوائل نومبر سنہ ۱۹۲۲ء۔ دہلی۔ برطرح مشاعرہ آگرہ منعقدہ مکان منشی شکور احمد صاحب رعنا[ل] اکبرآبادی واقع نائی منڈی آگرہ
نگاہِ شرط ہے، اندھا بھی دیکھ سکتا ہے جمالِ دوست کھلا ہر طرف جھلکتا ہے

ل۔ منشی شکور احمد صاحب رعنا ساکن کٹرہ نیل آگرہ عہد حاضر کے۔ نوجوان اور نہایت خوش فکر شاعر ہیں۔ حضرت نجم آفندی اکبرآبادی سے تلمذ حاصل ہے۔ میرے نہایت عزیز دوست ہیں میرا جب کبھی آگرہ جانا ہوا ہے اکثر آپ ہی کو تکلیف مہمان نوازی برداشت کرنی پڑی ہے جس کا میں ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ آزاد انصاری۔

ترے فدا۔ کوئی تیرے بغیر مضطر ہے — ترے نثار۔ کوئی تیری راہ تکتا ہے
ترا وصال خدا جانے، کیا ستم ڈھائے — ترا خیال جب آتا ہے دل دھڑکتا ہے
پھر ایک بار فقط اک نگاہِ چارہ نواز — پھر ایک خارِ درونِ جگر کھٹکتا ہے
جو انتہائے جفا ہے تو کیا مقامِ خطر — جو ادعائے وفا ہے تو کیوں جھجکتا ہے
اسیرِ دام کی بےچارگی، خدا کی پناہ — رہِ مفر نہیں پاتا تو سر پٹکتا ہے
کسی کے شوقِ طلب! تجھ کو عمرِ خضر نصیب — جو رہ نما نہیں رکھتا، وہی بھٹکتا ہے
ہزار صرفِ ستم ہائے روزگار رہوں — ترا خیال نہ بھولا نہ بھول سکتا ہے

اواخر نومبر سنہ ۱۹۲۳ء۔ حیدرآباد دکن۔ بطرح مشاعرہ منعقدہ مکان جناب باغ صاحب علیگڈھی

خوشا وہ دن کہ فرصت تھی غمِ امیدِ باطل سے — خوشا وہ دن! کہ فارغ تھے مصیبت ہائے نازل سے
زمانہ اسکی یکتائی کا قائل کیوں نہ ہو دل سے — بدیہیات کا انکار ہو سکتا ہے مشکل سے
نہ اب امیدِ راحت اضطرابِ شوق کے ہاتھوں — نہ اب مشکل فراغت کاروبارِ حسرتِ دل سے
وہ اک مہرِ تجلی بار عالم کا خیال آنا — وہ اک عالم کا پٹ جانا تجلی ہائے نازل سے
یہ کہنا تھا کہ اُس کو جلوہ فرما کس طرح دیکھوں — صدا آئی کہ "آنکھیں بند کر کے دیدۂ دل سے"
بہت چاہا کہ ہم کچھ دین کی خدمت بھی کر جائیں — مگر فرصت نہ پائی شاہد و مے کے مشاغل سے
خوشا احوالِ قدح نوشانِ خوش قسمت۔ کہ پی پی کر — بہکتے ہیں گلی ترسے چہکتے ہیں عنادل سے
تمنا تھی کہ پھر آسودۂ دنیائے ساحل ہوں — مگر بد قسمتی لے جا کے ٹوٹا لائی ساحل سے
خلافِ راہ منزل گامزن ہونے سے کیا حاصل — بجائے قربِ منزل بُعد ہو جائیگا منزل سے

سلہ دیکھو صفحہ (۳۰) حاشیہ (۱)
سلہ دیکھو صفحہ (۱۴) حاشیہ (۱)

کہیں آزاد تاثیر نظر چھٹتی نہیں پیری   یقیناً تم کو نسبت ہے کسی درویش کامل سے

اواخر جنوری ۱۹۱۲ء۔ حیدرآباد دکن۔ برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان جناب سید کاظم علی صاحب[1] باغ علیگڈھی

یہ کیف بارشوں کے، یہ مستی سحاب کی   توفیق ہو تو نہر بہادوں شراب کی

وہ عشوہ کاریاں ترے حسن شباب کی   وہ تیر باریاں نگہِ بے حجاب کی

پھر جلوۂ جمال دکھا اور شاد کر   پھر داد دے مری نگہ انتخاب کی

یہ کیوں نہ مان لوں، مری قسمت خراب ہے   توجیہ کیا ضرور، ترے اجتناب کی

دنیا کی راحتوں کی طرف کیا نظر کروں   دنیا کی راحتیں ہیں نمایش سراب کی

آزاد کا دل اور اسیری کی آرزو   تقدیر۔ تیرے طرۂ پرپیچ وتاب کی

اوائل فروری ۱۹۱۲ء۔ حیدرآباد دکن۔ برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان حضرت عنان[2] کنتوری

قصدِ گلۂ احباب اقدام شقاوت ہے   یہ مذہبِ الفت میں الفت سے بغاوت ہے

وہ روح دو عالم جو تکوین کی علت ہے   واللہ محبت ہے، باللہ محبت ہے

ہیں اور گلہ؟ ناممکن، یہ حوصلہ ناممکن   تسلیم کا بندہ ہوں، تسلیم کی عادت ہے

اب رازِ درونِ جاں ہمراز سے کیا کہیے   اب لطفِ غمِ پنہاں ناقابلِ قسمت ہے

---

[1] دیکھو صفحہ (۳۰) حاشیہ (۱)   [2] دیکھو صفحہ (۳۲) حاشیہ (۱)

قربانِ طلب! جس نے یہ فلسفہ سمجھایا — بیگانۂ دردِ دل بیگانۂ راحت ہے
اے کاش! کوئی دانا یہ نکتہ سمجھ سکتا — تقریبِ غمِ الفت تقریبِ فراغت ہے
آزاد علائق کا پابند ہو، ناممکن — آزاد کی آزادی آزاد کی فطرت ہے

وسط جون ۱۹۲۴ء - حیدرآباد دکن - برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان نواب صاحب علیگڈھی[1]

وحدتِ مطلق جو گرمِ جلوہ آرائی ہوئی — کثرتِ عالم نثارِ شانِ یکتائی ہوئی
وہ تمنا فرطِ مایوسی کے ہاتھوں جاں بلب — وہ امید زندگی پر مُردنی چھائی ہوئی
ہائے وہ راحت کہ جب تک وہ الگ ہیں آ یا نہ تھا — ہائے وہ ساعت کہ جب تم سے شناسائی ہوئی
ابتدائے شوقِ بے صبر و سکوں کا کیا قصور — انتہائے یاس وجہ ناشکیبائی ہوئی
حیف۔ اے اظہارِ حرفِ شوق کے اقدامِ حیف — وہ نظر جھپی ہوئی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
بے ضرورت اہتمامِ پردہ کر کے کیا ملا — اور تیرا نام نکلا، اور رُسوائی ہوئی
اب کہاں وہ سوزِ الفت، اب کہاں وہ اُسکی آگ — ایک چنگاری سی ہے اور وہ بھی کجلائی ہوئی
مرحبا۔ اے ساقیٔ روزِ ازل! صد مرحبا — محفلیں چھلک چھلک اٹھیں وہ بادہ پیمائی ہوئی
اِک تمھیں آزاد! اپنے دل کی دل میں لیجیے — ورنہ اُس سرکار میں دنیا کی شنوائی ہوئی

وسط جون ۱۹۲۵ء - حیدرآباد دکن - برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان حضرت ضامن کنتوری[2]

ہر در مرے لئے درِ صد احترام ہے — ہر گھر مری نگاہ میں بیت الحرام ہے

---

[1] دیکھو صفحہ ۳۰ حاشیہ (۱)
[2] دیکھو صفحہ ۳۳ حاشیہ (۱)

پھر کچھ دنوں سے دل میں کسی کا قیام ہے
پھر کوئی مجھ سے آٹھ پہر ہم کلام ہے

اُٹھ او طریقِ عشقِ خواص اختیار کر
حسنِ مجاز قابلِ میلِ عوام ہے

وہ دن گئے کہ نشۂ الفت کھلا نہ تھا
اب ہم ہیں اور عالمِ کیفِ دوام ہے

گو اب وہ اتباعِ شریعت نہیں رہا
تاہم وہی ادب ہے، وہی احترام ہے

آزاد گو طبیعتاً آزاد ہے، مگر
اس پر بھی بندگانِ وفا کا غلام ہے

اوائل مارچ ۱۹۲۶ء۔ حیدرآباد دکن۔ طرح مشاعرہ منعقدہ مکان

سید کاظم علی صاحب باغ[1] علیگڈھی

مجرموں کو بخش دینا اُن کو شرمانا بھی ہے
غیر واجب رحم فرمانا ستم ڈھانا بھی ہے

آپ نے یہ کیا کہا؟ "تو نے ہمیں جانا بھی ہے"
بندہ پرور! میں نے جانا ہی نہیں مانا بھی ہے

آپ پر مرنے کی حسرت ہو تو کیا جائے عجب
آپ پر مرنے کا مطلب زندگی پانا بھی ہے

او ستمگر! آج تیرا ہر ستم برحق۔ مگر
یاد رکھ، اک دن تری قسمت میں پچھتانا بھی ہے

ہم کو اُس در پر جبیں سائی کا سودا کیوں نہ ہو
ہم کو اپنا اخترِ تقدیر چمکانا بھی ہے

مہرباں! مجھ پر یہ بے مہری کا بہتانِ عظیم
تم نے جانا بھی ہے، تم نے مجھ کو پہچانا بھی ہے

دونوں عالم کیوں نہ مجھ سے دشمنی کرنے لگیں
ایک تم نے مجھ کو اپنا دوست گردانا بھی ہے

وہ "خدا ناکردہ" ترکِ سرد مہری کیوں کرے
میرے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکانا بھی ہے

۱؎ - دیکھو صفحہ (۳۰) حاشیہ (۱)

محرمانِ راز سے اتنا حجاب اچھا نہیں
ایک دن بے پردہ اُن کے سامنے آنا بھی ہے

باعثِ تخلیق ہفت افلاک کیا ہے، کچھ نہ پوچھ
ایک مجھ کو پائمالِ جور فرمانا بھی ہے

شرح دردِ دل سے شرحِ درد ہی مطلب نہیں
خود تڑپنا بھی ہے دُنیا بھر کو تڑپانا بھی ہے

دوستو اب مقصدِ کوشش فقط کوشش نہیں
بلکہ اب کوشش کو تا انجام پہنچانا بھی ہے

آپ کو دل کیا دیا، آزادِ مطلق ہو گیا
آپ کا آزاد ناداں ہی نہیں دانا بھی ہے

اوائل نومبر ۱۹۲۶ء - حیدر آباد دکن - برطرح مشاعرہ انجمن تنظیم المسلمین - حیدر آباد دکن

معلوم نہیں کس کا جلوا نظر آتا ہے
پنہاں نظر آتا ہے پیدا نظر آتا ہے

ہر جلوۂ ناپیدا پیدا نظر آتا ہے
قربانِ نگاہِ دل! کیا کیا نظر آتا ہے

ہر سمت ترا حُسنِ یکتا نظر آتا ہے
عالم ترے جلووں کی دُنیا نظر آتا ہے

گو آنکھ نہیں لیکن اِتنا نظر آتا ہے
اک جلوہ ہے جو ہر سو بکھرا نظر آتا ہے

پھر ضبطِ غمِ پنہاں امکان سے خارج ہے
پھر رازِ نہانِ جاں افشا نظر آتا ہے

ممکن ہو تو اب دل کو کچھ دادِ محبت دے
دل دادِ محبت کا بھوکا نظر آتا ہے

کیا غم! جو مری حسرت بر آئی نہ بر آئے
خوش ہوں کہ ترا چاہا ہوتا نظر آتا ہے

اے دیدۂ باطن! اب تو ہی مجھے کچھ دکھلا
یہ دیدۂ ظاہر تو اندھا نظر آتا ہے

جس نے تجھے دیکھا ہو وہ دیکھے تو کیا دیکھے
جب تو نظر آجائے پھر کیا نظر آتا ہے

شاید کہ وہ جانِ جاں تجھ کو بھی نظر آجائے
یوں دل میں نظر دوڑا گویا نظر آتا ہے

باطن کی نہ کچھ پوچھو، باطن کی خدا جانے — ظاہر ہیں تو پردا ہی پردا نظر آتا ہے

اے اہلِ نظر! ہشیار! اے اہلِ بصر ہشیار — جو کچھ نظر آتا ہے، دھوکا نظر آتا ہے

پابندِ غمِ مذہب! پابندِ محبت بن — پابندیٔ مذہب میں جھگڑا نظر آتا ہے

انسان کی بدبختی اندازے سے باہر ہے — کمبخت خدا ہو کر بندا نظر آتا ہے

آزاد! تری آنکھیں، آنکھیں ہی نہیں۔ ورنہ — آنکھیں ہوں تو قطرہ بھی دریا نظر آتا ہے

اواخر نومبر ۱۹۲۶ء۔ حیدرآباد دکن۔ برطرح مشاعرہ۔ منعقدہ مکان مولوی

سید کاظم علی صاحب آغا علیگڈھی

ہر ذرہ پرستش کے قابل نظر آتا ہے — ہر قطرہ سمندر کا حامل نظر آتا ہے

اب وصل ہو یا فرقت دلشاد نظر آنا — اب حوصلۂ الفت کامل نظر آتا ہے

دل ایک زمانے سے مفتوں ہے مگر کس پر — جو ایک زمانے کا قاتل نظر آتا ہے

یہ راز نہیں کھلتا، میں تجھ سے جدا کیوں ہوں — جو قطرہ ہے دریا سے واصل نظر آتا ہے

اب دل میں ہے جی میں اس کو بادیدۂ دل دیکھوں — یوں اس کا نظر آنا مشکل نظر آتا ہے

بس اب کوئی ساعت میں لیلیٰ بھی نظر آئی — ناقہ نظر آتا ہے، محمل نظر آتا ہے

اجسامِ زمیں رنگیں، اجرامِ بریں رنگیں — عالم کسی گلرد کی محفل نظر آتا ہے

زاہد کو ریا مشرب کہتے بھی نہیں بنتی — ذاکر نظر آتا ہے شاغل نظر آتا ہے

آزاد کبھی پہلے آزاد ہو، ممکن ہے — اب تو ترے بندوں میں داخل نظر آتا ہے

سلہ۔ دیکھو صفحہ (۳۰) حاشیہ (۱)

اوائل جولائی ۱۹۲۷ء۔ حیدر آباد دکن۔ بر طرح مشاعرہ منعقدہ مکان

حضرت ضامن کنتوری حیدر آباد دکن

جب سے ترا محیطِ کرم روکش ہے
ہر رند تا بہ شیخ نڈر بادہ نوش ہے

پھر دل میں یاس و حسرت و حرماں کا جوش ہے
پھر دل کی آرزو ہے کہ گم کردہ ہوش ہے

اللہ رے! بہارِ رخِ گلفشانِ دوست
دامانِ ہر نظر سبدِ گل فروش ہے

بے خوف ہو کے جامِ غمِ عشق نوش کر
ناداں! یہ نیش نیش نہیں بلکہ نوش ہے

یہ جلوۂ جمال، یہ موسیقیٔ مقال
القصہ وقتِ فیصلۂ چشم و گوش ہے

حالِ تلاطمِ غمِ الفت نہ پوچھئے
اک بحر ہے کہ آٹھ پہر گرمِ جوش ہے

وہ دن گئے کہ معتکفِ خانقاہ تھے
اب ہم ہیں اور سنگِ درِ مے فروش ہے

آزاد اور فکرِ پس و پیش، سب غلط
آزاد فارغِ غمِ فردا و دوش ہے

اوائل اگست ۱۹۲۷ء۔ حیدر آباد دکن۔ طرح طبع زاد

محبت کارِ مردانِ خدا معلوم ہوتی ہے
یہ عزت عزتِ ہر دوسرا[1] معلوم ہوتی ہے

---

[1] ایک ہی حرف کی تکرار یا ہم مخرج حروف کا اجتماع کسی قدر مخل فصاحت سمجھا جاتا ہے مگر میں اس ذرا سی خرابی کے لئے کسی اچھے شعر کا خون کرنے کو تیار نہیں۔ آزاد انصاری

[2] دیکھو صفحہ ۱۴۸ حاشیہ ۱

خدا حافظ، دلِ بے صبر اُلفت کا خدا حافظ
تری الفت بہت صبر آزما معلوم ہوتی ہے

نظر تو کر کہ اُس کی آن کیا عالم دکھاتی ہے
خبر تو ہو کہ اُس کی شان کیا معلوم ہوتی ہے

مرے شوقِ سزا کا خوفناک آغاز تو دیکھو
کسی کا جرم ہو اپنی خطا معلوم ہوتی ہے

بس اب بے چارگی سے صلح کر لینی مناسب ہے
کہ اب بے چارگی اُس کی رضا معلوم ہوتی ہے

تمھاری بزم کو مامونِ دخلِ شرع پاتا ہوں
تمھارے ساتھ مے نوشی روا معلوم ہوتی ہے

کبھی عالم کی ہستی اصل پر مبنی سمجھتا ہوں
کبھی بالکل نمودِ سیمیا معلوم ہوتی ہے

ضرورت ہے کہ پھر کوئی بڑا انسان پیدا ہو
کہ پھر انسانیت بے دست و پا معلوم ہوتی ہے

بس آزاد! اب وجودِ این و آں کا خاتمہ سمجھو
طبیعت دشمنِ ہر ماسوا معلوم ہوتی ہے

١٢ر جنوری ١٩٢٩ء - حیدرآباد دکن - طرح طبعزاد

مسلسل

اے کاش! تم یکایک مجھ کو نہ بھول جاتے[1] — اے کاش! یہ اچانک مجھ پر ستم نہ ڈھاتے

اے کاش! دل کی آہیں یوں بے اثر نہ رہتیں — اے کاش! شب کے نالے یوں رائگاں نہ جاتے

سابق کرم کا صدقہ، اتنا تو سوچیے گا — اتنا نہیں ستاتے، اتنا نہیں جلاتے

لاعلم جرم رکھ کر تعزیر کب روا ہے — مانا مری خطا تھی۔ لیکن مجھے جتاتے

قبل از ثبوتِ کافی حکمِ سزا نہ دیتے — تحقیقِ جرم کر کے کچھ فیصلہ سناتے

الزام کو سمجھ کر انصاف کو پہنچتے — انصاف کو پہنچ کر توفیقِ خیر پاتے

احسان تو یہی تھا، تم مجھ کو بخش دیتے — ارمان تو یہی تھا، تم مجھ پہ رحم کھاتے

لیکن اگر سراسر ظلموں کی ٹھان لی تھی — اظہارِ وجہ کر کے دل کی خلش مٹاتے

تم خضر سے بھی بڑھ کر [illegible] مزاج نکلے — کشتی ڈبو کے بھی تو باعث نہیں بتاتے

آزاد بے گنہ پر ناحق ستم کہاں تک — بندہ نواز! یوں تو بندہ نہیں بتاتے

اوائل مارچ ١٩٣٠ء - حیدرآباد دکن - طرح طبعزاد

عالم ترے وجود سے تکمیل پا گیا — آئندہ ارتقا کی ضرورت نہیں رہی

تو اب بھی ناخدا ہو تو مجھ کو بدل قبول — ہر چند ناخدا کی ضرورت نہیں رہی

---

[1] یہ غزل "شکوۂ تغافل" کی سرخی سے رسالہ "ہمایوں" لاہور میں شائع ہو چکی ہے۔

اب چارسو تلاشِ جوانانِ رند ہے — پیرانِ پارسا کی ضرورت نہیں رہی
اب زہد کا جنوں ہے نہ اب اتّقا کا خبط — آزاد ہوں ریا کی ضرورت نہیں رہی
آزاد! وجہِ ترکِ معاصی تو کچھ بتا — کیا رحمتِ خدا کی ضرورت نہیں رہی

اوائل اکتوبر ۱۹۳۰ء۔ حیدرآباد دکن۔ برطرح مشاعرہ منعقدۂ منجانب طلبائے جامعہ عثمانیہ۔ زیرِ صدارت خلیفہ عبدالحکیم صاحب[1]۔ واقع نظامت منزل حیدرآباد دکن

سمجھتا ہوں کہ تم بیداد گر ہو — مگر پھر داد لینی ہے تمھیں سے
دلِ اندوہگیں پر رحم کھا کر — دعائیں لو دلِ اندوہگیں سے
فسوں گر! میں تجھے پہچانتا ہوں — وہیں سے بات کرنا بس وہیں سے
خداوندا! یہ کس کا آستاں ہے — کہ سجدے ٹپکے پڑتے ہیں جبیں سے
مناسب ہو تو اب پردہ اٹھا کر — ہمارا شک بدل ڈالو یقیں سے
درِ دل سے نہ اٹھا ہوں نہ اٹھوں — یہیں سے فیض پایا ہے یہیں سے
زمانے بھر سے جو چاہو سو مانگو — مگر اُن کو طلب کرنا اُنہیں سے

---

[1] ۔ جناب خلیفہ عبدالحکیم صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن عمر قریباً ۴۰ سال۔ جدید ترقی یافتہ دور کے نہایت بلند فکر اور رفیع الخیال شاعر ہیں۔ آپ غزل بہت کم کہتے ہیں نظمیں اکثر لکھتے ہیں جو نئے خیالات اور جدید معلومات کا گنج بے بہا معلوم ہوتی ہیں یقین ہے کہ آئندہ آپ اِس فن میں زیادہ ترقی کریں گے اور ملک آپ کے اعلیٰ علمی و اصلاحی خیالات سے اکتسابِ فیض کرےگا۔ آزاد انصاری

جو آزادی کی خواہش ہے تو آزاد نہ دنیا سے علاقہ رکھ نہ دیں سے

اوائل اکتوبر ۱۹۳۰ء۔ حیدرآباد دکن۔ بر طرح مشاعرہ منعقدہ دولت خانۂ مہاراجہ سر کشن پرشاد[1] بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ۔ بتقریب تشریف آوری پنڈت برجموہن[2] صاحب کیفی دتاتریہ

وہ دل کہاں سے لاؤں شکیبا کہیں جسے	باقی بھی ہو، شکیب کا یارا کہیں جسے
وہ درد دے کہ دردِ تمنا کہیں جسے	وہ دکھ عطا ہو، عین مداوا کہیں جسے
سن مجھ سے سن، وہ کیا ہے؟ فقط ربطِ حسن و عشق	اس دہر کی حقیقتِ کبریٰ کہیں جسے
اے مرکزِ امید خبر لے کہ مٹ چلی	وہ آس زندگی کا سہارا کہیں جسے
تیرے نثار تو نے مجھے دل عطا کیا	اور دل وہ دل کہ شوقِ سراپا کہیں جسے

[1] ۔ دیکھو صفحہ ۳۶ حاشیہ (۱)

[2] ۔ جناب پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی عصر حاضر کے ان مشہور بایۂ ناز اور صاحب کمال افراد میں سے ہیں جو نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور جن کا پایۂ ادب اردو کی ان اصناف میں بہت بلند ہے۔ چند سال پیشتر پنڈت سر رام انجہانی کے نا وقت اور افسوسناک انتقال ادب اردو کو جو نقصان عظیم پہنچا تھا آپ کی علم دوستی نے اس کی تلافی کا بار اپنے دوشِ ہمت پر اٹھانا منظور فرما لیا ہے اس لئے کافی امید پیدا ہو گئی ہے کہ "خمخانہ جاوید" کا ناتمام کام جلد اور باحسن وجوہ تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ ستمبر ۱۹۳۰ء میں جناب کیفی صاحب کی تشریف آوری حیدرآباد پر سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ نے آپ کے اعزاز میں ایک مشاعرہ غیر معمولی شان و شکوہ سے ترتیب دیا تھا۔ جس کا مصرع طرح تھا "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"۔ اس مشاعرے میں دکن کے بہت سے نامی گرامی شعرا کے علاوہ حیدرآباد دکن کے ارکین سلطنت اور امرا و وزرا بھی شریک تھے خاکسار کو بھی حکم ہوا۔ خاکسار کو بھی بری بھلی غزل لکھ کر شامل مشاعرہ ہونا پڑا۔ یہ غزل اسی دلچسپ مشاعرے کی یادگار ہے۔

دیدارِ حسنِ دوست کی حسرت بجا مگر ‏ ‏ وہ دیدہ لا کہ دیدۂ بینا کہیں جسے

تکمیلِ ربطِ مرکزِ اصلی کی دیر ہے ‏ ‏ خود کھینچ لے گا مرکزِ اعلیٰ کہیں جسے

اک ہم کہ بندگانِ تمنا ہیں بھی ذلیل ‏ ‏ اک تم کہ سب خدائے تمنا کہیں جسے

اب میں کہاں ہوں جلوہ گہِ حسنِ دوست میں ‏ ‏ اب میں وہاں ہوں حسن کی دنیا کہیں جسے

تدبیر کیا ہے، آپ کی جانب سے حکمِ کار ‏ ‏ تقدیر کیا ہے، آپ کا منشا کہیں جسے

اے جستجوئے منزلِ عالی! ادب۔ ادب ‏ ‏ زیرِ قدم ہے عرشِ معلیٰ کہیں جسے

اے فیلسوفِ خام! تجھے یہ خبر نہیں ‏ ‏ خود فلسفہ ہے عشق کا سودا کہیں جسے

پیری میں شغلِ بادہ و شاہد وہ شغل ہے ‏ ‏ لطفِ شبابِ رفتہ کا احیا کہیں جسے

نادان! اجا۔ تمام بُروں کو بُرا نہ کہہ ‏ ‏ اچھا وہی نہیں ہے سب اچھا کہیں جسے

کیا آپ جانتے نہیں؟ آزاد کون ہے ‏ ‏ بندہ نواز! آپ کا بندہ کہیں جسے

وسط جون ۱۹۳۱ء۔ سہارنپور۔ برطرح مشاعرہ منعقدۂ جوبلی گارڈن سہارنپور

باہتمام منشی ظفر احمد صاحب[1] ادب انصاری

اے عشقِ جنوں زا! مجھے دیوانہ بنا دے ‏ ‏ نیک و بدِ کونین سے بیگانہ بنا دے

پھر آرزوئے لطف سے بیگانہ بنا دے ‏ ‏ پھر لطف کی تکرار سے دیوانہ بنا دے

---

[1] منشی حکیم ظفر احمد صاحب ادب انصاری ساکن رامپور ضلع سہارنپور عمر تقریباً ۳۵ سال خاکسار جب اواخر مئی ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد دکن سے اپنے وطن سہارنپور پہنچا تو آپ نے از راہِ غایت محبت خاکسار کے اعزاز میں غیر معمولی اہتمام سے ایک مشاعرہ ترتیب دیا تھا یہ غزل اسی دلچسپ مشاعرہ کی یادگار ہے۔ آزاد

ڈر۔ شیخِ حرم! ڈر کہ وہ غارتگر ایماں — کعبے کو دوبارہ نہ صنم خانہ بنا دے

نزدیک ہے وہ دن کہ تری گرمئ بازار — کونین کو تیرا زرِ بیعانہ بنا دے

جس شمعِ تجلی نے مجھے سوز دیا ہے — وہ شمع کو بھی چاہے تو پروانہ بنا دے

پھر شرحِ غمِ شوق سے اک حشر بپا کر — پھر شوق کے ہر حرف کو افسانہ بنا دے

ساقی! اب اک اُس جام کا بھی دور کہ جو جام — سرتا بہ قدم جرأت رندانہ بنا دے

اے روشنئ قلب! جو ممکن ہو تو بڑھ کر — اُس نور کے ماحول میں کاشانہ بنا دے

جب تو نے مجھے زہرِ غمِ عشق دیا ہے — اِس زہر کو تریاق گوارانہ بنا دے

اے شوقِ سجودِ درِ جانانہ! ابھر کر — سرگرمِ سجودِ درِ جانانہ بنا دے

یا درد کے احساس کو لذت بھی عطا کر — یا درد کے احساس سے بیگانہ بنا دے

اب میں ہوں اور اُس مرشدِ کامل کی تلاشیں — جو واقفِ اسرارِ صنم خانہ بنا دے

آزاد! جو وہ خانہ برانداز بگڑ جائے — کل عالمِ آباد کو ویرانہ بنا دے

اوائل دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء۔ حیدرآباد دکن۔ برطرح مشاعرہ منعقدہ مکان مولانا مسعود علی صاحب محوی[1]۔ واقع کاچیگوڑہ حیدرآباد دکن

آنکھ جب صاحب نظر ہو جائے گی — حق شناس و حق نگر ہو جائے گی

---

[1] مولانا مسعود علی صاحب محوی سابق سشن جج پنشنر حال رکن محکمۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ عمر قریباً ۶۷ سال اُن عدیم المثال ہستیوں میں ہیں جن کی ذات گرامی سے قانون اور شعر و ادب کو نسبتِ فخر حاصل ہے۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۶۸)

کیا خبر تھی، اُس کی طبع دادِ دوست | اِس قدر بیداد گر ہو جائے گی
کون واقف تھا، متاعِ دردِ دل | یوں متاعِ کس مخر ہو جائے گی
چارہ گر! اک دن مری بے چارگی | آپ بڑھ کر چارہ گر ہو جائے گی
آہ کر۔ لیکن بہ اندازِ نیاز | ورنہ محرومِ اثر ہو جائے گی
چشمِ ظاہر پر بہت تکیہ نہ کر | چشمِ باطن بے بصر ہو جائے گی
گمرہی کی، راہ پر آکر تو دیکھ | گمرہی خود راہ بر ہو جائے گی
بے خبر! کارِ خبر مشکل نہیں | بے خبر ہو جا، خبر ہو جائے گی

اوائل جولائی ۱۹۳۲ء حیدرآباد دکن برطرح مشاعرہ ماہانہ منعقدہ دولتکدہ مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد[۱]۔ بہ مقام الوال مستقر جاگیر مہاراجہ بہادر

یہ مانا۔ دم بخود ہوں خوفِ جاں سے | مگر واقف ہوں ہر رازِ نہاں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷) شعر و ادب میں آپ کا ذریعہ اظہار خیال فارسی زبان ہے۔ جس پر آپ اہلِ زبان کی طرح قادر ہیں۔ آپ کا تغزل غیر معمولی طور سے بلند۔ بجد شیریں شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ اگر میری ناچیز رائے کچھ قابلِ وقعت سمجھی جا سکتی ہے تو میں کہوں گا کہ آپ کی مانند فارسی کو فارسی کی طرح لکھنے والی گراں قدر ہستی اہلِ ہند تو کیا اہلِ فارس میں مشکل دستیاب ہو سکے گی۔ اس کو زبان اُردو کی بدقسمتی سمجھئے کہ آپ نے اس کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنانے کی طرف توجہ نہیں فرمائی ورنہ اردو شعر و ادب کا مرتبہ جتنا کہ اب ہے۔ اُس سے بمراتب بلند نظر آتا۔ خاکسار کو آپ کی خدمت میں ایک بڑی حد تک نیاز حاصل ہے اور جب کبھی حاضر خدمت ہونے کا موقع ملتا ہے آپ بھی مخصوص توجہات ارزانی فرماتے ہیں۔ حکیم آزاد انصاری۔

[۱]۔ دیکھو صفحہ ۳۶ حاشیہ (۱)

طلب بر حق، مگر لاؤں کہاں سے	کہ باہر ہو حدِ وہم و گماں سے
بہت جائے اماں ڈھونڈھی، نہ پائی	ترے تیرِ نگاہ بے اماں سے
نہ دنیا کا مجھے رکھا نہ دیں کا	گلہ ہے تیرے لطفِ بیکراں سے
ہماری زندگی رنگیں بنی ہے	تو عشقِ گلعذارانِ جہاں سے
جہانِ پیر اب تک نوجواں ہے	تمہارے فیضِ حسنِ نوجواں سے
ترا داغ اور دیگا دل کو زینت	مرا باغ اور پھولے گا خزاں سے
ہمیں اب درد پہنچاتا ہے راحت	ہمیں اب نفع ہوتا ہے زیاں سے
اے او صبر و سکوں لیجانے والے	بتا۔ صبر و سکوں لاؤں کہاں سے
بجا ہے کمترینِ بندگاں ہوں	مگر نسبت ہے کس کے آستاں سے؟
تعجب ہے، نشانِ راہِ منزل	ملا بھی تو بچھڑ کر کارواں سے
نہ پوچھو کیوں وفا سے توبہ کر لی	بتنگ آکر وفائے دوستاں سے
جو اکسیرِ شباب آور ملے گی	تو خدّامِ درِ پیرِ مغاں سے
خوشا وہ دن! کہ آزاد! آپ چھوٹیں	گرفتِ دامِ افکارِ جہاں سے

اواخر دسمبر ۱۹۳۳ء۔ حیدرآباد دکن۔ برطرح مشاعرہ ماہانہ منعقدہ خاص باغ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد صدر اعظم دولت آصفیہ حیدرآباد دکن[1]

کیوں بگڑتے ہو دعا کیا ہے	بندہ پرور! مری خطا کیا ہے

[1] دیکھو صفحہ (۳۰۶) حاشیہ (۱)

کوششِ جورِ ناروا تو درست — حاصلِ جورِ ناروا کیا ہے

شکوۂ عادتِ جفا تو صحیح — چارۂ عادتِ جفا کیا ہے

شوقِ اظہارِ مدعا برحق — شکلِ اظہارِ مدعا کیا ہے

دل کی تخریب چاہنے والو! — دل کی تخریب میں مزا کیا ہے

پرسشِ حاجتِ گدا فرما — ناقدِ حالتِ گدا کیا ہے

دردِ بیمار کا مداوا کر — شکلِ بیمار دیکھتا کیا ہے

کون اُس یارِ آشنا سے کہے — حالتِ یارِ آشنا کیا ہے

بندگانِ بتانِ کافر کو — کون سمجھا سکے، خدا کیا ہے

کل وہ الفت تھی، آج یہ نفرت — ابتدا کیا تھی، انتہا کیا ہے

زاہدا ذکرِ شاہد و مے بھی — ناروا ہے تو پھر روا کیا ہے

کس طرح نفیِ ماسوا نہ کروں — دہر میں اک ترے سوا کیا ہے

میں مکاں کا نہ لامکاں کا مکیں — کیا بتاؤں، مرا پتا کیا ہے

اب یہ کس کو خبر، مرا رہبر — راہزن ہے کہ رہنما کیا ہے

آج کل کے امیر کیا جانیں — ہم فقیروں کا مرتبا کیا ہے

اے شہِ بے نوا نواز! نہ پوچھ

حالِ آزادِ بے نوا کیا ہے

اواخر جون ۱۹۳۴ء۔ حیدرآباد دکن۔ طرح طبع زاد

دلبرِ صد عشوہ زا مطلوب ہے — خوبصورت تر بلا مطلوب ہے

اہلِ دل ہوں، دلربا مطلوب ہے — بندہ بننا ہے، خدا مطلوب ہے

بیوفا! کیا کہیئے، کیا مطلوب ہے — طاقتِ ترکِ وفا مطلوب ہے

اِذن ہو تو عرضِ حالِ دل کروں — طبعِ نازک کی رضا مطلوب ہے

اے وفا کے خبط! اسے کچھ اور سُن — اب اُنہیں شکرِ جفا مطلوب ہے

بندہ پرور! کچھ خطا ہو یا نہ ہو — اب بہر حالت سزا مطلوب ہے

پھر گرفتارِ غمِ حاجات ہوں — پھر کوئی حاجت روا مطلوب ہے

مضطر آیا ہوں، سکوں درکار ہے — درد لایا ہوں، دوا مطلوب ہے

کچھ بھی ہو اب ہے دل اور تیری تلاش — کچھ بھی ہو تیرا پتا مطلوب ہے

واہ اُس طالب کی قسمت! جو مدام — شاغلِ تسبیحِ "یا مطلوب" ہے

اے ترے قربان! اب اتنی سُدھ کہاں — تو مرا طالب ہے یا مطلوب ہے

شیخ! آپ اور حُبِّ زر سے یہ جہاد! — ہو نہ ہو۔ کچھ فائدا مطلوب ہے

رند ہیں اور بادہ و شاہد کا قحط — حضرتِ زاہد دعا مطلوب ہے

پائے لنگِ فقر لیکر کیا کروں — بازوئے کشور کشا مطلوب ہے

قطعہ

حضرتِ آزاد جلد اُٹھیئے۔ اگر — منصبِ عزت فزا مطلوب ہے

یوں سنا ہے۔ بندگانِ شاہ کو — اک غلامِ باوفا مطلوب ہے

اوائل اگست سنہ ۱۹۳۴ء - حیدرآباد دکن طرح طبع زاد

بندہ ہوں اور خدا مقدّر ہے   بارک اللہ کیا مقدّر ہے

پھر مرا دل ہے اور دردِ طلب   پھر کوئی دلربا مقدّر ہے

پھر مرا دن ہے اور ظلمتِ شب   پھر کوئی مہ لقا مقدّر ہے

پھر طبیعت ہے اور تلاشِ زیاں   پھر کوئی فائدہ مقدّر ہے

پھر وہی میں ہوں اور غمِ حرماں   پھر کوئی آسرا مقدّر ہے

اے گرفتارِ مشکلات! نوید   کوئی مشکل کشا مقدّر ہے

حالِ زارِ گدا یہ کہتا ہے   کرمِ بادشا مقدّر ہے

اجتنابِ خطا سے کیا حاصل   جانتا ہوں، سزا مقدّر ہے

ہم تھے اور خبطِ آرزوئے وفا   کیا خبر تھی، جفا مقدّر ہے

لطفِ بے انتہا کے خواہشمند!   جورِ بے انتہا مقدّر ہے

آرزوئے بتانِ کافر میں   آرزوئے خدا مقدّر ہے

جستجوئے دوائے دردِ عبث   درد میں خود دوا مقدّر ہے

رہ سپارِ فنا سہی - لیکن   مطمئن ہوں، بقا مقدّر ہے

کون واقف؟ کہ یہ مری پستی   کس قدر اعتلا مقدّر ہے

اے کمالِ فراغ کے طالب!   یاد رکھ، ابتلا مقدّر ہے

دہر ندکور ہے تو کیا - کہ ہنوز   ابتدا انتہا مقدّر ہے

آپ آزاد! اور یہ بندِ بلا؟ واہ! کیا آپ کا مقدر ہے

وسط جنوری ۱۹۳۵ء - حیدرآباد دکن - طرح مرغوب

اے جلوۂ جاناں! مجھے معلوم ہے یعنی
تو برق ہے اور میرے ہی خرمن کیلئے ہے

واقف ہوں، رخ اس خوگر غارت کا ادھر ہے
آگاہ ہوں، خطرہ مرے دامن کے لئے ہے

اب کس کو یہ معلوم، تری برقِ تجلی
اس طرح ملیاں کس کے نشیمن کے لئے ہے

اے دوست! گوارا مجھے ہر جور گوارا
لیکن وہ ترا لطف، جو دشمن کے لئے ہے

آزاد! خبر بھی ہے؟ تری گرمئ گفتار
اک شعلہ ہے اور تیرے ہی دامن کے لئے ہے

ناتمام غزلیات کے اشعار[۱]

بہ ترتیب زمانہ تصنیف

دسمبر ۱۸۹۲ء - سہارنپور

نئے گل کھلیں گے تری انجمن میں
اگر رنگ یارانِ محفل یہی ہے

---

[۱] - ان میں وہ اشعار بھی شامل ہیں کہ کوئی مفرد خیال ذہن میں آیا اور شعر موزوں ہو گیا اور وہ اشعار بھی جو کسی دوسری زبان کے اشعار سے ترجمہ کر لئے گئے ہیں۔ آزاد انصاری۔

جون سنہ ۱۹۰۱ء ۔ سہارنپور

مری چپ سر گزرد کی داستاں ہے　　مری بے زبانی نہیں ہے، زباں ہے

اوائل اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء ۔ سہارنپور ۔ بر طرح رسالہ محبوب الکلام حیدرآباد دکن

بس ایک خاص توجہ کی آرزو حسرت تھی　　غمِ فراق ابھی ناگوار باقی ہے
ہمارے شوقِ فراواں کی لاج رکھ لینا　　ہمارے حق میں تمھیں اختیار باقی ہے
نہ اب وہ شوق کہ آوارۂ تلاش پھروں　　نہ اب وہ ہمتِ پائے وقار باقی ہے
ہجوم یاس میں بھی دل سے تیری دھن نہ مٹی　　نشے اتر گئے لیکن خمار باقی ہے
ابھی سے کوششِ اغماض بے محل ہوگی　　ابھی تو شمۂ صبر و قرار باقی ہے
بہار اور یہ وحشت، خدا ہی خیر کرے　　ابھی تو وقتِ وداعِ بہار باقی ہے
اک اور ہمتِ مردانہ کی ضرورت تھی　　اک اور وادیِ مشکل گزار باقی ہے

جون سنہ ۱۹۰۴ء ۔ کانپور

کاش! اِس کشمکشِ بیم و رجا سے چھوٹے دل　　تیری حسرت، تری اُمید میں کیا رکھا ہے

فروری سنہ ۱۹۰۹ء ۔ کانپور

کب تک ستمِ حسرتِ جاوید سہیں گے　　کب تک گلۂ غفلتِ بے جا نہ کرینگے
احباب کے شاکی ہو، مگر یہ تو سمجھ لو　　بے وجہ ستاؤ گے تو شکوا نہ کرینگے
اف! کوششِ اظہارِ تمنا کا نتیجہ　　اب بھول کے اظہارِ تمنا نہ کرینگے
اے شوقِ ملاقات! نتیجے کی طرف دیکھ　　کیا اِس کی ضمانت ہے کہ وہ دھوکا نہ کرینگے

اے کاش! وہ یہ کہہ کے حجابات اٹھا دیں | ہم طالبِ دیدار سے پروا نہ کرینگے
جو شکوہ احباب روا رکھتے ہیں رکھیں | ہم خادمِ احباب ہیں ایسا نہ کرینگے
اے طالبِ لطف! آرزوئے لطف کہاں تک | وہ لطف کی تکلیف گوارا نہ کرینگے

۱۰ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء ۔ انبالہ چھاؤنی

وہ کہتے ہیں اگر کوئی تمنا ہو تو ظاہر کر | خوشا قسمت! کہ میرے منہ سے حرفِ دعا نکلے
تمھیں آزاد! ہم اک مردِ حق آگاہ سمجھے تھے | مگر یا پیر و مرشد! تم ہمارے بھی چچا نکلے

یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۸ء ۔ لاہور

کیا کہیں کس سے دل لگا بیٹھے | گھی کے دھوکے کپاس کھا بیٹھے

مارچ سنہ ۱۹۱۹ء ۔ ملتان

حالتِ دل غمِ دلدار میں کب تک دیکھوں | ایسے نظارۂ جانکاہ نہ دیکھے نہ سُنے
آہ کی اور بلاؤں کا فلک ٹوٹ پڑا | ایسے اُلٹے اثرِ آہ نہ دیکھے نہ سُنے
کمرِ ہمتِ رہبر بھی جھکی جاتی ہے | کہیں ایسے ستم راہ نہ دیکھے نہ سُنے
آپ آزاد کو دیوانہ کہیں حیرت ہے | ایسے مجذوب من اللہ نہ دیکھے نہ سُنے

۲۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء ۔ علی گڈھ

تکلف ہائے دنیا اہلِ دنیا کو مبارک ہوں | ہماری زندگانی سیدھی سادھی زندگانی ہے

جنوری سنہ ۱۹۲۰ء علیگڈھ

اک تم کو شبِ عیش بسر کی | اک ہم کہ سحر کی خبر تو مر مر کے سحر کی

جائز ہے، اگر آپ نذر مجھ کو سزا دیں ثابت ہے کہ جو میں نے خطا کی وہ نذر کی

اب دل ہے کہ پامالِ غم بیم و رجا ہے اب میری طبیعت نہ اِدھر کی نہ اُدھر کی

دنیا مجھے کیوں غیرتِ اکسیر نہ سمجھے ہیں خاک ہوں اور خاک بھی کس کی ترے در کی

۲۸/ اگست سنہ ۱۹۲۰ء۔ علیگڈھ

فغاں بھی، کوششِ ضبطِ فغاں بھی بے اثر نکلی بُرے ابد افزا مبتدا کی یہ خبر نکلی

مئی سنہ ۱۹۲۱ء۔ دہلی

نہ سمجھ، مجھ کو رائگاں نہ سمجھ نہ سہی، تیرے کام کا نہ سہی

۲۳/ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء دہلی

اُسے فکرِ عقبیٰ سے کیا واسطہ جسے عیشِ دنیا کی توفیق ہے

کل آزاد، جو شیخ الاسلام تھا وہ آج اک کلیسا کا بطریق ہے

اوائل جون سنہ ۱۹۲۲ء۔ دہلی

کیا فائدہ؟ کہ دل سے کوئی اور کام لوں بخشا گیا ہے صرف تری یاد کے لئے

شغلِ شراب شرع سے ممنوع ہے تو ہو آزادیاں ہیں حضرتِ آزاد کے لئے

اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء۔ دہلی

تری آن سب سے جدا دیکھتا ہوں تری شان سب سے نرالی رہی ہے

دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء حیدرآباد دکن

نظر پُرنور ہے تیرے فروغِ روئے انور سے جہاں معمور ہے تیرے فیوضِ جلوہ گستر سے

فروری ۱۹۲۴ء - حیدر آباد دکن

اب ضبطِ شکایت کی تاکید سے کیا حاصل — اب دل ہے کہ سرتاپا لبریزِ شکایت ہے

۳۱ اگست ۱۹۲۴ء حیدر آباد دکن

یہ دیواروں، دروں کو پوجتا ہے[1] — وہ اینٹوں، پتھروں کو پوجتا ہے

مناسب ہو تو اب پردہ اُٹھا دے — کہ جو ہے، دوسروں کو پوجتا ہے

ستمبر ۱۹۲۴ء - حیدر آباد دکن

مادیّت سے تعلق کیا بڑھا — گھٹ گئی تسکینِ روحانی مری

جون ۱۹۲۵ء - حیدر آباد دکن

تجھ سے وجودِ حُسن تو مجھ سے وجودِ عشق — تجھ کو دوام ہے تو مجھے بھی دوام ہے

اواخر دسمبر ۱۹۲۷ء - حیدر آباد دکن

دمِ بادِ بہاری ہے[2]، نزولِ لطفِ باری ہے — ہجومِ نغمہ کاری ہے، بہارِ بادہ باری ہے

جسے دیکھو، وہ محوِ اخذِ لطفِ بادہ و شاہد — عطیاتِ خدائے دو جہاں[3] کی حق گزاری ہے

---

[1] یہ دونوں شعر عرفی کے مشہور مندرجۂ ذیل اشعار کا ترجمہ ہیں۔

فقیہاں دفترے رامی پرستند — حرم جویاں درے را می پرستند

برافگن پردہ تا معلوم گردد — کہ یاراں دیگرے را می پرستند

[2] آمدِ بہار پر مسلسل غزل لکھنی چاہی تھی مگر ناتمام رہ گئی صرف دو شعر کام کے تھے جو یہاں درج کر دیے گئے
آزاد انصاری

[3] دیکھو صفحہ ۱۷ حاشیہ (۱)

اواخر مارچ سنہ ۱۹۲۸ء حیدرآباد دکن

دل کو اب کس طرح تسلّی دوں
دل تسلّی قبول بھی تو کرے

اوائل اپریل سنہ ۱۹۲۸ء۔ حیدرآباد دکن

مجاز و حقیقت بہم ضد سہی
مگر ان میں اک خاص وحدت بھی ہے

۱۲، اپریل سنہ ۱۹۲۸ء۔ حیدرآباد دکن

ستمگر! آفریں۔ اِس تیری دادِ خاص کے صدقے
زمانہ داد کے قابل، مگر آزادِ انصاری

اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء۔ حیدرآباد دکن

پھر شوق لے چلا ہے مجھے سوئے بزمِ دوست
شمعِ امید دل میں فروزاں کیے ہوئے

۱۳، جون سنہ ۱۹۲۹ء حیدرآباد دکن

ترے بے خبر کو یہ کیا کم خبر ہے
کہ تو مبتدا اور عالم خبر ہے

۱۵، فروری سنہ ۱۹۲۹ء حیدرآباد دکن

تمہارا کرم اور ہمیں یاد رکھے
تمہارے کرم کو خدا شاد رکھے

۱۸، فروری سنہ ۱۹۲۹ء حیدرآباد دکن

افسوس[۱]! بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

---

[۱] - یہ شعر حکیم عمر خیام کی مشہور رُباعی کے مندرجۂ ذیل آخری شعر کا ترجمہ ہے - آزاد انصاری

افسوس! کہ صد ہزار معنیٔ دقیق
از بے خردیٔ خلق ناگفتہ بماند

یکم جنوری ۱۹۳۳ء حیدرآباد دکن

نہ پوچھو، ربطِ حُسن و عشق کی دنیا کہاں تک ہے
زمیں سے آسماں تک ہے، مکاں سے لامکاں تک ہے

۳۰ مئی ۱۹۳۳ء۔ حیدرآباد دکن

دہر سرتا بہ پا محبت ہے ۔۔۔ از الف تا بہ یا محبت ہے

یکم دسمبر ۱۹۳۳ء حیدرآباد دکن

جو بتوں کو خدا سمجھتے ہیں ۔۔۔ وہ نہیں جانتے، خدا کیا ہے

یکم جنوری ۱۹۳۴ء حیدرآباد دکن

اعتبارات سے بالا ہو جا ۔۔۔ اعتبارات میں کیا رکھا ہے

اواخر جون ۱۹۳۴ء حیدرآباد دکن

اے زہے بختِ گدا! پھر شاہ کو ۔۔۔ پرسشِ حالِ گدا منظور ہے

۲ جنوری ۱۹۳۵ء۔ حیدرآباد دکن

اے یارِ حسیں! کس کا گھر آباد کرے گا ۔۔۔ اے ماہِ مبیں! کون سی منزل کے لئے ہے

۲۰ جولائی ۱۹۳۵ء۔ حیدرآباد دکن

آ، مگر اس قدر قریب نہ آ ۔۔۔ کہ تماشا محال ہو جائے

۲۴ جولائی ۱۹۳۵ء حیدرآباد دکن

پیروِ اہلِ عشق۔ بالتحقیق ۔۔۔ پیروِ سنّتِ الٰہی ہے

بے خبر اک گدائی درِ دوست　　دونوں عالم کی بادشاہی ہے

اوائل ستمبر ۱۹۳۶ء - حیدر آباد دکن بر طرح میرزا غالب علیہ الرحمۃ

"پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا"[1]　　اور بہ اندازِ دگر یاد آیا

پھر مرے سر کو وہ در یاد آیا　　پھر کوئی سجدہ مگر یاد آیا

گل و گلشن کا خیال آنا تھا　　کہ وہ رشکِ گلِ تر یاد آیا

میں اُسے بھول تو جاؤں لیکن　　بھولنے پر بھی اگر یاد آیا

پھر وہ نظریں طرفِ در اٹھیں　　پھر کوئی بندۂ در یاد آیا

ہم ترے جور کا احسانِ عظیم　　بھول بیٹھے تھے۔ مگر یاد آیا

ترکِ درمان و دوا کی سوجھی　　چارۂ نوو اثر یاد آیا

عزمِ دعوائے نظر کرتے ہی　　عجز یارائے نظر یاد آیا

شیخ کا شورِ کرامت سُن کر　　وہ بتِ شعبدہ گر یاد آیا

جب سکوں دل کو سکوں دے نہ سکا　　نسخۂ دردِ جگر یاد آیا

نفع کا خبط تو سوجھا تھا۔ مگر　　نفع کے ساتھ ضرر یاد آیا

شکرِ غم تا بہ لب آیا۔ لیکن　　صورتِ نالہ و فریاد آیا

---

[1] یہ غزل ردیف الف کی غزل ہے اور ردیف الف میں درج ہونی چاہئے تھی۔ مگر چونکہ دورانِ طباعتِ دیوان میں کہی گئی تھی اور ردیف الف طبع ہو چکی تھی اس لئے بعد ختم غزلیات سب سے آخر میں درج کرنی پڑی۔ آزاد انصاری۔

قطعہ

نخلِ راحت کی طرف بڑھنا تھا ۱ نخلِ راحت کا ثمر یاد آیا
قصد "ممنوعہ شجر" کرنا تھا ۲ جورِ "ممنوعہ شجر" یاد آیا
تم اور آزاد اِ تسلسل بہ سجود
سچ کہو کس کا یہ در یاد آیا

مصوّر شاعری

اک مشہور ہندی کا دوہا ہے معلوم نہیں کس کا ہے۔

راتن کے رس بین ماں باتن پڑ گئی کھیس
ترسٹھ کے چھیاسٹھ بھئے چھیاسٹھ سے چھتیس

پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہندی اکائی اعداد تین اور چھ کا رسمِ خط علی الترتیب (3) و (٤) ہے۔ اب دوہے کا مطلب سمجھیے۔ شاعر کہتا ہے کہ کل وصل کی رات عاشق و معشوق ایک دوسرے کی طرف منھ کئے ہوئے

لیٹے تھے اور صورت یہ تھی (43) یعنی جس طرح (۶۳) کا عدد لکھا جاتا ہے
ناگہاں باتوں باتوں میں جھگڑا ہو گیا اور معشوق نے خفا ہو کر کروٹ لے لی تو
یہ صورت ہو گئی (44) یعنی جس طرح ہندی میں (۶۶) لکھا جاتا ہے۔ عاشق
نے معشوق کو منانے کی بہت کوشش کی مگر جب وہ نہ منا تو اُس نے بھی بگڑ کر کروٹ
بدل لی تو یہ شکل ہو گئی (34) یعنی جس طرح ہندی میں (۳۶) کا عدد۔

میں نے اس سے پہلے بھی اِس دوہے کو چند بار سنا تھا اور اِس سے محظوظ
بھی ہوا تھا مگر کبھی اِس نظر سے اس پر غور نہیں کیا تھا کہ اس کے مضمون کو اردو
میں منتقل کیا جا سکتا ہے یا نہیں لیکن دو سال پہلے "ادبی دنیا" میں اِس دوہے پر
مولانا امجد حیدر آبادی کا ایک مختصر سا مضمون اور دلچسپ تشریح دیکھ کر اس کے
ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ تھوڑا ہی غور کیا تھا کہ معلوم ہوا کہ اردو اعداد میں بھی
دو اعداد یعنی (۲) اور (۶) کا ایسا رسم خط ہے جس کی مدد سے اِس دوہے کا
ترجمہ اردو میں کیا جا سکتا ہے یہ گُر ہاتھ آنا تھا کہ میں دوہے کے اردو ترجمہ کرنے
میں تھوڑی سی کوشش کے بعد کامیاب ہو گیا جسے ذیل میں درج کرتا ہوں۔

کل رات وہ رنجش بڑھی جاگے مقدر سو گئے
چھبیس[۲۶] کے بائیس[۲۲] ہو گئے بائیس[۲۲] کے باسٹھ[۶۲] ہو گئے

[۱] "چھبیس اور بائیس" دونوں مفعول کے وزن پر تھیں۔ مگر میں نے ان ہر دو الفاظ کو اپنے مندرجہ بالا
اشعار میں "چھبیس اور بائیس" بر وزن فعلن استعمال کیا ہے اور دانستہ استعمال کیا ہے (بقیہ بر صفحہ ۱۸۳)

یعنی کل رات وصل میں عاشق و معشوق لیٹے ہوئے تھے اور یہ صورت تھی (۲۶) اچانک باتوں باتوں میں کچھ ایسا رنج پیدا ہو گیا کہ معشوق نے خفا ہو کر دوسری طرف کروٹ بدل لی جس سے یہ صورت پیدا ہو گئی (۲۲) عاشق نے منانا چاہا مگر جب معشوق نہ منا تو عاشق نے بھی بگڑ کے کروٹ بدل لی۔ جس سے یہ شکل پیدا ہو گئی (۶۲)

یہاں تک تو ترجمہ کا حق تھا جو میں نے برا بھلا ادا کر دیا، اب اس کا عکس ملاحظہ ہو جسے ترجمہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ میرے تخیل کی پیداوار ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ میرے تخیل کی پیداوار بھی اُسی دوہے کی رہین منت ہے۔ وہ صورت فراق یار رنجش باہمی کا نقشہ تھا۔ ذیل میں وصال یا حسب سابق صلح و صفائی کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔

شکر خدا روٹھے ہوئے معشوق و عاشق من گئے
باسٹھ (۶۲) کے بائیس (۲۲) بن سکے، بائیس (۲۲) کے چھبیس (۲۶) بن گئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۲) یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اہل فارس "کشمیر" کو "کاشمیر" "کاشمر" اور "کشمر" وغیرہ مختلف صورتوں میں استعمال کرتے ہیں یا ہمارے شعرا اردو لفظ "کوئی" بروزن فعلن کو "کوئی" بروزن فعل "کوئی" بروزن فاع ضرورت شعری کی وجہ سے کئی کئی صورتوں میں بہ تحرک نظم کر جاتے ہیں اور اُس کو عیب نہیں سمجھتے مختصر یہ ہے کہ میں بھی عند الضرورت ایسے شاعرانہ تصرفات کو جائز سمجھتا ہوں۔

آزاد انصاری

بگاڑ کے بعد معشوق و عاشق کی یہ شکل تھی (۶۲) کچھ دیر کے بعد عاشق نے کروٹ بدل کر معشوق کو منانے کی کوشش شروع کی تو یہ شکل بن گئی (۲۲) اور جب معشوق کا غصہ اُتر گیا اور عاشق منانے میں کامیاب ہو گیا تو پھر وہی سابقہ صورت پیدا ہو گئی جس کی تصویر یہ ہے (۲۶)

بتقریب سعید شادی برخوردار احسان احمد اطال اللہ عمرہٗ

اوائل اپریل سنہ ۱۹۲۶ء - علی گڑھ

عزت کی جلا سہرا، عظمت کی بنا سہرا ۔۔۔ احسان! ترا سہرا، اُمید فزا سہرا

انعامِ خدا طُرّہ، اکرام خدا سہرا ۔۔۔ واللہ نیا طُرّہ، واللہ نیا سہرا

احسان کی شادی ہے، ارمان کی شادی ہے ۔۔۔ جا، بختِ ہمایوں! جا اور گوندھ کے لا سہرا

دولھا ہو تو ایسا ہو، سہرا ہو تو ایسا ہو ۔۔۔ کیا آن ہے کیا دولھا، کیا شان ہے کیا سہرا

دولھا ہمہ تن طلعت، سہرا ہمہ تن نکہت ۔۔۔ اے صلِّ علیٰ دولھا، اے صلِّ علیٰ سہرا

مکھڑا قمرِ روشن، سہرا سحرِ گلشن ۔۔۔ اے نامِ خدا مکھڑا، اے نامِ خدا سہرا

کیا جلوۂ زیبا ہے، کیا رنگ تماشا ہے — سہرے کی ضیا مکھڑا، مکھڑے کی ضیا سہرا
جلوے ہیں کہ رقصاں ہیں، آنکھیں ہیں کہ حیراں ہیں — تنویر ہے یا دولہا، تصویر ہے یا سہرا
سامانِ صد احساں ہے، بارانِ صلۂ احساں ہے — ممنونِ سخا غازہ، مرہونِ عطا سہرا
کیوں رنگ نہ رچ جائے، کیوں دھوم نہ مچ جائے — مرغوب ادا دولہا، مرغوب ادا سہرا
لے آج بلائیں لے، نوشاہ کے چہرے کی — لے آج دعائیں لے، حقدارِ دعا سہرا

آزاد! جزاک اللہ! آزاد! حماک اللہ
کیا طبع ہے کیا جودت، کیا رنگ ہے کیا سہرا

دیگر

بتقریب شادی خانہ آبادی برخوردار حسن اختر طال عمرہٗ خلف کرمی
جناب سید کاظم علی صاحب باغ علیگڈھی۔ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء حیدرآباد دکن

پیارے نوشاہ کا پیارا سہرا — چشمِ بد دور! دل آرا سہرا
جلوۂ حسنِ حسن اختر سے — رشکِ گلزار ہے سارا سہرا
بحر نے صدقے اتارے موتی — باغ نے نذر گزارا سہرا
مہ و اختر کی تجلی عارض — گل و گلشن کا نظارا سہرا
عشقِ رخسار کا کشتہ غازہ — شوقِ دیدار کا مارا سہرا
سائلِ چشمِ عنایت سرمہ — مائلِ روئے دل آرا سہرا

خلشِ وصل کا درماں کنگنا — تپشِ ہجر کا چارا سہرا
وقت کا رشکِ سکندر طرّہ — بخت کا غیرتِ دارا سہرا
اوجِ قسمت کی بشارت بدّھی — چرخِ عزّت کا ستارا سہرا
چاند سے جسم کا ٹکڑا دولھا — باغ کے قلب کا پارا سہرا
پیارے انداز ہیں، پیارا نوشاہ — پیاری ترکیب ہے، پیارا سہرا
رُخِ نوشاہ ہے جنّت آزاد — اور جنّت کا نظارا سہرا

دُہرا سہرا[۱]

بہ تقریب شادی خانہ آبادی شہزادگان بلند اقبال نواب اعظم جاہ بہادر ولیعہد دولت آصفیہ و نواب معظم جاہ بہادر برادر خورد نواب ولیعہد بہادر خلف بندگانعالی متعالی مظفر الممالک آصف جاہ سر میر عثمان علی خاں بہادر سلطان دکن خلد اللہ ملکہٗ

موزونیہ اواخر دسمبر ۱۹۳۱ء - حیدر آباد دکن - بطرز ترصیع جمع

واقعی داد کے حق دار ہیں دونوں سہرے — بندۂ خدمتِ سرکار ہیں دونوں سہرے
رشکِ سلکِ دُرِ شہوار ہیں دونوں سہرے — غیرتِ ابرِ گہر بار ہیں دونوں سہرے

---

۱ - چونکہ دونوں شاہزادگان بلند اقبال تقریباً ہم عمر ہیں اور حسنِ اتفاق سے دونوں کی مبارک شادیوں کی رسم بھی بہ یک وقت اور ساتھ ساتھ عمل میں آئی تھی لہٰذا زیادہ دلچسپ اور زیادہ بلیغ صورت سہرے لکھنے کی یہ نظر آئی کہ دونوں شاہزادگان عالی مقام کا متفقہ دہرا سہرا لکھ دیا جائے۔
آزاد انصاری۔

مہوش و مہ رخ و مہ پارہ ہیں دونوں نوشاہ — دلکش و دلبر و دلدار ہیں دونوں سہرے
آصفی چرخ کے سیارہ ہیں دونوں نوشاہ — اوجِ اقبال کے آثار ہیں دونوں سہرے

روکشِ طلعتِ ناہید ہیں دونوں دولہا — غیرتِ مطلعِ انوار ہیں دونوں سہرے
پارہ ہائے مہ و خورشید ہیں دونوں دولھا — لخت ہائے گل و گلزار ہیں دونوں سہرے

کیوں نہ مستوں کی طرح فرطِ طرب سے جھومیں — بادۂ عیش سے سرشار ہیں دونوں سہرے
کیوں نہ ہر سمت مسرّت کی مچاویں دھومیں — باغِ شادی کے ہوادار ہیں دونوں سہرے

دُہری تزئین دکھائی ہے ہر اک سہرے نے — دُہری تحسین کے حقدار ہیں دونوں سہرے
دُہری توقیر بڑھائی ہے ہر اک سہرے نے — دُہری عزّت کے سزاوار ہیں دونوں سہرے

سر کے بل پائوں کی جانب جو چلے شور اُٹھا — پائے بوسی کے طلبگار ہیں دونوں سہرے
سر سے کچھ ایسی طرح رخ پہ ڈھلے شور اُٹھا — عاشقِ جلوۂ رخسار ہیں دونوں سہرے

دونوں سہروں کا یہ اندازِ کشش تو دیکھو — مرکزِ حسرتِ دیدار ہیں دونوں سہرے
دونوں سہروں کی یہ گستاخ روش تو دیکھو — سر پہ چڑھ جانے کو تیار ہیں دونوں سہرے

پہلے آزاد کبھی ہوں گے مگر اب آزاد
قیدِ الفت میں گرفتار ہیں دونوں سہرے

قطعاتِ دلکشا

گھر پھونک تماشا

۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۱۶ء۔ سہارنپور

شبرات آتے ہی ہر سو حشر برپا ہو گیا ۔۔۔ ہر تماشا اِک قیامت کا تماشا ہو گیا
سیکڑوں اسرافِ ناجائز روا رکھے گئے ۔۔۔ اتنی آتش بازیاں چھوٹیں کہ تڑکا ہو گیا

مفلسی اور آمدِ رمضاں

۷ ستمبر سنہ ۱۹۱۶ء۔ انبالہ چھاؤنی

کاش! آزاد! یہ افواہ غلط ثابت ہو ۔۔۔ سُن رہا ہوں کہ مرے گھر رمضاں آتے ہیں
سحری کا مجھے مقدور نہ انطاری کا ۔۔۔ متحیر ہوں کہ آخر یہ کہاں آتے ہیں

عذرِ ترکِ صوم

ایضاً

اگر آزاد! مرے بھائی مسلمان مجھے ۔۔۔ تارکِ صوم بتاتے ہیں، ستم ڈھاتے ہیں

جس کو اک وقت میسّر ہو اور اک وقت نہ ہو اُس کے گھر سال میں بارہ رمضاں آتے ہیں

عذرِ شکستِ صوم

ایضاً

بے ضرورت حلقۂ احباب میں شور برپا ہے کہ "روزہ کھا لیا"
کیا کروں، فاقوں سے جب تنگ آگیا جو نہ کھانا چاہیے تھا، کھا لیا

ایضاً

ایضاً

اگر قسمت سے روزہ کھا نہ لیتا تو اپنے حق میں کچھ اچھا نہ کرتا
ملامت کیجئے، لیکن سمجھ کر سُنا ہوگا کہ "مرتا کیا نہ کرتا"

ایک افسُردہ دل کی عید

شب یکم شوال ۱۳۲۹ھ م ۲۵ ستمبر ۱۹۱۱ء

خوشی کے ترانے خبر دے رہے ہیں سحر جلوہ بخشِ جہاں عید ہوگی
مگر جن کے دل مر چکے ہیں انھیں کیا جہاں عید ہوگی، وہاں عید ہوگی

ایضاً

یکم شوال ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۱۱ء

نہ امنگیں، نہ ترنگیں، نہ مسرت، نہ خوشی اب ہمارے دلِ نومید میں کیا رکھا ہے

کسے دیکھیں، کسے آغوش میں لیکر خوش ہوں | عید آیا کرے، اب عید میں کیا رکھا ہے

مبارک باد عید احباب کی خدمت میں

بیکم شوال ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۱۱ء

پھر یوم عید آیا، وقت سعید آیا | پھر لطف ہائے یزداں احباب کو مبارک
آزاد ہاتھ اُٹھاکر اللہ سے دُعا کر | عید اور اُس کی خوشیاں احباب کو مبارک

نوحۂ ممتاز

شریکِ زندگی کی رحلت پر

مرتبہ اوائل ۱۹۰۷ء کانپور

بطرزِ نثرِ صنیعِ جدید

افتتاحِ بزمِ عشرت رائگاں | انہماکِ لطفِ صحبت رائگاں

التماسِ مدعائے دل فضول | شوقِ اظہارِ محبت رائگاں

۵۸ - دیکھو صفحہ (۲) حاشیہ (۱)

التجائے رحم لاحاصل فضول　　خبطِ امیدِ عنایت رائگاں

آرزوئے جلوۂ صورت عبث　　اعتقادِ حسنِ سیرت رائگاں
گفتگوئے خوبیٔ قسمت عبث　　اعتمادِ چشمِ الفت رائگاں

حسرتِ لذاتِ فانی ہیچ ہیچ　　اعتبارِ وصل و فرقت رائگاں
ادّعائے کامرانی ہیچ ہیچ　　امتیازِ رنج و راحت رائگاں

اوّل و آخر بھروسا کچھ نہیں
کچھ نہیں، انجامِ دنیا کچھ نہیں

آج دل کیوں بجھ رہا ہے کیا کہوں　　آج کس رخ کی ہوا ہے کیا کہوں

کیا بتاؤں کیوں بحالِ زار ہوں　　کیوں طبیعت بدمزا ہے کیا کہوں
کیا بتاؤں کیوں جگر افگار ہوں　　کیا ملالِ جاں گزا ہے کیا کہوں

کچھ نہ پوچھو کس حصارِ غم میں ہوں　　کیا مصیبت رونما ہے کیا کہوں

کچھ نہ پوچھو کس نئے عالم میں ہوں　　کس ستم کا سامنا ہے کیا کہوں

آہ! کیا اظہارِ حالت ہو سکے　　آہ! کیا حکمِ قضا ہے کیا کہوں
آہ! کیا تشریحِ کلفت ہو سکے　　آہ! کیا محشر بپا ہے کیا کہوں

آرزوہائے نہاں کا کوچ ہے
کارواں کے کارواں کا کوچ ہے

یاس افزا حالتِ ممتاز ہے　　وقتِ داغِ فرقتِ ممتاز ہے

خاطرِ ناشاد مضطر کیوں نہ ہو　　آج روزِ رخصتِ ممتاز ہے
حالتِ آزاد ابتر کیوں نہ ہو　　آج یومِ رحلتِ ممتاز ہے

اے مجالِ ضبطِ پنہاں! خاک ہو　　انتہائے کلفتِ ممتاز ہے
اے گریبانِ تحمل! چاک ہو　　اختتامِ الفتِ ممتاز ہے

المدد۔ اے نالۂ طاقت گسل　　انعدامِ قوتِ ممتاز ہے

المدد۔ اے اضطرابِ متصل　　　　الغضائے مدتِ ممتاز ہے

لُو۔ وہ ہر امید کا قتل ہو گیا
اور چراغ آرزو گُل ہو گیا

اب نہ وہ آزارہائے جاں گزا　　　　اب نہ وہ بے تابئی طاقت رُبا

اب نہ وہ ہر بات سے کلفت عیاں　　　　اب نہ وہ ہر سانس پر اُف کی صدا
اب نہ وہ ہر اشک پر ضبطِ فغاں　　　　اب نہ وہ ہر آہ پر شکرِ خدا

اب وہ نہ عفوِ خطا کی کوششیں　　　　اب نہ وہ بار ائے عرضِ مدعا
اب نہ وہ وِردِ دُعا کی کوششیں　　　　اب نہ وہ اظہارِ تسلیم و رضا

اب نہ وہ فہمائش صبر و سکوں　　　　اب نہ وہ دلداریٔ بے انتہا
اب نہ وہ شنوائی حالِ زبوں　　　　اب نہ وہ حُسنِ سلوکِ مامضیٰ

آس حیراں تھی کہ "یہ کیا ہو گیا"
یاس بول اُٹھی کہ "ترکا ہو گیا"

اے فغاں! ایک لخت آتشبار ہو   اے خیالِ این و آں! فی النار ہو

اے توقع! داستاں کوتاہ کر   اے خوشی! صرفِ غمِ دلدار ہو
اے مسرّت! نالۂ جانکاہ کر   اے نشاطِ زندگی! بیکار ہو

اے توحُّش! قیدِ راحت سے نکال   اے سکونِ قلب! وجہِ عار ہو
اے تحمُّل! دوسرا گھر دیکھ بھال   اے تسلّی! کوچ پر تیار ہو

اے سنانِ یاس! سینے سے گزر   اے خدنگِ غم! جگر کے پار ہو
اے ہجومِ آرزو! بے موت مر   اے تمنّا! زیست سے بیزار ہو

اے مصیبت! شرحِ درد آغاز کر
اے محبّت! ماتمِ ممتاز کر

اے کہ تو اور جورِ مرگِ ناگہاں   اے کہ تیرے بعد جینا رائگاں

تو مرے شورِ فغاں سے بے خبر   ہیں بہ حالِ مضطرب ماتم کناں

تو مرے حالِ تپاں سے بے خبر　　میں ہجومِ رنج و غم سے نیم‌جاں

آہ! میں اور دیدہ ہائے اشکبار　　آہ! تو اور کوچ کی تیاریاں
آہ! میں اور نالہ ہائے دل‌فگار　　آہ! تو اور داغِ ہجرِ جاوداں

یا وہ پیمانِ وفا، یا یہ سکوت؟　　لاکھ چلّایا کرو، کچھ ہوں نہ ہاں
یا وہ تکرارِ دُعا، یا یہ سکوت؟　　لاکھ سر کھایا کرو، سب رائگاں

اب نہ وہ رنگِ خیالاتِ قدیم
اب نہ وہ پاسِ ملاقاتِ قدیم

وہ مری خوبیٔ قسمت کیا ہوئی　　وہ نگاہِ مہر و اُلفت کیا ہوئی

لاکھ بیدل ہوں، دلاسا تک نہیں　　وہ توجّہ، وہ عنایت کیا ہوئی
لاکھ شاکی ہوں، مدارا تک نہیں　　وہ نگاہیں، وہ مروّت کیا ہوئی

آج کیوں پاسِ وفا دشوار ہے　　وہ تعشّق، وہ محبت کیا ہوئی

آج کیوں چشمِ کرم سے عار ہے — وہ تعلق، وہ طبیعت کیا ہوئی

آج کیوں میری تجھے پروا نہیں — اب وہ ہمدردانہ اُلفت کیا ہوئی
آج کیوں مجھ پر ترس آتا نہیں — اب وہ غمخوارانہ عادت کیا ہوئی

بے خطا ہوں، منصفی سے کام لے
مضطرب ہوں، دلدہی سے کام لے

شوق کو شکوا ہے، آنکھیں کھول دے — قلب پر صدما ہے آنکھیں کھول دے

کوئی شرطیں باندھ کر سوتا نہیں — ہو نہ ہو دھوکا ہے، آنکھیں کھول دے
کوئی یوں خواب آشنا ہوتا نہیں — کھل گیا۔ چکما ہے آنکھیں کھول دے

بس بہت ترسالیا، اب درگذر — دل لگی بیجا ہے آنکھیں کھول دے
بس بہت کلپا لیا، اب رحم کر — کیوں ستا رکھا ہے آنکھیں کھول دے

بدشگونا نہ مذاق اچھا نہیں — سخت نازیبا ہے آنکھیں کھول دے

میں نے یہ منظر کبھی دیکھا نہیں   مجھ کو وہم آتا ہے آنکھیں کھول دے

پھر نگاہِ دلرُبا سے دیکھ لے
پھر اُسی پیاری ادا سے دیکھ لے

غلبۂ وحشت ہی، کچھ ہنس بول لے   دل ہی اور حسرت ہے، کچھ ہنس بول لے

اِس جگہ میرے سوا کوئی نہیں   گوشۂ عزلت ہے، کچھ ہنس بول لے
میں ہوں یا تو، دوسرا کوئی نہیں   عالمِ خلوت ہے، کچھ ہنس بول لے

اِس قدر خاموشیاں جائز نہ رکھ   آخری ساعت ہے، کچھ ہنس بول لے
اِتنی غفلت کوشیاں جائز نہ رکھ   دائمی فرقت ہے، کچھ ہنس بول لے

اور چندے مہربانی کی نظر   عازمِ رخصت ہے، کچھ ہنس بول لے
اور تھوڑی رحم کی تکلیف کر   بعد ازاں فرصت ہے، کچھ ہنس بول لے

کیا پتا، پھر دل کے غنچے کب کھلیں
کیا خبر ہے، اب کے بچھڑے کب ملیں

میں ہوں اور آہ و فغاں، واحسرتا   تو ہے اور کچھ ہوں نہ ہاں، واحسرتا

کون میری ناز برداری کرے   اے انیسِ مہرباں! واحسرتا
کون میرے ناروا شکوے سنے   اے جلیسِ قدرداں! واحسرتا

کس سے دل کی حسرتوں کی داد لوں   اے رفیقِ ہمزباں! واحسرتا
کس کو حالِ دل سنا کر شاد ہوں   اے شفیقِ رازداں! واحسرتا

اے اسیرِ پنجۂ صیادِ موت   اے ندیمِ دلستاں! واحسرتا
اے شکارِ خنجرِ جلادِ موت   اے حبیبِ خستہ جاں! واحسرتا

آہ! تو اور پیچ و تابِ جاں کنی
آہ! تو اور اضطرابِ جاں کنی

تو کہاں اور ناگہاں رحلت کہاں
میں کہاں اور اُف تری حسرت کہاں

میں بھی اپنی زیست سے بیزار تھا
تو کہاں اور کوششِ سبقت کہاں
میں بھی تیرے ساتھ ہی تیار تھا
تو کہاں اور اس قدر عجلت کہاں

کون سی اُمید پر صبر آ سکے
تو کہاں اور دائمی رخصت کہاں
کون سی آنکھوں سے دیکھا جا سکے
تو کہاں اور صدمۂ رحلت کہاں

کیا ہوا، کیوں دم اُلٹ جاتا نہیں
تو کہاں اور مرگ کی کلفت کہاں
کیا ہوا، کیوں قلب پھٹ جاتا نہیں
تو کہاں اور موت کی زحمت کہاں

اُف! ترا بے جان لاشہ دیکھنا
دیکھنا، میرا کلیجا، دیکھنا

اب وہ دُنیا ہی نہیں ہے اے دریغ
میں کہیں ہوں، تو کہیں ہے اے دریغ

کل ترے جلوے سے گھر معمور تھا
آج تو زیرِ زمیں ہے اے دریغ

کل تری اُلفت سے دل مسرور تھا آج بے تیرے حزیں ہے، اے دریغ

کل تری اُمّید ہم آہنگ تھی آج حسرت دل نشیں ہے، اے دریغ
کل نگاہِ لطف، رنگا رنگ تھی آج اُلفت ہی نہیں ہے، اے دریغ

کل خیالِ زندگی دم ساز تھا آج مرنے کا یقیں ہے، اے دریغ
کل ادا تھی، ناز تھا، انداز تھا آج کیا ہے کچھ نہیں ہے، اے دریغ

آہ! میں زندہ رہوں اور تو نہ ہو
آہ! میں دُنیا میں ہوں اور تو نہ ہو

اے کہ تو پامالِ آزارِ اجل اے کہ تو ناحق سزاوارِ اجل

جسمِ نازک اور آغوشِ مزار وائے بر ناجائز اطوارِ اجل
قلبِ نازک اور تکلیفِ فشار حیف بر بے رحمیِ کارِ اجل

وہ تپش، وہ اُلجھنیں، وہ پیچ و تاب وہ جفائے سینہ افگارِ اجل

وہ خلش، وہ کشمکش، وہ اضطراب　　وہ کمالِ کاوشِ خارِ اجل

وہ نزولِ لشکرِ آفاتِ موت　　وہ ہجومِ فوجِ جرّارِ اجل[۵]
وہ وفورِ کرب، وہ سکراتِ موت　　وہ عذابِ عالم آزارِ اجل

وہ تجھے جی سے گزرتے دیکھنا
وہ تجھے آنکھوں سے مرتے دیکھنا

وہ اٹل بخت رسا کا فیصلا　　وہ امٹ تقدیر کا لکھا ہوا

وہ طبیبانِ وطن کی بے بسی　　وہ ترقی ہائے دردِ لادوا
وہ مسیحانِ زمن کی بے بسی　　وہ مرض کا اشتدادِ جاں گزا

وہ سراپا یاس و حسرت واردات　　وہ نزا قبل از توقع خاتما
وہ مجسّم درد و کلفت واقعات　　وہ خدائی آفتوں کا سامنا

وہ ستم انگیز حسرت ناک سین[۶]　　وہ تجھے کفنا کے فریاد و بکا

[۵] ... [illegible] (۲)
[۶] دیکھو صفحہ (۱۲۵) حاشیہ (۱)

وہ قیامت خیز، وحشت ناک سین	وہ تجھے دفنا کے غمگیں لوٹنا

وہ اجل سے اُس کی حرکت کے گلے
وہ خدا سے اپنی قسمت کے گلے

وہ بُکا پر رنج پیہم مستزاد	وہ فغاں پر کرب ہر دم مستزاد

وہ مصائب پُر جفائے بے کسی	بے کسی پر چشم پُرنم مستزاد
وہ تباہی پر مکمل بے بسی	بے بسی پر شورِ ماتم مستزاد

وہ توقع سے زیادہ کُلفتیں	کُلفتوں پر آہِ پُر غم مستزاد
وہ ضرورت سے زیادہ وحشتیں	وحشتوں پر طبع برہم مستزاد

وہ ہمیشہ کی جُدائی کا خیال	اور وہ بے صبری کا عالَم مستزاد
وہ قیامت تک بچھڑنے کا ملال	اور وہ آلام دمادم مستزاد

قلب یہ صدمے بھلا سکتا نہیں
بخت یہ چیرکے مٹا سکتا نہیں

دردِ دل کس کو سناؤں کیا کروں ‏ کس سے روؤں کس سے گاؤں کیا کروں

میری حالت سخت درد انگیز تھی ‏ کس طرح تجھ کو دکھاؤں کیا کروں
میری بیتی سخت عبرت خیز تھی ‏ کس طرح تجھ کو سناؤں کیا کروں

آہ! تنی تاب حسبت وجو کہاں ‏ آہ! کیونکر تجھ کو پاؤں کیا کروں
آہ! بس اب میں کہاں! اور تو کہاں ‏ آہ! کیونکر تجھ تک آؤں کیا کروں

اب وفورِ رنج و کلفت ہے تو ہو ‏ بے بسی میں کیا بتاؤں کیا کروں
اب ترے ملنے کی حسرت ہے تو ہو ‏ اب کہاں سے تجھ کو لاؤں کیا کروں

کلفتِ جاوید قسمت ہو چکی
شادمانی دل کے رخصت ہو چکی

ماہِ عالمتاب تاباں ہے تو ہو — نیّرِ اعظم درخشاں ہے تو ہو

اب یہاں شوقِ تماشا ہی نہیں — ہر تماشا آفتِ جاں ہے تو ہو
اب یہاں وہ سر وہ سودا ہی نہیں — ہر تجلی دل میں نازاں ہے تو ہو

میں کہاں اور رخصتِ شرکت کہاں — موسمِ جشن و چراغاں ہے تو ہو
میں کہاں اور سیر کی فرصت کہاں — عالمِ رنگِ گلستاں ہے تو ہو

کوئی نظارہ پسند آتا نہیں — ہر طرف خوشبوں ہیں طغیاں ہے تو ہو
کوئی خوش منظر سماں بھاتا نہیں — ہر طرف جلووں کا طوفاں ہے تو ہو

آہ! ہر منظر سے نفرت ہو گئی
آہ! دُنیا بھر سے نفرت ہو گئی

فصلِ گُل، گلزار میں آیا کرے — سیرِ گُل مسرور فرمایا کرے

اب یہ پُر فرحت فضائیں رائیگاں — جلوۂ گُل رنگ برسایا کرے

اب یہ شوقِ افزا ادائیں رائگاں
سبزۂ شاداب لہرایا کرے

اب گرفتِ عیش میں آنا محال
دہر دامِ عیش پھیلایا کرے
اب دلِ افسردہ گرمانا محال
محفلِ احباب گرمایا کرے

میری دلچسپی کا ساماں کر چکا
سازِ خوش آواز چلّایا کرے
میرے دردِ دل کا درماں کر چکا
نغمۂ خوش وقت سر کھایا کرے

لاکھ ساماں ہوں، مگر دلجُو کہاں
لاکھ خوشیاں ہوں، مگر اک تو کہاں

نالہ ہائے آتش افشاں کر چکے
عرضِ حالِ دردِ پنہاں کر چکے

سرگزشتِ آہ و زاری کہہ چکے
ذکرِ بخت دشمنِ جاں کر چکے
داستانِ دل فگاری کہہ چکے
شکرِ احسانات یزداں کر چکے

آس کو ٹلنے کی رخصت دے چکے
دل کو صرفِ یاس و حرماں کر چکے

حسرتِ واثم کو دعوت دے چکے — بے کسی کو گھر میں مہماں کر چکے

تا بمقدور، آرزو کو رو چکے — تا بہ امکاں خونِ ارماں کر چکے
ساری بہبودی کی شکلیں کھو چکے — سارے بربادی کے ساماں کر چکے

اب خدا توفیقِ تابِ صبر دے
اور مجالِ اختیارِ جبر دے

ہمدم و ہمرازِ جانی! الوداع — محرمِ رازِ نہانی! الوداع

آرزوئے مہربانی ہو چکی — اے سراپا مہربانی! الوداع
انتہائے قدردانی ہو چکی — اے مجسّم قدردانی! الوداع

سب اُمیدِ کامرانی مٹ گئی — اے نویدِ کامرانی! الوداع
سب نشاطِ زندگانی مٹ گئی — اے مُرادِ زندگانی! الوداع

ہو چکا دورِ مسرت ہو چکا — اے جہانِ شادمانی! الوداع

ہو چکا، اظہارِ الفت ہو چکا　　اے محبت کی نشانی! الوداع

الفراق، اے یارِ ناشاد! الفراق
الفراق، اے جانِ آزاد! الفراق

تو ہو اور تائیدِ حق ہمراہ ہو　　تو ہو اور ملجائے ظلّ اللہ ہو

جوشِ رحمت بخشوانے کو بڑھے　　شافعِ محشر شفاعت خواہ ہو
لطفِ پیہم دل بڑھانیکو بڑھے　　فضلِ بیحد رہنمائے راہ ہو

جنتیں، جلوے دکھا کر خوش کریں　　قصّۂ رنجِ جہاں کوتاہ ہو
رفعتیں، رتبے بڑھا کر خوش کریں　　وقعتیں ہوں، اوجِ عزّ و جاہ ہو

بخت پوری برتری سے کام لے　　قربِ ازواجِ رسول اللہ ہو
کامیابی یاوری سے کام لے　　مغفرت ہو اور خاطر خواہ ہو

تو ہو اور نعمائے جنت بالدّوام
تو ہو اور آغوشِ رحمت والسّلام

چاند سے جھڑپ

وسط مئی سنہ ۱۹۲۸ء۔ حیدر آباد دکن

ٹھنڈے ٹھنڈے جائے چاند — جلتوں کو نہ جلائے چاند
پہلو میں وہ چاند نہیں — کس سے دیکھا جائے چاند
میری طبیعت بھی خوش ہو — مجھ کو کیا خوش آئے چاند
مجھ کو لُبھائے، جب جانوں — دُنیا بھر کو لُبھائے چاند
مجھ کو رِجھائے، جب مانوں — عالم بھر کو رِجھائے چاند
سب کو بھائے، مجھ کو کیا — مجھ کو بھی تو بھائے چاند
میرے سامنے آ آ کر — میرا منھ نہ چِڑائے چاند
مجھ کو تنہا پا پا کر — میرا جی نہ دُکھائے چاند

اِس کا نتیجہ کیا ہوگا — غور بھی تو فرمائے چاند

ٹیڑھی چالیں ٹھیک نہیں — اِن سے باز آجائے چاند
سیدھی طرح اک کام کرے — اُلٹے پاؤں جائے چاند
جس سے مرا گھر روشن تھا — اُس کو ڈھونڈھ کے لائے چاند
جس سے یہ آنکھیں بینا تھیں — اُس کا جلوہ دکھائے چاند
جس سے مل کر چین ملے — اُس کو لاکے ملائے چاند
جیسے کہ خود نور افشاں ہے — اپنے رُخ کو لگائے چاند
یونہیں میرے گھر کو بھی — بقعۂ نور بنائے چاند
واہ وہ روشن ساعت جب — گھر کا گھر بن جائے چاند

اور جو یہ منظور نہ ہو — مجھ کو منہ نہ دکھائے چاند
میرا گھر محتاج نہیں — میرے گھر سے جائے چاند
مجھ سے ضد دل کی لیکر — باہم ضد نہ بڑھائے چاند
مجھ کو کچھ کے دے دیکر — بیہم دل نہ دکھائے چاند
حد سے ہوا دق کر کر کے — غصہ تو نہ دلائے چاند
میں بھی آپے میں نہ رہوں — اتنا تو نہ ستائے چاند

میں بھی تحمّل کھو بیٹھوں　　ایسا قہر نہ ڈھائے چاند
اب بھی فسادوں پر نہ تُلے　　اب بھی شر نہ اُٹھائے چاند
اب بھی عقل کے ناخن لے　　اب بھی ہوش میں آئے چاند
ورنہ میرے منھ آکر　　شاید منھ کی کھائے چاند

لیکن اب میں کیوں چُوکوں　　دُکھ پائے تو پائے چاند
کیوں نہ اِک ایسی چُٹکی لوں　　جس سے تڑپ ہی جائے چاند
مجھ پہ تو چوٹیں کرلیں، اب　　اپنی چوٹ بچائے چاند
سورج سے ضَو لے کر　　اپنا نور بڑھائے چاند
نظروں کو جُل دے دے کر　　اپنا عیب چھُپائے چاند
مانگے تانگے جوبن پر　　غرّہ کرے، اِترائے چاند
ظلم ہے، اک تاریک کُرہ　　اپنے کو کہلائے چاند
قہر ہے، صرف اِک تُودہ خاک　　اپنے کو منوائے چاند

آزادؔ! اب تو سامنے آئے
اب تو آنکھ ملائے چاند

حسنِ غارتگر

حسن کا تاریک پہلو

اواخر اگست ۱۹۳۱ عیسوی۔ حیدرآباد دکن

عشق ہیں اپنا جی نہ تپا گ | عشق نہیں ہے، آگ ہے آگ
کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ | بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

سلہ۔ اِس نظم کی شانِ نزول یہ ہے کہ جب میں ۱۲/ جولائی ۱۹۳۱ء کو سہارنپور سے بقصد حیدرآباد دہلی پہنچا تو میرے عزیز دوست پروفیسر محمد اکبر خاں اکبر حیدری نے مجھے ایک تصویر دکھائی جس میں یہ عجیب منظر دکھایا گیا تھا کہ ایک مرد بے تحاشا افتاں و خیزاں بھاگا جا رہا ہے اور دو حسین و جمیل عورتیں اُس کا مسلسل تعاقب کر رہی ہیں اور فرمانے لگے کہ تمھاری غزل کا مطلع ہے "کس کی لگاوٹ کس کی لاگ۔ بھاگ بلائے عشق سے بھاگ"۔ اِس مطلع کے آخری مصرع میں "عشق" ہے اِس کو لفظ "حسن" سے بدل کر اور اِس پر بطور ترجیع مصرعے لگا کر اک نظم تیار کر دو تا کہ ہم اُس کو مع اِس تصویر کے رسالہ "نیرنگ" میں شایع کر سکیں۔ میں نے جواباً کہا بھائی! مجھ کو میرے معتقدات کے خلاف حُسن کی توہین پر کیوں مجبور کرتے ہو ماشاء اللہ اب تم خود بہت اچھا کہنے لگے ہو اور بفضلہ ایک مشاق شاعر کی حیثیت اختیار کر چکے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ تم خود اس کام کو انجام دے لو مگر انھوں نے اِس قدر اصرار کیا کہ بادل ناخواستہ مجھ کو منظور کرتے ہی بنی۔ اور مجبوراً وعدہ کرنا پڑا کہ اچھا میں حیدرآباد پہنچ کر اِس کی کوشش کرونگا

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۲)

حسن کے گن کیا گاتا ہے
حسن تباہی لاتا ہے
حسن گلے کٹواتا ہے
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کے ارماں ٹھیک نہیں
جی کا نقصاں ٹھیک نہیں
ٹھیک نہیں، ہاں ٹھیک نہیں
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

(بقیہ حاشیہ صـ۲۱۱) لیکن میں حیدرآباد پہنچ کر بالکل بھول گیا۔ مگر اکبر صاحب کو شاید کچھ ضد آپڑی تھی اواخر اکتوبر میں انھوں نے اصرار کے ساتھ یاددہانی کی۔ اس لئے مجھ کو مجبوراً اپنی دوسری مصروفیات چھوڑ کر ادھر توجہ کرنی پڑی جس کا نتیجہ یہ نظم ہے .... یہ اک بدیہی امر ہے کہ مظاہر عالم میں ہر مظہر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ روشن اور تاریک اور یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب کوئی اہل قلم کسی چیز کے ایک رخ پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اس کے دوسرے رخ کو گویا بالکل بھول جاتا ہے۔ اسی طرح میں نے بھی یہاں حسن کے روشن رخ کو نظرانداز کر کے اس کے دوسرے رخ یعنے تاریک رخ کے دکھانے کی کوشش کی ہے اگرچہ مجھ کو با دل ناخواستہ حسن کا تاریک پہلو دکھانے پر مجبور ہونا پڑا جس کا مجھے بھی اک گونہ افسوس ہے مگر جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میں حسن کی شان میں مبالغہ آمیز قصیدہ خوانیوں کا پرانا اور سب سے بڑا مجرم ہوں تو میرا دل اس نظم کو کفارۂ جرم سمجھ کر ایک بڑی حد تک مطمئن ہو جاتا ہے۔ میں آخر میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں حسن سے حسن مجازی مراد ہے جس کی روزمرہ کی غارتگریاں کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں اب صرف اس قدر عرض کر دینا اور باقی رہ گیا ہے کہ گو مجھ کو بطور عذر قصور اس نظم پر اتنا بڑا نوٹ لکھنا پڑا مگر مجھے اب بھی امید نہیں کہ پرستاران حسن مجھے معاف کر دیں گے۔

آزاد انصاری

حسن پہ جی کیوں کھوتا ہے — تخمِ غم کیوں بوتا ہے
حسن کسی کا ہوتا ہے؟ — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کا دم کیوں بھرتا ہے — خونِ دل کیوں کرتا ہے
جیتے جی کیوں مرتا ہے — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن سے دھوکا کھائے گا — رنج و اذیت پائے گا
دیکھ! بہت پچھتائے گا — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کو پہلے زر دے گا — بعد ازاں کُل گھر دے گا
آخر آخر سر دے گا — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

دل کو لگا کر کیا لے گا — جان کھپا کر کیا لے گا
زیست گنوا کر کیا لے گا — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

لعلِ جادو فن کو نہ چاہ — جعدِ کمند افگن کو نہ چاہ
دشمنِ جاں! دشمن کو نہ چاہ — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

چشم نہیں ہے، ڈاین ہے
زلف نہیں ہے، ناگن ہے
عشوہ نہیں ہے، رہزن ہے
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

عالمِ روئے حسن نہ دیکھ
جلوۂ موئے حسن نہ دیکھ
بھول کے سوئے حسن نہ دیکھ
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسنِ بتاں سے بات نہ کر
دشمنِ جاں سے بات نہ کر
خصمِ جہاں سے بات نہ کر
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

اہلِ ادا سے بچ کر چل
چشمِ قضا سے بچ کر چل
راہِ خطا سے بچ کر چل
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کی چاہت پر بھی نہ جا
چشمِ عنایت پر بھی نہ جا
لطفِ نہایت پر بھی نہ جا
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

اس کی ملاحت پر بھی نہ ریجھ
اُس کی صباحت پر بھی نہ ریجھ
نازو نزاکت پر بھی نہ ریجھ
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

ہجر کا غم بھی قاتل ہے ‏ وصل کا سم بھی قاتل ہے
کم سے کم بھی قاتل ہے ‏ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

شوقِ وفا بھی مہلک ہے ‏ ذوقِ جفا بھی مہلک ہے
کم بھی سِوا بھی مہلک ہے ‏ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

جتنے حسیں کہلاتے ہیں ‏ دشمنِ دیں کہلاتے ہیں
دوست نہیں کہلاتے ہیں ‏ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

دل کو وفا کا اِذن نہ دے ‏ ذوقِ جفا کا اِذن نہ دے
ایسی خطا کا اِذن نہ دے ‏ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

دولتِ دین و دل نہ گنوا ‏ بے جا، لاحاصل نہ گنوا
ہوش میں آ، غافل! نہ گنوا ‏ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کا ہو کر کیا لے گا ‏ سر سے پا تک کھا لے گا
بھاگ، نہیں تو آ لے گا ‏ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

آزاد! اپنی جان بچا دین بچا، ایمان بچا
ناداں! کہنا مان، بچا بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

دعوتِ وصل

اواخر اکتوبر ۱۹۳۳ء۔ حیدر آباد دکن

خوشا روزِ ہمایوں! قاصد آیا نوازش نامۂ محبوب لایا
خوشا ساعت! کہ جاناں نے بُلایا بُلایا اور عزت سے بٹھایا
اُدھر بزمِ طرب آراستہ کی اِدھر سامانِ مے نوشی سجایا
اُدھر اربابِ موسیقی بُلائے اِدھر پردازِ مے خواری اُٹھایا
اُدھر مطرب نے سازِ عیش چھیڑا اِدھر ساقی نے جامِ مے گھمایا
سرور و کیف کے طوفاں اُٹھائے نشاط و عیش کا دریا بہایا
بہت دلچسپ خاطرداریاں کیں بہت رنگین صحبت کو بنایا

مگر جب جوشِ عشرت حد سے گزرا خیالِ عرضِ مطلب نے ستایا

سرِ شوریدہ میں بدقسمتی سے — حصولِ وصل کا سودا سمایا
اِدھر حرفِ تمنا منھ سے نکلا — اُدھر دل میں غرورِ حسن آیا
خیالِ دلبری کو غیرت آئی — غرورِ خوب روئی رنگ لایا
بہت دلچسپ غصہ رُخ پہ جھلکا — بہت رنگین پیچ و تاب کھایا
خیالِ پاسِ اُلفت کا تو کیا ذکر — سرِ مہماں نوازی تک بھلایا
مگر تقصیرِ وارِ خاص پاکر — سزائے دام دیتے ہچکچایا
نئی راہِ دل آزاری نکالی — نیا دامِ جفا کاری بچھایا
نئے انداز سے غصہ نکالا — نئے زہراب میں خنجر بجھایا
تکدّر کو تلوّن سے بدل کر — عجب حیرت فزا عالم دکھایا

کبھی شوقِ جفا نے چٹکیاں لیں — کبھی ذوقِ وفا نے گدگدایا
کبھی انکار کر کے مار ڈالا — کبھی اقرار فرما کر جلایا
کبھی جور و ستم سے دل کو توڑا — کبھی لطف و کرم سے قہر ڈھایا
کبھی حسنِ تغافل سے نوازا — کبھی فرطِ توجہ سے ستایا
کبھی شرم و حیا سے پردہ چھوڑا — کبھی بے ساختہ جلوہ دکھایا
کبھی گرمِ سخن ہو کر دُعا لی — کبھی خاموش ہو کر دل دُکھایا
کبھی ارمانِ بے دردی نکالا — کبھی ممنونِ ہمدردی بنایا

کبھی بیکس سمجھ کر دِلگی کی
کبھی بے بس سمجھ کر جی بھر آیا
کبھی آزردہ کر کے لطف لوٹا
کبھی افسُردہ پاکر رحم کھایا
کبھی تیغ جفا کاری سنبھالی
کبھی تیرِ وفاداری چلایا
کبھی اپنی عطاؤں کو سراہا
کبھی میری خطاؤں کو گنایا
کبھی ذلت سے ٹھکرا کر نکالا
کبھی عزت سے بُلوا کر بٹھایا
کبھی رحمت کی بارش ہو کے برسا
کبھی زحمت کا بادل بن کے چھایا
کبھی عرشِ بریں کا اوج بخشا
کبھی فرشِ زمیں سے بھی گرایا
کبھی میدانِ خشکی میں ڈبویا
کبھی طوفان دریا میں ترایا
کبھی کانٹوں کے بستر پر گھسیٹا
کبھی پھولوں کی سیجوں پر سُلایا
کبھی جاگی ہوئی قسمت سُلا دی
کبھی سوتے مقدر کو جگایا
ستایا اور ستا کر داد چاہی
رُلایا اور رُلا کر مُسکرایا

غرض تا دیر اُس ظالم نے مجھ کو
شکارِ جورِ مصنوعی بنایا
مرے نقدِ غمِ اُلفت کو پرکھا
مرے پاسِ وفا کو آزمایا
جب از سر تا بہ پا تسلیم دیکھا
جب از سر تا قدم ایثار پایا
تو از راہِ نوازش ہائے مخصوص
اُٹھا کر بزم سے خلوت میں لایا
مرے دردِ دروں کی بات پوچھی
مرے حالِ زبوں پر رحم کھایا

مرے جذبِ غمِ نہاں سے کھینچ کر　　مری آغوش میں خود کو گرایا
نقابِ جلوۂ پیدا بھی الٹی　　حجابِ حسنِ نہاں بھی اٹھایا
شرابِ لطفِ ظاہر بھی پلائی　　خرابِ کیفِ باطن بھی بنایا
حصولِ وصل کی حد تک ابھارا　　کمالِ قرب کی حد تک بڑھایا
فدا اُس دلربا کے۔ آپ جس نے　　حصولِ مدعا کا گُر سُجھایا
نثار اُس شوخ کے۔ جس نے شبِ وصل[1]　　خود آئینِ ہم آغوشی سکھایا

خدا کا شکر ہے۔ آزاد میں نے　　غمِ فرقت کا اجرِ تام پایا
جحیمِ ہجرِ جاناں سے نکل کر
نعیمِ وصلِ جاناں میں در آیا

خطبۂ بہار

اوائلِ نومبر ۱۹۳۴ء - حیدرآباد دکن
به طرزِ ترصیع جدید

بہار آئی ہے عیش اُڑانے کے دن ہیں　　گھٹا چھائی ہے کیف اُٹھانے کے دن ہیں

---

[1] - یہ شعر علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے حسبِ ذیل مشہور فارسی شعر کا ترجمہ ہے -
من فدائے بتِ شوخے کہ بہ ہنگامِ وصال　　بہ من آموخت خود آئینِ ہم آغوشی را

[2] - دیکھو نظم (۳) حاشیہ (۱)

یہ بادل، یہ بارش، یہ ٹھنڈی ہوائیں — مئے و جام سے لَو لگانے کے دن ہیں
یہ رنگیں بہاریں، یہ رنگیں فضائیں — گُل و مُل کا سکّہ چلانے کے دن ہیں

مساجد نشینو! مساجد کو چھوڑو — کہ طاعات سے جی چرانے کے دن ہیں
معابد گزینو! معابد کو چھوڑو — کہ زُہد و ورع بھول جانے کے دن ہیں

شریعت کے جور و ستم سہنے والو! — شریعت سے پیچھا چھڑانے کے دن ہیں
طریقت کو راہِ رضا کہنے والو! — طریقت کو بالا تیاگنے کے دن ہیں

بُت اور بتکدے سے حذر کرنے والو! — نڈر بتکدے میں در آنے کے دن ہیں
سجودِ خدا میں بسر کرنے والو! — حضورِ بُتاں سر جھکانے کے دن ہیں

خدا سے تعلق کو چندے گھٹا کر — بُتوں سے روابط بڑھانے کے دن ہیں
غمِ حور و غلماں دِلوں سے بھلا کر — حسینوں سے آنکھیں لڑانے کے دن ہیں

قیودِ شریعت سے آزاد ہو کر — مے آشامیوں میں گنوانے کے دن ہیں
جزائے عبادات سے ہاتھ دھو کر — خرابات میں عیش اُڑانے کے دن ہیں

دمِ صبح تسبیح باری کے بدلے | غزل ہائے مستانہ گانے کے دن ہیں
سرِ شام طاعت گزاری کے بدلے | مئے ناب کے خم لنڈھانے کے دن ہیں

لگا تار تانیں اڑانے کی رت ہے | لگا تار گانے بجانے کے دن ہیں
لگا تار پینے پلانے کی رت ہے | لگا تار چھکنے چھکانے کے دن ہیں

فقط ہنسنے اور بولنے کی شبیں ہیں | فقط کھیلنے اور کھانے کے دن ہیں
درِ مے کشی کھولنے کی شبیں ہیں | یمِ عیش میں ڈوب جانے کے دن ہیں

سمن رُو نگاروں کو ہمراہ لے کر | گلستاں میں چکر لگانے کے دن ہیں
مے آشام یاروں کو ہمراہ لے کر | چمن پر تسلط بٹھانے کے دن ہیں

وہ یارِ حسیں شاملِ دوستاں ہے | نصیبِ تمنا جگانے کے دن ہیں
وہ شوخ طرحدار پھر مہرباں ہے | غمِ شوق کی داد پانے کے دن ہیں

اُٹھو اور بساطِ تعیش بچھاؤ | بساطِ تعیش بچھانے کے دن ہیں
اُٹھو اور مئے وجام گردش میں لاؤ | مئے وجام گردش میں لانے کے دن ہیں

چلو، چل کے باغوں میں دھومیں مچائیں
کہ باغوں میں دھومیں مچانے کے دن ہیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

پیو اور غمِ ہر دو عالم بھلا دو
غمِ ہر دو عالم بھلانے کے دن ہیں
پیو اور ہراسِ طبیعت مٹا دو
ہراسِ طبیعت مٹانے کے دن ہیں

بلا خوف ناچو، بلا خوف گاؤ
نڈر ناچنے اور گانے کے دن ہیں
پیو اور پی کر نڈر دندناؤ
کہ پی کر نڈر دندنانے کے دن ہیں

غرورِ تزہُّد بہت بڑھ چلا ہے
تزہُّد کو نیچا دکھانے کے دن ہیں
زمانہ تورُّع سے تنگ آ چکا ہے
تورُّع کا قصہ چکانے کے دن ہیں

اٹھو اور مکائد کی ہستی مٹا دو
مکائد کی ہستی مٹانے کے دن ہیں
اُٹھو اور مفاسد کی تعمیر ڈھا دو
مفاسد کی تعمیر ڈھانے کے دن ہیں

معاصی کی لذت سے نا آشناؤ!
معاصی سے لذت اُٹھانے کے دن ہیں
مناہی کی قوت سے نا آشناؤ!
مناہی سے بگڑی بنانے کے دن ہیں

جہاں ننگ بنے، زندگی شاد کا تو — زمانے کو یہ گُر سکھانے کے دن ہیں
جہاں ننگ نے، زیست آزاد کا تو — جہاں کو یہ نکتہ سُجھانے کے دن ہیں

اُٹھ آزادِ حق کوش! موقع ہے، جلد اُٹھ
کہ اوہام پر فتح پانے کے دن ہیں

※

حُسنِ دِلنواز

حُسن کا روشن پہلو

اواخر اکتوبر ۱۹۳۶ء۔ حیدرآباد دکن

حُسن[1] سے اپنا عہد نباہ — حُسن سفید و حُسن سیاہ
ایک ہیں پیشِ اہلِ نگاہ — چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

---

[1] اواخر اگست ۱۹۳۶ء میں جب ایمائے شفیقی پروفیسر محمد اکبر خاں صاحب اکبر حیدری نظم "حُسنِ غارتگر" لکھی گئی تھی مگر اُس کے شایع ہوتے ہی ہر طرف سے مجھ پر شکایات و الزامات کی بارش ہونے لگی۔ کہ میں عام رائے کے خلاف حسن کی شان میں کیوں ایسی ناروا گستاخی و توہین کا مرتکب ہوا۔ جب کثرتِ اعتراضات و الزامات سے تنگ آگیا (بقیہ بر صفحہ ۲۲۴)

※ تقابل کے لئے دیکھو نظم "حُسنِ غارتگر" صفحہ (۲۱۱)

حسنِ حیاتِ عالم ہے — جو ہر ذاتِ عالم ہے
وجہِ ثباتِ عالم ہے — چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن خدائے اُلفت ہے — عقدہ کشائے اُلفت ہے
یعنی برائے اُلفت ہے — چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسنِ بتاں سے ربط بڑھا — جسم کا جاں سے ربط بڑھا
روح جہاں سے ربط بڑھا — چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳) تو میں نے مجبوراً تلافی مافات کی ٹھان لی مگر بوجوہ ایک عرصہ تک اِس فرض کو انجام دینے سے قاصر رہا۔ اِس سال جب مولوی منصور احمد صاحب مُدیر "ادبی دنیا" لاہور نے حسب دستور رسالہ مذکور کے سالنامے کے لئے کوئی نئی نظم طلب کی اور میرے مجموعۂ نظم میں سے باوجود تلاش کوئی اِس قسم کی نظم نہ نکل سکی تو میں نے خیال کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنے گزشتہ جرم کی تلافی کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں چنانچہ باوجود خرابیٔ صحت میں نے کوشش کی اور کچھ دنوں کے بعد میں اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا جس کا نتیجہ "حسنِ دلنواز" کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے مگر مجھے اب بھی امید نہیں کہ حسن پرست اصحاب مجھ کو معاف کر دیں گے۔ ہاں یہ توقع ضرور ہے کہ میرے جرم کی سنگینی اک بڑی حد تک کم ہو جائے گی۔

آزاد انصاری۔

حسن سے قربت حاصل کر — عشق سے لذّت حاصل کر
چاہ میں شہرت حاصل کر — چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن کے ارماں پیدا کر — پیدا۔ پنہاں پیدا کر
پیدا کر ہاں پیدا کر — چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن سے اپنی چاہ بڑھا — چاہ کے رسم و راہ بڑھا
چاہ کی عزّ و جاہ بڑھا — چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن سے نفرت کفر ہے کفر — ردِ نعمت کفر ہے کفر
ایسی حرکت کفر ہے کفر — چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن کی چاہت فرض سمجھ — تا حدِ طاقت فرض سمجھ
فرض ہے، طاعت فرض سمجھ — چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

جو بھی حسیں کہلاتا ہو — زہرہ جبیں کہلاتا ہو
خواہ کہیں کہلاتا ہو — چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

اہلِ ادا ہو، کوئی ہو ماہ لقا ہو، کوئی ہو
بت ہو خدا ہو، کوئی ہو چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن میں فردِ دوراں ہو غیرتِ حور و غلماں ہو
اب وہ ملک ہو شیطاں ہو چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حورِ عیں پر کیا موقوف دیوِ لعیں پر کیا موقوف
ایک حسین پر کیا موقوف چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن کا باغی احمق ہے حسن کہیں ہو برحق ہے
مظہرِ حسنِ مطلق ہے چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن سے آنکھیں روشن کر حسن سے سینہ گلشن کر
حسنِ جہاں ہو درشن کر چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

عقل جہاں تک کھوج لگائے عشق جہاں تک شمع دکھائے

حُسن جہاں تک پایا جائے چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

حُسن جہاں ہاتھ آئے، پہنچ عشق جہاں لیجائے، پہنچ
چاہ جہاں پہنچائے، پہنچ چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

حُسن پہ مائل ہوکر جی عشق میں کامل ہوکر جی
زیست کے قابل ہوکر جی چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

حُسن سے چاہ بڑھائے جا چاہ کے چرکے کھائے جا
چاہ کی دادیں پائے جا چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

اے دلِ بیزار! اب بھی سمجھ چاہ کے اسرار اب بھی سمجھ
اب بھی سمجھ۔ یار! اب بھی سمجھ چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

الغرض اے آزاد! نہ بھول! حُسن کی دم بھر یاد نہ بھول
عشق کا یہ ارشاد نہ بھول چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

رُباعیات

"رحلتِ ممتاز"

اواخر فروری ۱۹۰۷ء کان پور

اے فرقتِ ہمراز! قیامت ڈھادی   اے رخصتِ دمساز! قیامت ڈھادی
سو رنج و محن اور اکیلا آزاد   اے رحلتِ ممتاز! قیامت ڈھادی

"وفادار احباب قسمت سے ملتے ہیں"

اواخر ستمبر ۱۹۱۶ء۔ انبالہ چھاؤنی

درمانِ دلِ زار کہاں سے لاؤں   دُکھ درد کے غمخوار کہاں سے لاؤں
تقدیر موافق نہ زمانہ دمساز   یارانِ وفادار کہاں سے لاؤں

"یادِ احباب"

اواخر ستمبر ۱۹۱۶ء۔ انبالہ چھاؤنی

وہ لُطفِ لبِ آب کہاں سے لاؤں   وہ دورِ مئے ناب کہاں سے لاؤں

ممکن ہے، یہ سامان بہم ہوں لیکن
وہ دوست، وہ احباب کہاں سے لاؤں

"غم نصیبی"

اواخر ستمبر ۱۹۱۰ء - انبالہ چھاؤنی

غم دل سے فراموش ہو، یہ ناممکن
دل غم سے سبکدوش ہو، یہ ناممکن
آزاد! شکایاتِ مقدر کب تک
خاموش ہو، خاموش ہو، یہ ناممکن

"گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

اواخر ستمبر ۱۹۱۰ء - انبالہ چھاؤنی

ہم اور وہی ذوقِ نظر، کیا اُمید
ہم اور وہی شام و سحر، کیا اُمید
ممکن ہے کہ احباب اِسے ممکن کہہ دیں
ممکن تو سبھی کچھ ہے۔ مگر کیا اُمید

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

اوائل دسمبر ۱۹۱۰ء - چھاؤنی انبالہ

کہتے ہو ترقی کی ضرورت کیا ہے
پستی میں تنزل میں قباحت کیا ہے
ممکن ہے، یہ ارشاد بجا ہو۔ لیکن
معلوم ہے؟ اللہ کی عادت کیا ہے

"رنج رحلت حالیؒ"

وسط دسمبر ۱۹۱۴ء - انبالہ چھاؤنی

آپ اور سرو برگ جناں، صد افسوس — ہم اور غم مرگ زباں، صد افسوس
اے خواجہ الطاف حسین انصاری — اے حالیؒ اُستاد زماں، صد افسوس

"ماتم حالیؒ"

اواخر دسمبر ۱۹۱۴ء - چھاؤنی انبالہ

بزم سخن اور صدر جگہ خالی، حیف — جس کا کوئی وارث نہ کوئی والی حیف
اے رخصت استاد فرید الفن ! آہ — اے رحلت شمس العلما حالی ! حیف

ماتم ہر دو استادانِ فن

۱۳ نومبر ۱۹۲۱ء - دہلی

پھر چارۂ اغلاطِ غزل[1] ہی نہ ملا — پھر رفع نقائص کا محل ہی نہ ملا
پھر حسرتِ اصلاح برآہی نہ سکی — پھر حالی و بیدل کا بدل ہی نہ ملا

---

[1] - خاکسار ابتدائً کئی سال تک حضرت قبلہ مولانا حبیب الرحمان صاحب بیدل علیہ الرحمۃ خلف حضرت مولانا احمد علی صاحب علیہ الرحمۃ محدث سہارنپوری سے اکتساب فن کرتا رہا لیکن جب ۱۸۹۵ء میں (بقیہ بر صفحہ ۲۳۱)

لطفِ محبت اُولیٰ پھر حاصل نہیں ہوتا

۱۶ر نومبر ۱۹۲۱ء - دہلی

پھر کوشش و تدبیر کا پھل ہی نہ ملا	پھر عقدۂ تقدیر کا حل ہی نہ ملا
پھر زیست بصد غم تجسّس ہی کٹی	پھر تیری محبت کا بدل ہی نہ ملا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) حضرت مولانائے علیہ الرحمۃ حیدر آباد کے مشہور مدرسہ دارالعلوم کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوکر دکن تشریف لے گئے تو خاکسار چونکہ اُس وقت تک فن شعر میں بالکل خام تھا اور سودائے حصول فن حد سے زیادہ اُچھلا ہوا تھا اصلاح میں سخت دِقّتیں اور ناگوار و دل شکن تعویقیں رونما ہونے لگیں مجبوراً کسی دوسرے صاحب کمال کی تلاش ہوئی۔ بہت غور و فکر کے بعد نظرِ انتخاب حضرت شمس العلماء علّامہ حالی علیہ الرحمۃ (جن کو جدید شاعری کا باوا آدم یا اولیں امام کہنا چاہیے) پڑی۔ بمقام پانی پت عقیدتمندانہ حاضر خدمت ہوکر اپنی دلی آرزو پیش کی جس کو بشکل تمام شرف قبولیت عطا کیا گیا۔ بہ مشکل تمام اس لئے کہ آپ کسی کو بہت کم یہ اعزاز عطا فرماتے تھے اس کے بعد سے خاکسار تا حین حیات حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے اکتساب فن کرتا رہا مگر افسوس کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں یہ سلسلہ دوامی طور سے منقطع ہوگیا اس حادثہ جانکاہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دوسرا سخت سانحہ ہوش رُبا یہ پیش آیا کہ حضرت قبلہ مولانا بیدل بھی رحلت فرما گئے اور خاکسار ہر دو اساتذۂ فن کی ظاہری رہبری سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔ گو ان ہر دو صاحب کمال بزرگوں کا فیضانِ باطن آج تک شمع ہدایت کا کام دے رہا ہے مگر آہ! وہ بات کہاں۔ رباعی مندرجۂ بالا میں انہیں جذبات غم انگیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فقط

آزاد انصاری

"اجتماعِ نقیضین محال ہے"

۱۹؍ نومبر ۱۹۲۱ء - دہلی

اب صدق کا اِنقطاع ناممکن ہے — اب کذب کا اِتباع ناممکن ہے
اور شرکتِ صدق و کذب عقلاً باطل — اَضداد کا اجتماع ناممکن ہے

"التجائے بیمار"

۱۷؍ فروری ۱۹۲۸ء حیدرآباد دکن

ا؎ بیمار ہوں، تندرستی و صحت بھیج — نادار ہوں، یہ گئی ہوئی دولت بھیج
ناچار ہوں اور چارۂ عاجل کی طلب — حقدار ہوں، جلدی کرم و رحمت بھیج

ایضاً

ا؎ یہ درد، یہ اضطراب واپس لے لے — یہ کرب، یہ پیچ و تاب واپس لیلے
ازراہِ کرم دوبارہ صحت دے کر — ہر وقت کا یہ عذاب واپس لیلے

طمانیت بیمار

ا؎ ۲؍ مارچ ۱۹۲۸ء حیدرآباد دکن

آزاد خدا دُکھ کی دوا بخشے گا — صرف ایک دوا ہی کیا، شفا بخشے گا

ا؎ یہ تینوں رباعیات اس وقت لکھی گئی تھیں جب یہ خاکسار سخت بیمار ہو کر عثمانیہ دواخانہ حیدرآباد میں زیر علاج تھا۔ آزاد انصاری۔

وہ سب سے بڑا بخشنے والا ٹھیرا
وہ تیری طلب سے بھی سوا بخشے گا

"انجامِ فنا ہے"

۵- فروری ۱۹۲۸ء - حیدرآباد دکن

کب تک، یہ جنونِ خود پرستی کب تک
یہ شورِ خودی، یہ جوشِ مستی کب تک
ہستی پہ گھمنڈ کرنے والے! کچھ سوچ
ہستی ہی یہ غرّہ ہے تو ہستی کب تک

خوش جینے کا طریقہ

یکم نومبر ۱۹۲۸ء - حیدرآباد دکن

گو فلسفہ و علم و ادب جانا ہے
لیکن کوئی جینے کا بھی ڈھب جانا ہے
مے پی کہ پتا ہی نہ رہے، کب آیا
خوش جی کہ خبر ہی نہ ہو کب جانا ہے

اللہ فقط قسم کے کام آتا ہے

۸- نومبر ۱۹۲۸ء - حیدرآباد دکن

اللہ اگرچہ سب کا اَن داتا ہے
لیکن کوئی اللہ کو پتیاتا ہے؟
اللہ کا اور کوئی مصرف ہی نہیں
اللہ فقط قسم کے کام آتا ہے

"عقدۂ تخلیق عالم لاحل ہے"

۸ نومبر ۱۹۲۶ء حیدر آباد دکن

کہتے ہو "خدا ہی خالقِ دنیا ہے — اور مادے کی بحث فقط دھوکا ہے"
تسلیم، یہ دونوں نظریے تسلیم — لیکن سببِ خلقتِ عالم کیا ہے

"خدا کا خلّاقِ عالم ہونا مسلّم ہے"

۶ نومبر ۱۹۲۹ء حیدر آباد دکن

تحقیق ہے، کل جہاں کا مصدر تو ہے — تصدیق ہے، تو ہے اور مقرّر تو ہے
اے میرے تصوّر[۱] کے حقیقی معروض! — ہر چیز عَرَض ہے اور جوہر تو ہے

"حضرتِ شیخ"

۱۲ نومبر ۱۹۲۹ء حیدر آباد دکن

اے شیخ! تم اور قابلِ نفرت یہ گناہ — پردے میں تقدّس کے زر و مال کی چاہ
جیبوں پہ مریدین کی ہر وقت نگاہ — لاحول ولاقوۃ الا باللہ

---

[۱] "تصور" اور "معروض تصور" یونان کے مایۂ ناز فلسفی افلاطون کی ایجاد کردہ فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں۔ آزاد انصاری

"تاجرانِ خدا سے خطاب"

۱۱ ؍ فروری ۱۹۳۱ء ۔ حیدرآباد دکن

اللہ کا نام لے کے روٹی نہ کماؤ
اللہ کے نام کی جلالت نہ گھٹاؤ
اللہ کو پجواؤ بھی، پوجو بھی ۔ مگر
اللہ کو اسبابِ تجارت نہ بناؤ

"حکمِ قضا اٹل ہے"

۱۷ ؍ جنوری ۱۹۳۳ء حیدرآباد دکن

تقدیر کا حکم ٹل سکے ، ناممکن
تدبیر کا زور چل سکے ، ناممکن
نادان ! غمِ این و آں سے کچھ حاصل بھی
قانونِ قضا بدل سکے ، ناممکن

"اظہارِ اسرار خلافِ مصلحت ہے"

۱۸ ؍ جنوری ۱۹۳۳ء ۔ حیدرآباد دکن

اسرارِ جہاں عیاں نہیں کر سکتے
واقف ہیں مگر بیاں نہیں کر سکتے
کیا کیجئے ، منہ کھولتے جی ڈرتا ہے
منہ کھول کے حفظِ جاں نہیں کر سکتے

"زبانِ قدرت ناقابلِ فہم ہے"

۲۵ فروری ۱۹۳۳ء حیدرآباد دکن

اسرارِ جہاں سے نہ ہم آگاہ نہ تم
اخبارِ نہاں سے نہ ہم آگاہ نہ تم
ہر ذرہ یہاں گرمِ سخن ہے، لیکن
قدرت کی زباں سے نہ ہم آگاہ نہ تم

"ہمرنگ زمیں دام"

۶ فروری ۱۹۳۴ء حیدرآباد دکن

بیداد کو داد کیوں نہ سمجھا جاتا
کوئی ہوتا ضرور دھوکا کھاتا
آنکھیں تھیں مگر دکھائی بھی کچھ دیتا
ہمرنگِ زمین دام نظر کیا آتا

"حقیقی شاعر کی تعریف"

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء حیدرآباد دکن

جو شعر و سخن پہ قادرِ کامل ہے
جو فنِ ادب کا ماہرِ کامل ہے
جو موجدِ اندازِ بیانِ نو ہے
لاریب۔ وہ شخص شاعرِ کامل ہے

"متشاعر کون لوگ ہوتے ہیں"

۱۶ر اکتوبر ۱۹۳۶ء۔ حیدرآباد دکن

جو شعر و سخن پہ خود کو قادر سمجھیں ۔۔۔ شاعر نہ ہوں اور آپ کو شاعر سمجھیں
حق ہے، جو سخن فہم و سخنداں حضرات ۔۔۔ ایسے شعرا کو متشاعر سمجھیں

بعض فارسی کی مشہور رباعیات کے ترجمے

حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر علیہ الرحمۃ

در کعبہ اگر دل سوئے غیر است ترا ۔۔۔ سبحہ زنّار و کعبہ دیر است ترا
ور دل بحق است و ساکن میکدہ ۔۔۔ خوش باش کہ عاقبت بخیر است ترا

ترجمہ

۱۵ر نومبر ۱۹۲۸ء۔ حیدرآباد دکن

کعبے میں اگر دل ہے ترا مائلِ غیر ۔۔۔ سبحہ ترا[1] زنار ہے، کعبہ ترا دیر

[1] صرف اس مصرعے میں ترجمے کی مجبوری سے الف کا دبنا گوارا کرلیا گیا ورنہ میں اس عیب کو کفر سے کم نہیں سمجھتا۔ (امجد حیدرآبادی)

اور ہے جو خرابات میں بھی حق سے لگاؤ کچھ خوف نہ کر کہ عاقبت ہی بالخیر

حکیم عمر خیام نیشاپوری علیہ الرحمۃ

دورے کہ در و آمدن و رفتن ماست آن را نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نہ زند دمے دریں معنیٰ راست کایں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

ترجمہ

۱۵ اکتوبر ۱۹۲۸ء۔ حیدرآباد دکن

یہ دہر کہ اپنی آمد و شد ہے جہاں ہے اُس کی بدایت بھی نہایت بھی نہاں
اے کاش! کوئی یہ عُقدہ حل کر سکتا آئے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں

حکیم عمر خیّام نیشاپوری علیہ الرحمۃ

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت در پردۂ اسرار فنا خواہی رفت
مے خور کہ نہ دانی ز کجا آمدۂ خوش زی کہ نہ دانی بکجا خواہی رفت

ترجمہ

یکم نومبر ۱۹۲۸ء۔ حیدرآباد دکن

جانا ہے تجھے یہاں سے ہاں جانا ہے آیا ہے تو بے شبہ و گماں جانا ہے

مے پی کہ نہ آگہہ ہو کہاں سے آیا　　خوش جی کہ نہ واقف ہو کہاں جانا ہے

حکیم عمر خیام نیشاپوری علیہ الرحمۃ

بر سینۂ غم پذیرِ من رحمت کن　　بر جان و دلِ اسیرِ من رحمت کن
بر پائے خرابات روِ من بخشائے　　بر دستِ پیالہ گیرِ من رحمت کن

ترجمہ

یکم نومبر ۱۹۲۸ء - حیدرآباد دکن

اس سینۂ غم پذیر پر رحمت کر　　اس جانِ الم اسیر پر رحمت کر
اِس میکدہ رَو پانوں کو دوزخ میں نہ کھینچو　　اس دستِ پیالہ گیر پر رحمت کر

حضرت سلطان ابو سعید ابو الخیر علیہ الرحمۃ

نے باغ نہ بستاں نہ چمن می خواہم　　نے سرو نہ گل نہ یاسمن می خواہم
خواہم ز خدائے خویش کنجے کہ دراں　　من باشم و آں کسے کہ من می خواہم

ترجمہ

ترجمہ
یکم نومبر ۱۹۲۸ء حیدرآباد دکن

ہم مائلِ دیر اور نہ جنت طالب ہیں — ہم سائلِ حور اور نہ ارم طالب ہیں
ہم ہیں اور صرف یہ تمنائے دلی — ہم ہوں اور وہ کہ جس کے ہم طالب ہیں

حکیم عمر خیام علیہ الرحمۃ

مے نوش کہ عمرِ جاودانی این ست — خود خاصیت از دورِ جوانی این ست
ہنگام گل و مل است و یاراں سرمست — خوش باش دمے کہ زندگانی این است

ترجمہ

۱۵ اپریل ۱۹۳۱ء حیدرآباد دکن

مے پی کہ حصولِ کامرانی ہے یہی — خوش جی کہ حیاتِ جاودانی ہے یہی
بے خوف مے و نغمہ و شاہد میں گزار — کھل کھیل کہ اصلِ زندگانی ہے یہی

حکیم عمر خیام علیہ الرحمۃ

یارب! تو گلم سرشتۂ من چہ کنم — پشم و قصبم تو رشتۂ من چہ کنم
ہر نیک و بدے کہ از من آمد بہ وجود — تو بر سرِ من نوشتۂ من چہ کنم

۱۲؍مئی ۱۹۳۱ء سہارنپور

یارب! مری کیا خطا ہے، میرا کیا جرم — بے وجہ سزا ہے، میرا کیا جرم
ہر لمحہ مری ذات سے عصیاں کا صدور — تیرا ہی لکھا ہوا ہے، میرا کیا جرم

حکیم عمر خیام نیشاپوریؒ

ما ئیم خریدارِ مئے کہنہ و نو — وانگاہ فروشندہ جنت بہ دو جو
گوئی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت — مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

ترجمہ

۲؍ڈسمبر ۱۹۳۱ء حیدرآباد دکن

اک رند کو فیلسوف کہہ کر نہ بناؤ — اک مست کو تہذیب داں کہہ کر نہ ستاؤ
کیا پوچھتے ہو مر کے کہاں جائیںگے — مے مجھ کو پلاؤ اور جہاں چاہے جاؤ

حکیم عمر خیام نیشاپوریؒ

مے خور کہ زتو کثرت و قلت بہ برد — واندیشہ ہفتاد و دو ملت بہ برد

پرہیز کن زکیمیائے کہ ازو یک جرعۂ مے ہزار علت ببرد

ترجمہ

۱۶ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء - حیدرآباد دکن

مے پی کہ غم کثرت و قلت نہ رہے خوش جی کہ سر عزت و ذلت نہ رہے
اکسیر سمجھ ساغر مے کو اکسیر گر مدنظر ہے، کوئی علت نہ رہے

حکیم عمر خیام نیشاپوری

گر بادہ خوری تو با خرد منداں خور یا با صنمے سادہ رخ و خنداں خور
بسیار مخور - ورد مکن - فاش مساز اندک خور و گہہ گاہ خور و پنہاں خور

ترجمہ

۲۸ جون ۱۹۳۲ء حیدرآباد دکن

جب بادہ پیو، یا صنم چیدہ ہو یا ہمرہ دوستان سنجیدہ پیو
ایسا نہ ہو یہ مشغلہ رسوا ہو جائے کم کم پیو - گہہ گہہ پیو - پوشیدہ پیو

حکیم عمر خیام

اے آنکہ پدید گشتم از قدرتِ تو　　پروردہ شدم بہ ناز از نعمتِ تو
صد سال بہ امتحاں گنہ خواہم کرد　　یا جرمِ من است بیش یا رحمتِ تو

ترجمہ

یکم جنوری ۱۹۳۳ء حیدرآباد دکن

اے میری بقا کا راز قدرت تیری　　اے میرے لئے ہر ایک نعمت تیری
سو سال گناہ کر کے یہ دیکھوں گا　　عصیاں ہیں مرے سوا کہ رحمت تیری

حکیم عمر خیام

[1] تا یار شناختم من ایں پائے ز دست　　ایں چرخ فرومایہ مرا دست بہ بست
افسوس! کہ در حساب خواہند نہاد　　عمرے کہ مرا بے مئے و معشوق گذشت

---

[1] یہ رباعی شاید غلط ہے۔ اس لئے کہ "دست" اور "بست" کا قافیہ "گذشت" کے ساتھ ناجائز ہے

یکم جنوری سنہ ۱۹۳۳ء - حیدرآباد دکن

انصاف کرو قضا سے کس طرح پٹے — جب تک یہ ستمگر اپنی ضد سے نہ ہٹے
کیا ظلم نہیں، حساب میں داخل ہو — وہ عمر کہ جو بے مئے و معشوق کٹے

حکیم عمر خیام

سردفتر عالمِ معانی عشق است — سربیتِ قصیدۂ جوانی عشق است
اے آنکہ خبر نہ داری از عالمِ عشق — این نکتہ بداں کہ زندگانی عشق است

ترجمہ

۸ جنوری سنہ ۱۹۳۳ء - حیدرآباد دکن

سر دفتر عالمِ معانی ہے تو عشق — سربیتِ قصیدۂ جوانی ہے تو عشق
اے عالمِ رازِ عشق سے ناواقف! — یہ نکتہ سمجھ کہ زندگانی ہے تو عشق

حکیم عمر خیام

در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد
وز بہرِ نشست آستانے دارد
نے خادمِ کس بود نہ مخدومِ کسے
گو، شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ترجمہ

۹؍ جنوری ۱۹۳۳ء۔ حیدرآباد دکن

جو بہرِ نشست اک آستاں رکھتا ہے
یک کوزۂ آب و نیم ناں رکھتا ہے
جس کا کوئی خادم ہے نہ کوئی مخدوم
خوش کیوں نہ جیے کہ خوش جہاں رکھتا ہے

حکیم عمر خیام

تا یار شرابِ جاں فزایم ندہد
صد بوسہ فلک بر سر و پایم ندہد
گویند کہ توبہ کن اگر وقت آید
چوں توبہ کنم اگر خدایم ندہد

ترجمہ

۱۶؍ جنوری ۱۹۳۳ء۔ حیدرآباد دکن

کہتے ہو کہ باز آ مئے و شاہد سے — کم بخت! اب ان اشغال سے توبہ کرلے
ہیں توبہ کو سو مرتبہ حاضر ہوں، مگر — اللہ مجھے توبہ کی توفیق بھی دے

حکیم عمر خیام

غم چند خوری بہ کار نا آمدہ پیش — رنج است نصیب مردم دور اندیش
خوش باش و جہاں تنگ مکن بر دل خویش — کز خوردن غم قضا نہ گردد کم و بیش

ترجمہ

۱۷؍ جنوری ۱۹۳۳ء۔ حیدرآباد دکن

ناداں! غم ایام سے کیوں ہے دل ریش — ہے رنج نصیب مردم دور اندیش
خوش جی کہ کسی سے رنج و غم کھانے سے — احکام قضا ہو نہیں سکتے کم و بیش

حکیم عمر خیّام

گویند کہ مرد را ہنر می باید
یا نسبتِ عالیٔ پدر می باید
امروز چناں شدہ ست در نوبتِ ما
ایں ہا ہمہ ہیچ ہست، زر می باید

ترجمہ

۱۷ جنوری ۱۹۳۳ء۔ حیدرآباد دکن

گو قول ہے، مرد کچھ ہنر رکھتا ہو
یا نسبت عالیٔ پدر رکھتا ہو
لیکن عملِ اہلِ جہاں کہتا ہے
یہ سب ہے فضول، صرف زر رکھتا ہو

حکیم عمر خیّام

در دہر چو آوازۂ گل تازہ دہند
فرمائے کہ پیمانہ بہ اندازہ دہند
از دوزخ و ز بہشت و ز حور و قصور
فارغ بنشیں کہ آں خود آوازہ دہند

۱۹ر فروردی ۱۹۳۳ء-حیدرآباد دکن

ہر وقت رکھ اپنے پہ درِ عشرت باز — خوش جی مئے و شاہد کو بنا کر دمساز
ناداں! غمِ خُلد و حور و غلماں کب تک — اِک روز یہ خود ہی تجھے دیں گے آواز

حکیم عمر خیام

گویند بہ خُلد حورِ عیں خواہد بود — وانجا مئے ناب و انگبیں خواہد بود
گر مائے و معشوق پرستیم، رواست — چوں عاقبتِ کار ہمیں خواہد بود

ترجمہ

۳۰ر فروری ۱۹۳۳ء-حیدرآباد دکن

جنت میں شرابِ ارغواں بھی ہے یہی — اور مصرفِ حورانِ جناں بھی ہے یہی
ترکِ مئے و شاہد سے یہاں کیا حاصل — جب عاقبتِ کار وہاں بھی ہے یہی

چنداں مرو ایں رہ کہ دوئی برخیزد
گر نیست دوئی ز رہروی برخیزد
تو او نہ شوی ولیک گر جہد کنی
جائے برسی کز تو توئی برخیزد

ترجمہ

۲۲ فروری ۱۹۳۳ء - حیدرآباد دکن

کوشش تو یہی کر کہ دوئی مٹ جائے
غیریت حق چھپائی ہوئی مٹ جائے
تو وہ تو نہ ہو سکے گا لیکن پھر بھی
ممکن ہے کہ تیری یہ توئی مٹ جائے

حکیم عمر خیام

گر دست دہد ز مغز گندم نانے
وز مے کدوئے ز گوسفندے رانے
با ماہ رخے نشستہ در ویرانے
عیشے بود آں نہ حدِ ہر سلطانے

۲۳ر فروری ۱۹۳۲ء - حیدر آباد دکن

دو دن میں[له] بھی گر میسر آئے اک نان — اک مے کا سبو اور ایک بکرے کی ران
اک گوشۂ خلوت اور اک محبوبہ — پھر تو کوئی شاہ ہے نہ مجھ سا سلطان

[له] مذکورہ بالا فارسی رباعیات کا ترجمہ جو میں نے کیا ہے اس سے کچھ اظہار کمال شاعری مقصود نہ تھا بلکہ محض یہ سبب تھا کہ یہ رباعیات مجھے بیحد پسند آئیں اور دل نے چاہا کہ ہماری اردو ان خیالات عالیہ سے تہی دامن نہ رہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار رباعیات اس قابل تھیں کہ ان کا ترجمہ اردو میں کیا جانا ضروری تھا مگر افسوس کہ فرصت میسر نہ آئی اور اگر کبھی کچھ فرصت میسر آئی بھی تو قوتِ اظہار و بیان نے ساتھ نہ دیا کون نہیں جانتا کہ کارِ ترجمہ مستقل تصنیف سے بہت زیادہ صبر آزما اور دشوار کام ہے۔ اس لئے اگر میں بھی مزید قابلِ ترجمہ رباعیات کو اردو میں منتقل کرنے سے قاصر رہا تو مجھ کو بھی معذور سمجھنا چاہئے ہاں اگر زندگی باقی رہی اور ہجوم افکار و امراض نے فرصت دی تو ان شاء اللہ ان باقی رباعیات کو بھی جامۂ اردو پہنانے کی کوشش کروں گا جو مجھے زیادہ پسند ہیں۔

آزاد انصاری

قطعاتِ تاریخ

قطعۂ تاریخ وفات شیخ کریم الدین صاحب مرحوم سوداگر انبالہ چھاؤنی

مرتبہ نومبر ۱۹۱۳ء۔ انبالہ چھاؤنی

خدمت دیں پہ مائل تھی — نیت شیخ کریم الدین
دادِ قوم کے قابل تھی — ہمت شیخ کریم الدین
یہی سبب تھا سب کی — عزت شیخ کریم الدین
دنیا سے جس وقت ہوئی — رخصت شیخ کریم الدین

سال رحلت یہ نکلا
رحلتِ شیخ کریم الدین
۱۹۱۳ء

بنائے روضۂ بی بی پاکدامن صاحبہ
والدۂ ماجدہ حضرت شیخ محمد فتح علی صاحب رضا قادری

مرتبہ وسط ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء

عام ہے۔ فیضِ مزارِ پاکدامن عام ہے
اعتقادِ خاص سے آ۔ روضۂ پاکیزہ دیکھ
فکرِ تاریخِ بنا کی تھی کہ یہ اِلقا ہوا
پاکدامن صاحبہ کا روضۂ پاکیزہ دیکھ

۱۳۴۰ ہجری

قطعۂ تاریخ

وفاتِ حسرت آیاتِ حضرت سید نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی

اواخر ستمبر ۱۹۳۳ء - حیدرآباد دکن

اے مرجعِ اہلِ وفا! واحسرتا واحسرتا ۔۔۔ اے منبعِ صدق و صفا! واحسرتا واحسرتا

اے یارِ بیزارِ حیات! اے تارکِ دارِ حیات! ۔۔۔ اے راہیِ ملکِ بقا! واحسرتا واحسرتا

اے زخمیِ تیرِ اجل! اے صیدِ شمشیرِ اجل ۔۔۔ اے کشتۂ تیغِ قضا! واحسرتا واحسرتا

اے حقگزارِ دوستاں! اے غمگسارِ دوستاں ۔۔۔ اے دوستدارِ باوفا! واحسرتا واحسرتا

اے فرقتِ دلگیر شاہ! اے رخصتِ دلگیر شاہ ۔۔۔ اے مرگِ یارِ آشنا! واحسرتا واحسرتا

اے ناثرِ جادو بیاں! اے شاعرِ شیریں زباں ۔۔۔ اے بلبلِ رنگیں نوا! واحسرتا واحسرتا

اے ہمدمِ بالغ نظر! اے سیدِ والا گہر! ۔۔۔ اے آلِ ختم الانبیا! واحسرتا واحسرتا

تو اور یہ خاموشیاں، ملک اور یہ آہ و فغاں ۔۔۔ ہم اور یہ آہ و بکا- واحسرتا واحسرتا

ہم شکوہ سنجِ موت تھے، پُرسانِ سالِ فوت تھے

دی ایک نے بڑھ کر صدا- "واحسرتا واحسرتا"

۱ + ۱۲۵۲ = ۱۳۵۳ ہجری

قطعۂ تاریخ

طبعِ دیوان مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب سرمد[1]

الموسوم بہ نالۂ سرمد

اوائل ماہ جنوری ۱۹۳۵ء حیدرآباد دکن

تشنہ کامانِ علم و فن! مژدہ — جوشِ صہبائے ناب سرمد ہے
طالبانِ مئے سخن! مژدہ — دورِ جامِ شرابِ سرمد ہے
جس کو دیکھو مئے سخن سے مست — جس کو پوچھو خرابِ سرمد ہے
واقعہ یہ ہے حیرت افزا رنگ — رنگِ طبعِ جنابِ سرمد ہے
کوششِ خدمت زبان و ادب — کوششِ کامیابِ سرمد ہے

---

[1] مولوی عظمت اللہ خاں سرمد مرحوم حیدرآبادی اچھے شاعر تھے افسوس کہ جوانی ہی میں انتقال کرگئے اگر زندہ رہتے تو یقیناً کافی ترقی کرتے۔ آزاد انصاری۔

سالِ فصلی اگر تمھیں درکار
مصرعِ ذیل تین بار پڑھو

بہرِ طبعِ کتابِ سرمد ہے
"نالۂ لاجواب سرمد ہے"

۴۴۸ × ۳
۱۳۴۴ ف

دریغا! کہ کام و لب از کار ماند
سخن ہائے ناگفتہ بسیار ماند
(غالب)

آزاد انصاری

سنہ ۲ مملکت حیدرآباد دکن میں سرکاری طور سے سنہ فصلی جاری و مستعمل ہے۔ یہ سن سنِ شمسی ہے اور غالباً یہ وہی سن ہے جو شہنشاہِ اکبر نے اپنے زمانہ میں وضع و جاری کیا تھا اِس کے مہینوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ آذر۱۔ دے۲۔ بہمن۳۔ اسفندار۴۔ فروردی۵۔ اردی بہشت۶۔ خورداد۷۔ تیر۸۔ امرداد۹۔ شہریور۱۰۔ مہر۱۱۔ آبان۱۲۔ اِس کا پہلا مہینہ آذر ہے جو قریباً اوائلِ اکتوبر سے شروع ہوتا ہے۔

آزاد انصاری۔

آخری گزارش

بقول مولانا محمد حسین آزاد مرحوم مصنّفِ آبحیات "حمدِ خدا سے آغاز تھا شکرِ خدا پر انجام ہے"۔ اِس لئے کہ اُسی کا فضل آغاز میں ہمت بندھانیوالا ہے اور اُسی کا کرم مشکل سے مشکل کام کو انجام تک پہنچانے والا۔ اگر میں نے خدمتِ ادب و شعر کی کوشش شروع کی تھی تو اُسی کی امدادِ بے پایاں کے بھروسے پر۔ اور اُس کو انجام کو پہنچایا ہے تو اُسی کی عطا کی ہوئی توفیق لامتناہی نے۔ آج میں اپنی اِس عمر بھر کی کوشش کو اہلِ ملک کے اربابِ نظر کی خدمت میں پیش کرنے کی عزّت حاصل کرتا ہوں۔ اب اہلِ ملک کو اختیار ہے خواہ اِس کو قبول فرمائیں یا رد کریں۔ اگر قبول فرمائیں گے تو میں خدا کا شکر ادا کروں گا اور سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر رد کرینگے تو حرفِ شکایت زبان پر نہ لاؤں گا اور سمجھوں گا کہ وہ درحقیقت اِسی سلوک کی مستحق تھی۔

والسّلام۔

خاکسار

آزاد انصاری